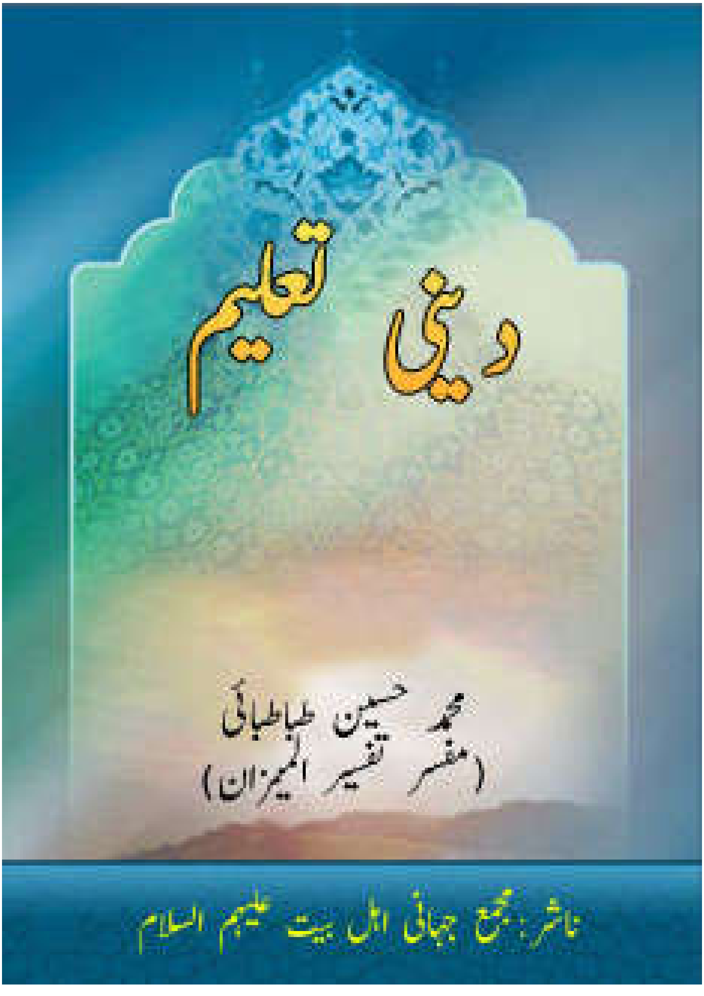

دینی تعلیم
محمد حسین طباطبائی
(مفسر تفسیر المیزان)
ناشر: مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام

دینی تعلیم

محمد حسین طباطبائی

(مفسر تفسیر المیز ان)

مرتّبہ: سید مہدی آیت اللّٰہی

مترجم: سید قلبی حسین رضوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پروردگار عالم نے ارشاد فرمایا:

(اِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيراً)

(سورۂ احزاب: آیت ۳۳)

اے اہلبیت اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ تم سے رجس اور گندگی کو دور رکھے اور تمہیں اسی طرح پاک رکھے جو پاک و پاکیزہ رکھنے کا حق ہے۔

شیعہ اور اہل سنت کی کتابوں میں رسول خدا کی بہت سی احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ آیۂ مبارکہ پنجتن اصحاب کساء کی شان میں نازل ہوئی ہے اور اہل بیت سے مراد وہی حضرات ہیں اور وہ: محمد، علی، فاطمہ، حسن و حسین علیہم السلام ہیں۔ نمونہ کے طور پر ان کتابوں کی طرف رجوع کریں: مسند احمد بن حنبل (وفات ۲٤۱ ھ): ج۱، ص۳۳۱، ج٤، ص۱۰۷، ج٦، ص۲۹۲ و ۳۰٤؛ صحیح مسلم (وفات ۲٦۱ ھ): ج۷، ص۱۳۰؛ سنن ترمذی (وفات ۲۷۹ ھ): ج٥، ص۳٦۱ و...؛ الذریۃ الطاہرۃ النبویۃ دولابی (وفات: ۳۱۰ ھ): ص۱۰۸؛ السنن الکبریٰ نسائی (وفات ۳۰۳ ھ): ج٥، ص۱۰۸ و ۱۱۳؛ المستدرک علی الصحیحین حاکم نیشاپوری (وفات: ٤۰٥ ھ): ج۲، ص ٤۱٦، ج۳، ص۱۳۳ و ۱٤۷ و ۱۱۳؛ البرہان زرکشی (وفات ۷۹٤ ھ) ص۱۹۷؛ فتح الباری شرح صحیح البخاری ابن حجر عسقلانی (وفات ۸٥۲ ھ): ج۷، ص۱۰٤؛ اصول الکافی کلینی (وفات ۳۲۸ ھ): ج۱، ص ۲۸۷؛ الامامۃ و

التبصرۃ ابن بابویہ (وفات ۳۲۹ ھ): ص ۴۷ ، ح ۲۹؛ دعائم الاسلام مغربی (وفات ۳۶۳ ھ): ص ۳۵ و ۳۷؛ الخصال شیخ صدوق (وفات ۳۸۱ ھ): ص ۴۰۳ و ۵۵۰؛ الامالی شیخ طوسی (وفات ۴۶۰ ھ): ح ۴۳۸، ۴۸۲ و ۷۸۳ نیز مندرجہ ذیل کتابوں میں اس آیت کی تفسیر کی طرف مراجعہ کریں: جامع البیان طبری (وفات ۳۱۰ ھ)؛ احکام القرآن جصاص (وفات ۳۷۰ ھ)؛ اسباب النزول واحدی (وفات ۴۶۸ ھ)؛ زاد المسیر ابن جوزی (وفات ۵۹۷ ھ)؛ الجامع لاحکام القرآن قرطبی (وفات ۶۷۱ ھ)؛ تفسیر ابن کثیر (وفات ۷۷۴ ھ)؛ تفسیر ثعالبی (وفات ۸۲۵ ھ)؛ الدر المنثور سیوطی (وفات ۹۱۱ ھ)؛ فتح القدیر شوکانی (وفات ۱۲۵۰ ھ)؛ تفسیر عیاشی (وفات ۳۲۰ ھ)؛ تفسیر قمی (وفات: ۳۲۹ ھ)؛ تفسیر فرات کوفی (وفات ۳۵۲ ھ) آیۂ اولوا الامر کے ذیل میں؛ مجمع البیان طبرسی (وفات ۵۶۰ ھ) اور بہت سی دوسری کتابیں۔

حرف اول

جب آفتاب عالم تاب افق پر نمودار ہوتا ہے کائنات کی ہر چیز اپنی صلاحیت و ظرفیت کے مطابق اس سے فیضیاب ہوتی ہے حتی ننھے ننھے پودے اس کی کرنوں سے سبزی حاصل کرتے اور غنچہ و کلیاں رنگ و نکھار پیدا کر لیتی ہیں تاریکیاں کافور اور کوچہ و راہ اجالوں سے پرنور ہوجاتے ہیں، چنانچہ متمدن دنیا سے دور عرب کی سنگلاخ وادیوں میں قدرت کی فیاضیوں سے جس وقت اسلام کا سورج طلوع ہوا، دنیا کی ہر فرد اور ہر قوم نے قوت و قابلیت کے اعتبار

سے فیض اٹھایا۔

اسلام کے مبلغ وموسس سرور کائنات حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غار حراء سے مشعل حق لے کر آئے اور علم وآگہی کی پیاسی اس دنیا کو چشمہ حق وحقیقت سے سیراب کر دیا، آپ کے تمام الہی پیغامات، ایک ایک عقیدہ اور ایک ایک عمل فطرت انسانی سے ہم آہنگ ارتقائے بشریت کی ضرورت تھا، اس لئے ۲۳ برس کے مختصر عرصے میں ہی اسلام کی عالمتاب شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں اور اس وقت دنیا پر حکمران ایران وروم کی قدیم تہذیبیں اسلامی قدروں کے سامنے ماند پڑ گئیں، وہ تہذیبی اصنام جو صرف دیکھنے میں اچھے لگتے ہیں اگر حرکت وعمل سے عاری ہوں اور انسانیت کو سمت دینے کا حوصلہ، ولولہ اور شعور نہ رکھتے تو مذہب عقل وآگہی سے روبرو ہونے کی توانائی کھو دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ایک چوتھائی صدی سے بھی کم مدت میں اسلام نے تمام ادیان و مذاہب اور تہذیب وروایات پر غلبہ حاصل کر لیا۔

اگر چہ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ گرانبہا میراث کہ جس کی اہل بیت علیہم السلام اور ان کے پیروؤں نے خود کو طوفانی خطرات سے گزار کر حفاظت و پاسبانی کی ہے، وقت کے ہاتھوں خود فرزندان اسلام کی بے توجہی اور نا قدری کے سبب ایک طویل عرصے کے لئے تنگنائیوں کا شکار ہو کر اپنی عمومی افادیت کو عام کرنے سے محروم کر دی گئی تھی، پھر بھی حکومت و سیاست کے عتاب کی پروا کئے بغیر مکتب اہل بیت علیہم السلام نے اپنا چشمۂ فیض جاری رکھا اور چودہ سو سال کے عرصے میں بہت سے ایسے جلیل القدر علماء ودانشور دنیائے اسلام کو تقدیم

کئے جنھوں نے بیرونی افکار ونظریات سے متاثر اسلام وقرآن مخالف فکری ونظری موجوں کی زد پر اپنی حق آگیں تحریروں اور تقریروں سے مکتب اسلام کی پشت پناہی کی ہے اور ہر دور اور ہر زمانے میں ہر قسم کے شکوک وشبہات کا ازالہ کیا ہے، خاص طور پر عصر حاضر میں اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد ساری دنیا کی نگاہیں ایک بار پھر اسلام وقرآن اور مکتب اہل بیت علیہ السلام کی طرف اٹھی اور گڑی ہوئی ہیں، دشمنان اسلام اس فکر ومعنوی قوت واقتدار کو توڑنے کے لئے اور دوستداران اسلام سے اس مذہبی اور ثقافتی موج کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑنے اور کامیاب وکامران زندگی حاصل کرنے کے لئے بے چین وبے تاب ہیں، یہ زمانہ عملی اور فکری مقابلے کا زمانہ ہے اور جو مکتب بھی تبلیغ اور نشر واشاعت کے بہتر طریقوں سے فائدہ اٹھا کر انسانی عقل وشعور کو جذب کرنے والے افکار ونظریات دنیا تک پہنچائے گا، وہ اس میدان میں آگے نکل جائے گا۔

(عالمی اہل بیت کونسل) مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام نے بھی مسلمانوں خاص طور پر اہل بیت عصمت وطہارت کے پیروؤں کے درمیان ہم فکری ویکجہتی کو فروغ دینا وقت کی ایک اہم ضرورت قرار دیتے ہوئے اس راہ میں قدم اٹھایا ہے کہ اس نورانی تحریک میں حصہ لے کر بہتر انداز سے اپنا فریضہ ادا کرے، تاکہ موجود دنیائے بشریت جو قرآن وعترت کے صاف وشفاف معارف کی پیاسی ہے زیادہ سے زیادہ عشق ومعنویت سے سرشار اسلام کے اس مکتب عرفان وولایت سے سیراب ہوسکے، ہمیں یقین ہے عقل وخرد پر استوار ماہرانہ انداز میں اگر اہل بیت عصمت وطہارت کی ثقافت کو عام کیا جائے اور حریت وبیداری کے علمبردار خاندان

نبوت و رسالت کی جاوداں میراث اپنے صحیح خدو خال میں دنیا تک پہنچادی جائے تو اخلاق وانسانیت کے دشمن، انانیت کے شکار، سامراجی خون خواروں کی نام نہاد تہذیب وثقافت اور عصر حاضر کی ترقی یافتہ جہالت سے تھکی ماندی آدمیت کوامن ونجات کی دعوتوں کے ذریعہ امام عصر (عج) کی عالمی حکومت کے استقبال کے لئے تیار کیا جاسکتا ہے۔

ہم اس راہ میں تمام علمی و تحقیقی کوششوں کے لئے محققین ومصنفین کے شکر گزار ہیں اور خود کو مؤلفین ومترجمین کا ادنی خدمتگار تصور کرتے ہیں، زیر نظر کتاب، مکتب اہل بیت علیہم السلام کی ترویج واشاعت کے سلسلے کی ایک کڑی ہے، علامہ طباطبائی کی گرانقدر کتاب دینی تعلیم کو مولانا سید قلبی حسین رضوی نے اردو زبان میں اپنے ترجمہ سے آراستہ کیا ہے جس کے لئے ہم دونوں کے شکر گزار ہیں اور مزید توفیقات کے آرزومند ہیں، اسی منزل میں ہم اپنے تمام دوستوں اور معاونیں کا بھی صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ جنھوں نے اس کتاب کے منظر عام تک آنے میں کسی بھی عنوان سے زحمت اٹھائی ہے، خدا کرے کہ ثقافتی میدان میں یہ ادنی جہاد رضائے مولی کا باعث قرار پائے۔

والسلام مع الاکرام

مدیر امور ثقافت، مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام

دینی معلومات

لفظ دین کثیر الاستعمال الفاظ میں سے ایک ہے۔عام طور پر دیندار اسے کہتے ہیں جو کائنات کے لئے ایک خدا کا قائل ہو اور اس کی خوشنودی کے لئے خاص قسم کے اعمال بجالاتا ہو۔

ممکن ہے ہر معاشرے اور ملت میں، قانون کے مطابق معاشرہ کے ہر فرد کے لئے فرائض معین ہوئے ہوں ،اور ان پر لوگ عمل کرتے ہوں،تو یہ تصور کیا جائے کہ وہاں پھر دین کی ضرورت نہیں ہے،لیکن اسلام کے احکام اور ضوابط پر سنجیدگی سے غور کرنے سے اس معنی کے خلاف ثابت ہوتا ہے، کیونکہ دین اسلام صرف خدا کی عبادت و ستائش تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس میں انسان کے تمام انفرادی و اجتماعی مسائل کے لئے جامع قواعد وضوابط اور مخصوص قوانین وضع کئے گئے ہیں اور بشریت کی وسیع دنیا کے بارے میں حیرت انگیز صورت میں تحقیق کی گئی ہے۔اور انسان کی ہر انفرادی و اجتماعی حرکت وسکون کے لئے مناسب قوانین وضع کئے گئے ہیں۔ایسے دین کو تکلفاتی اور رسمی دین سے تشبیہ یا نسبت نہیں دی جاسکتی ہے۔

خدائے متعال نے قرآن مجید میں دین اسلام کو مذکورہ بیان شدہ کیفیت میں توصیف فرمائی ہے اور اس کے علاوہ یہودیت ونصرانیت کو کہ جن کی آسمانی کتابیں توریت وانجیل ہیں اور ان میں اجتماعی احکام وقواعد وضوابط ہیں۔اسی صورت میں بیان فرمایا ہے، چنانچہ فرماتا ہے:

(و کیف یُحکّمو نكَ وعندهم التّورٰة فیها حکم الله... انّآ انزلنا التورٰة فیها هدیً وّ نور یحکم بها النبیّون الّذین اسلموا للّذین هادوا والرّبّٰنیون

والاحبار...وقفینا علی أثارھم بعیسیٰ ابن مریم ...وء اتینه الانجیل فیه ھدی وّنور و مصدقاً لما بین یدیه من التورٰة و ھدی وّ موعظة للمتّقین و لیحکم اھل الانجیل بما انزل اللہ فیه... و انزلنا الیك الکتٰب بالحق مصد قاً لما بین یدیه من الکتب ومھیمنا علیه فاحکم بینھم بما انزل اللہ...)

(مائدہ ۴۳۔۴۸)

اور یہ کس طرح آپ سے فیصلہ کرائیں گے جب کہ ان کے پاس توریت موجود ہے جس میں حکم خدا بھی ہے... بیشک ہم نے توریت کو نازل کیا جس میں ہدایت اور نور ہے اور اس کے ذریعہ اطاعت گزار انبیاء یہودیوں کے لئے فیصلہ کرتے ہیں اور اللہ والے علماء یہود...اور ہم نے انھیں انبیاء کے نقش قدم پر عیسی بن مریم کو چلایا۔...اور ہم نے انھیں انجیل دیدی جس میں ہدایت اور نور تھا اور وہ اپنے سامنے کی توریت کی تصدیق کرنے والی اور ہدایت تھی اور صاحبان تقوی کے لئے سامان نصیحت تھی...اہل انجیل کو چاہئے کہ خدا نے جو حکم نازل کیا ہے اس کے مطابق فیصلہ کریں۔...اور اے پیغمبر! ہم نے آپ کی طرف کتاب نازل کی ہے جو اپنے پہلے کی توریت اور انجیل کی مصداق اور محافظ ہے لہذا آپ ان کے درمیان تنزیل خدا کے مطابق فیصلہ کریں

توریت اور انجیل۔ جو اس وقت یہود و نصاری کے ہاتھ میں ہیں۔بھی اسی مطلب کی تائید کرتی ہیں، کیونکہ توریت میں بہت سے قوانین اور تعزیراتی ضوابط موجود ہیں اور ظاہری طور پر انجیل بھی توریت کی شریعت کی تائید و تصدیق کرتی ہے۔

نتیجه

مذکورہ بیان سے واضح ہوتا ہے کہقرآن مجید کی اصطلاح میں دین کہ وہی زندگی کی روش ہے،اوراس سے انسان پہلوتہی نہیں کرسکتا۔دین اورایک اجتماعی قانون کے درمیان جوفرق پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ دین خدا کی طرف سے ہوتا ہےاوراجتماعی قانون لوگوں کے افکار کی پیداوار ہوتا ہے۔دوسرے الفاظ میں دین لوگوں کی اجتماعی زندگی اور خدائے متعال کی پرستش اوراس کی فرمانبرداری کے درمیان ایک ربط پیدا کرتا ہے،لیکن اجتماعی قانون میں اس رابط کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی ہے۔

خدا کے قانون سے رابط کا اچھا اثر

دین انسان کی اجتماعی زندگی اور خدائے متعال کی پرستش کے درمیان رابطہ پیدا کرنے کے نتیجہ میں انسان کے تمام انفرادی واجتماعی اعمال کوخدائی ذمہ داری قرار دے کراس کوخدا کے لئے جواب دہ جانتا ہے۔چونکہ خدائے متعال اپنی لامحدودقدرت اور بے پناہ علم کی بنا پر ہر جہت سے انسان پراحاطہ رکھتا ہےاوراس کے دل ودماغ کے تمام اسرار وافکار سے مکمل طور پرآگاہ ہے اوراس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے، اسی لئے دین نے بشری قانون کی طرح امور کے نظم ونسق کو باقی رکھنے کے لئے محافظ اورنگہبان مقرر کئے ہیں اورمخالفت وسرکشی کرنے والوں کی سزا کے لئے قوانین وضع کرکے بشری قانون کی نسبت ایک اورامتیاز حاصل کیا ہے اور وہ یہ کہ:دین،انسان کی حیرت اور ہوشیاری کی باگ ڈورکوایک باطنی وابدی محافظ کے

ہاتھ میں دیتا ہے۔ کیوں کہ دین سے نہ غفلت ہوتی ہے اور نہ خطا اور اس کی جزا اور سزا سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ خدائے متعال فرماتا ہے:

(وهو معكم این ما کنتم...) (حدید۴)

اور تم جہاں بھی ہو، وہ تمہارے ساتھ ہے

(والله بما يعملون محيط) (انفال۴۷)

اور اللہ ان کے کام کا احاطہ کئے ہوئے ہے

(وانكلا لما ليوفينهم ربّك اعمالهم...) (هود۱۱۱)

اور یقیناً تمہارا پروردگار سب کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے گا۔

اگر ہم قانون کے دائرہ میں زندگی کرنے والے کے حالات کا دین کے دائرہ میں زندگی کرنے والے کے حالات سے موازنہ کریں گے تو دین کی برتری واضح اور روشن ہوجائے گی۔ کیونکہ جس معاشرے کے تمام افراد متدین ہوں اور اپنے دینی فرائض کو انجام دیں، ہر حالت میں خدائے متعال کو اپنے کاموں میں حاضر و ناظر جانیں، تو وہ ایک دوسرے سے بد ظن نہیں ہوتے ہیں۔

اس لئے ایسے ماحول میں زندگی کرنے والے عوام الناس، ایک دوسرے کی زبان اور ہاتھ سے محفوظ رہتے ہیں اور نہایت ہی آرام و مسرت کی زندگی گزارتے ہیں اور انھیں کو ابدی سعادت نصیب ہوتی ہے۔ لیکن جس ماحول میں صرف بشری قانون کی حکمرانی ہوتی ہے وہاں پر، جب تک لوگ اپنے کام پر کسی کو نگراں محسوس کرتے ہیں اس وقت تک وہ کام میں کوتاہی

نہیں کرتے، ورنہ ممکن ہیکہ وہ ہرطرح کی کوتاہی کے مرتکب ہوں۔

جی ہاں، اخلاق کے پابند معاشرے میں، جو دلی سکون پایا جاتا ہے، وہ اسی دین کا مرہون منت ہوتا ہے نہ کہ قانون کا۔

دوسرے الفاظ میں، دین، ایسے عملی و اخلاقی عقائد وضوابط کا مجموعہ ہے، جسے انبیاء خدا کی طرف سے انسان کی راہنمائی اور ہدایت کے لئے لائے ہیں۔ان عقائد کو جاننا اور ان احکام پر عمل کرنا انسان کے لئے دونوں جہاں میں سعادت کا سبب بنتا ہے۔

اگر ہم دیندار ہوں اور خداو پیغمبر کے احکام کی اطاعت کریں تو اس ناپائدار دنیا میں بھی خوش قسمت اور دوسری دنیا کی ابدی اور لامحدود زندگی میں بھی سعادت مند ہوں گے۔

وضاحت: ہم جانتے ہیں کہ سعادت مند وہ شخص ہے جس نے اپنی زندگی اشتباہ اور گمراہی میں نہ گزاری ہو، اس کے اخلاق پسندیدہ ہوں اور نیک کام انجام دیتا ہو۔خدا کا دین ہمیں اسی سعادت اور خوش بختی کی طرف ہدایت کرتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ:

اولاً: جن صحیح عقائد کو ہم نے اپنی عقل وشعور سے درک کیا ہے، انھیں مقدس ومحترم جانیں۔

ثانیاً: ہم پسندیدہ اخلاق کے مالک ہوں اور حتی الامکان اچھے اور شائستہ کام انجام دیں، اس بناء پر دین تین حصوں میں تقسیم ہوتا ہے:

۱۔عقائد

۲۔اخلاق

۳۔عمل

۱۔عقائد

اگر ہم اپنی عقل وشعور کی طرف رجوع کریں تو دیکھیں گے کہ اس عظیم اور وسیع کائنات کی ہستی،اس حیرت انگیز نظام کے ساتھ،خودبخود وجود میں آنا۔اوراس کا اول سے آخر تک کا نظم ونسق،کسی منتظم کے بغیر ہونا ممکن نہیں ہے۔یقینا کوئی خالق ہے،جس نے اپنے لامحدود علم وقدرت سے اس عظیم کائنات کو پیدا کیا ہے اور تمام امور میں پائے جانے والے ثابت ونا قابل تغیر قوانین کے ذریعہ کائنات کے نظام کو انتہائی عدل وانصاف کے ساتھ چلایا ہے ۔کوئی بھی چیز عبث خلق نہیں کی گئی ہے اور کوئی بھی مخلوق خدائی قوانین سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

لہذا یہ باور نہیں کیا جا سکتا ہے کہ،ایسا مہربان خدا،جو اپنی مخلوق پر اس قدر مہربان ہے،انسانی معاشرے کو انسان جو زیادہ تر نفسانی خواہشات کا اسیر بن کر،گمراہی اور بدبختی سے دوچار ہو تا ہے۔کی عقل کے رحم وکرم پر چھوڑ دے۔

اس بنا پر،معصوم انبیاء کے ذریعہ بشر کے لئے ایسے قواعد وضوابط کا بھیجنا ضروری ہے تا کہ ان پر عمل کر کے انسان سعادت وخوش بختی تک پہنچ جائے۔

چونکہ پروردگار کے احکام کی اطاعت کی جزا اس دنیا کی زندگی میں مکمل طور پر ظاہر نہیں ہو سکتی ،لہذا ایک ددوسرے جہان کا ہونا ضروری ہے کہ جہاں پر لوگوں کا حساب وکتاب ہو،اگر کسی نے نیک کام انجام دیا ہے تو اسے اس کی جزا ملے اور اگر کسی سے کوئی برا کام سرزد ہوا ہو تو اسے اس کی سزا ملے۔

دین ،لوگوں کو ان اعتقادات اور دیگر تمام حقیقی عقائد ۔جن کو ہم بعد میں تفیصل سے بیان کریں گے۔کی طرف تشویق کرتا ہےاورانھیں جہل و بےخبری سے پرہیز کرنے کی تاکید کرتا ہے۔

۲۔اخلاق

دین،کا ہم سے مطالبہ یہ ہے کہ زندگی میں پسندیدہ صفات اختیار کریں اوراپنے آپ کو قابل ستائش اورنیک خصلتوں سے آراستہ کریں۔ہم فرض شناس،خیر خواہ،انسان دوست،مہربان ،خوش اخلاق اورانصاف پسند بن کرحق کا دفاع کریں ۔اپنے حدوداور حقوق سے آگے نہ بڑھیں اورلوگوں کے مال ،عزت ،آبرواورجان پر تجاوز نہ کریں ۔علم ودانش حاصل کرنے میں کسی بھی قسم کے ایثاراورفداکاری سے دریغ نہ کریں،خلاصہ یہ کہ اپنی زندگی کے تمام امور میں عدل وانصاف اوراعتدال کواپنا شیوہ قراردیں۔

۳۔عمل

دین،ہمیں یہ حکم دیتا ہے کہ ہم اپنی زندگی میں وہ کام انجاں دیں جن میں ہماری اپنی اوراپنے معاشرے کی خیر وصلاح ہو۔اورفساد وتباہی مچانے والے کاموں سے پرہیز کریں۔اس کے علاوہ دین ہمیں یہ بھی حکم دیتا ہے کہ خدائے متعال کی عبادت وپرستش کے عنوان سے کچھ اعمال جیسے نماز،روزہ وغیرہ۔جو بندگی اورفرمانبرداری کی نشانی ہے۔کو بجالائیں۔

یہ وہ قواعد وضوابط اور احکام ہیں، جنھیں دین لے کر آیا ہے اور ہمیں ان کی طرف دعوت دیتا ہے۔ چنانچہ واضح ہے کہ ان ضوابط اور احکام میں سے کچھ کا تعلق عقیدہ سے کچھ کا اخلاق سے اور کچھ کا عمل سے ہے، جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ ان کو قبول کرنا اور ان پر عمل کرنا ہی انسان کے لئے سعادت وخوش بختی ہے، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ انسان کے لئے سعادت حاصل کرنا ممکن نہیں ہے مگر یہ کہ حقیقت شناس ہو اور پسندیدہ اخلاق واعمال پر مبنی زندگی بسر کرے۔

دین کا فطری ہونا

انسان اپنی فطرت اور خداداد طینت کے لحاظ سے دین کا خواہاں ہے، کیونکہ انسان اپنی زندگی کے سفر میں سعادت حاصل کرنے کے لئے مسلسل ہاتھ پاؤں مارتا ہے اور اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ان اسباب ووسائل سے استفادہ کرتا ہے جو اس کے مقاصد میں مؤثر ہیں، بیشک وہ ہمیشہ ایسے سبب کی تلاش میں ہوتا ہے جو مؤثر ہو اور وہ ناکام نہ ہو۔ دوسری طرف ہم عالم طبیعت میں کوئی ایسا سبب نہیں پاتے ہیں جس کا اثر دائمی ہو اور وہ کبھی رکاوٹوں کے مقابلہ میں ناکام نہ ہو۔

انسان فطرت کے مطابق اپنی سعادت کے لئے ایک ایسا سبب چاہتا ہے جو ناکام نہ ہو اور ایک ایسا پشت پناہ بھی چاہتا ہے کہ جو کبھی ساتھ نہ چھوڑے تا کہ اپنی زندگی کو اس سے منسلک کر دے اور باطنی آرام وسکون حاصل کر سکے، حقیقت میں دین بھی یہی چاہتا ہے۔ کیونکہ صرف خدائے متعال ہے جو اپنے ارادہ میں ہرگز مغلوب وناکام نہیں ہوتا ہے اور عذر وقصور

اس کے لئے قابل تصور نہیں ہے، اور خدائے متعال سے مربوط زندگی کے طریقوں کا نام ہی دین اسلام ہے۔

اس بناء پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان کی فطری خواہش ،دین کے تین بنیادی اصولوں توحید،نبوت اور معاد کو ثابت کرنے کے بہترین دلائل میں سے ایک ہے، کیونکہ فطری ادراک دوستی اور دشمنی کے مفہوم کو مخلوط نہیں کرتا ہے اور تشنگی کو سیراب نہیں سمجھتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ بعض اوقات انسان یہ تمنا کرتا ہے کہ پرندے کے مانند اس کے بھی پر ہوتے تا کہ پرواز کرتا یا ایک ستارہ کے مانند آسمان پر ہوتا اور طلوع وغروب کرتا ،لیکن ان کی حقیقت محض ایک تصور ہے یہ اور بات ہے کہ انسان دل کی گہرائیوں سے اپنی سعادت، مطلق راحت وسکون یا انسانی تقاضوں کی بنا پر وہ سنجیدہ زندگی کی خاطر ایک پناہ گاہ کی تلاش میں ہے اور ہرگز اس سے منہ نہیں موڑتا ہے۔

اگر کائنات میں نا قابل مغلوب سبب (خدا) نہ ہوتا تو انسان اپنی بے آلائش طبیعت سے اس کی فکر میں نہیں پڑتا اور اگر مطلق وآرام (جو آخرت کا سکون وآرام ہے) کا وجود نہ ہوتا تو انسان فطری طور پر اس کو پانے کی فکر ہی نہ کرتا اور اگر دینی طریقہ (جو نبوت کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے) حق نہ ہوتا، تو انسان کے باطن میں اس کی تصویر بھی نہ ہوتی۔

انسان مختلف قسم کی جسمانی وروحانی ، مادی ومعنوی ضرورتیں رکھتا ہے کہ جس کو اجتماعی زندگی کے ذریعہ دور کیا جاسکتا ہے اور انسانی معاشرے کا ہر فرد عام وسائل کو استعمال کر کے، کسی رکاوٹ کے بغیر، اس دنیا کی چند روزہ زندگی کو آرام وآسائش میں گزارتا ہے اور دوسری دنیا

کے لئے زادراہ حاصل کرتا ہے، پس انسانی معاشرے میں ایک ایسا قانون نافذ ہونا چاہئے جوخالق کائنات کے ارادہ کے مطابق اور فطرت وخلقت سے ہم آہنگ ہو۔اس قانون کے مطابق ہرایک کواپنی جگہ پرقرار پانا چاہئے اور معاشرے میں اپنی قدرومنزلت کے مطابق اس سے استفادہ کرے اور دوسروں کے حقوق پر تجاوز کرنے سے پرہیز کرے آخر کارمعاشرے کے تمام لوگ خدائے متعال کے ارادہ کے سامنےتسلیم ہو جائیں اورسب آپس میں بھائی بھائی اورحق وانصاف کےمقابلہ میں برابرہوجائیں۔

دین کے فائدے

مذکورہ بیانات سے ثابت ہوگیا کہ فرداورمعاشرے کی اصلاح میں دین ایک گہرااثر رکھتا ہے بلکہ یہ سعادت ونیک بختی کا منفرد وسیلہ ہے۔جو معاشرہ دین کا پابند نہ ہو وہ حقیقت پسندی اورجدت فکر سے محروم ہے،ایسے معاشرے کےلوگ اپنی قیمتی زندگی کوگمراہی اورظاہرداری میں گزارتے ہیں،عقل کو پامال کر کے حیوانوں کی طرح تنگ نظری اور بیوقوفی میں زندگی گزارتے ہیں اوراخلاقی انحطاط اورکردارکی پستی کاشکارہوتے ہیں اوراس طرح انسانی خصو صیات وامتیازات سےمحروم ہوجاتے ہیں۔

اس قسم کامعاشرہ،علاوہ اس کے کہ ابدی اورانتہائی کمال وسعادت تک نہیں پہنچتا ہے،اس دنیا کی،اپنی مختصراورناپائدارزندگی میں بھی انحرافات اورگمراہیوں کےمنحوس نتائج سے دوچارہوتا ہےاورکسی نہ کسی وقت اپنی غفلت کے برےنتائج کوبھگتے گااورواضح طورپراسے معلوم ہوگا

کہ سعادت کا راستہ دین ہی تھا اورسرانجام اپنے کردار سے پشیمان ہوگا۔ خدائے متعال قرآن مجید میں فرماتا ہے:

(قد افلح من زکّٰها ٭ وقد خاب من دسّٰها) (شمس ۹۔۱۰)

بیشک وہ کامیاب ہوگیا جس نے نفس کو پاکیزہ بنالیا.اوروہ نامرادرہا جس نے اسے آلودہ کرلیا

البتہ جاننا چاہئے کہ جس چیز سے انسان کی سعادت اورفردومعاشرے کی خوش بختی وابستہ ہے ،وہ دینی ضوابط پرعمل کرنا ہے۔صرف نام سے کام نہیں چلتا، کیونکہ جس چیز کی اہمیت و قیمت ہے وہ خود حقیقت ہے نہ حقیقت کا دعویٰ۔جو شخص اپنے آپ کومسلمان کہتا ہےلیکن اس کا باطن تاریک ہےاوروہ اخلاقی طور پرگراہوااور بدکردار ہے،اس کے باوجود سعادت کے فرشتہ کا منتظر ہے،تواسکی مثال اس بیماری کی جیسی ہے جوطبیب کے نسخہ کوجیب میں رکھ کرصحت یابی کی توقع رکھتا ہے، یقینا ایسا انسان اس فکر کے ساتھ منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا ہے۔خدائے متعال اپنے کلام میں فرماتا ہے:

(انّ الذّین ء امنوا والّذین هادوا والنّصارٰی والصّٰائبین من اٰمن باللّه و الیوم الاخر وعمل صٰالحاً فلهم اجرهم عند ربّهم ۔۔۔) (بقرہ ۶۲)

جولوگ بظاہرایمان لائے یایہودی،نصاریٰ اورصابیئن (۱) ہیں ان

....

۱۔جنہوں نے مجوسی مذہب سے یہودی مذہب کی طرف تمائل پیدا کر کے مجوسیت اور یہو دیت سے ایک درمیانی دین ایجاد کیا،انھیں صابئین کہتے ہیں۔

میں سے جو واقعی اللہ اور آخرت پر ایمان لائے گا اس کے لئے پروردگار کے یہاں اجر وثواب ہے...

ممکن ہے اس آیہ شریفہ کے مضمون سے یہ تصور کیا جائے کہ جولوگ خدااور قیامت کے دن پر ایمان لائے اورانھوں نے نیک اعمال انجام دئے ہوں، اگر چہ انھوں نے تمام پیغمبروں یا بعض پیغمبروں کوقبول بھی نہ کیا ہو،تب بھی وہ نجات پائیں گے۔لیکن جاننا چاہئے کہ سورہ نساء کی آیت نمبر ۱۵۰ اور ۱۵۱ میں پروردگار عالم ان لوگوں کو کافر جانتا ہے جو تمام پیغمبروں یا بعض پیغمبروں پر ایمان نہ رکھتے ہوں۔

تاریخ ادیان کا ایک خلاصہ

ادیان کے وجود میں آنے کے بارے میں اجمالی تحقیق، مطمئن ترین راہ۔جس پر دینی نقطہ نگاہ سے اعتماد کیا جاسکتا ہے۔قرآن مجید ہی کا بیان ہے، کیونکہ یہ ہر قسم کی خطا، اشتباہ، تعصب اور خودغرضی سے منزہ و پاک ہے۔

(انّ الدّین عند اللہ الاسلام...) (آل عمران ۱۹)

دین خدا، دین اسلام ہی ہے

جوانسان کی پیدائش کے پہلے ہی دن سے اس کے ساتھ تھا، جیسا کہ قرآن مجید میں تاکید ہوئی ہے کہ، بشر کی موجودہ نسل کی ابتداء میں دو شخص ایک مرد اور ایک عورت تھے۔مرد کا نام آدم اور اس کی بیوی کا نام حوا تھا۔حضرت آدم پیغمبر تھے اوران پر وحی نازل ہوتی تھی۔حضرت

آدم کا دین بہت سادہ اور چند کلیات پر مشتمل تھا، جیسے، لوگوں کو خدا کو یاد کرنا چاہئے اور آپس میں، خاص کر اپنے والدین کے ساتھ احسان و نیکی کرنا چاہئے، فساد، قتل اور برے کاموں سے پرہیز کرنا چاہے۔

آدم اور اُن کی بیوی کے بعد، ان کی اولاد انتہائی سادگی اور اتفاق واتحاد کے ساتھ زندگی گزارتی تھی، چونکہ دن بدن ان کی آبادی میں اضافہ ہوتا جارہا تھا، لہذا رفتہ رفتہ انہوں نے اجتماعی زندگی اختیار کر لی۔

اس طرح وہ بتدریج زندگی کے طور طریقوں کو سیکھتے تھے اور تہذیب وتمدن سے قریب ہوتے تھے۔ چونکہ آبادی بڑھتی گئی اس لئے وہ مختلف قبیلوں میں تقسیم ہو گئے اور ہر قبیلہ میں کوئی نہ کوئی بزرگ پیدا ہوتا تھا اور قبیلہ کے لوگ اس کا احترام کرتے تھے، یہاں تک کہ اس کے مرنے کے بعد اس کا مجسمہ بنا کر اس کا احترام وستائش کرتے تھے۔ اسی زمانہ سے لوگوں میں بت پرستی کا رواج پیدا ہوا، چنانچہ ائمہ علیہم السلام کی روایتوں میں آیا ہے کہ بت پرستی اسی طرح شروع ہوئی ہے اور بت پرستی کی تاریخ بھی اسی بات کی تائید کرتی ہے۔ رفتہ رفتہ طاقتور افراد کمزوروں اور ضعیفوں پر زیادتی کرنے لگے اور اسطرح لوگوں میں اختلاف پیدا ہوتا چلا گیا۔ اور یہ اتفاقی طور پر پیدا ہونے والے اختلافات ان کی زندگی میں گوناگوں کشمکش اور لڑائی جھگڑے پیدا کرنے کا سبب بنے۔

یہ اختلافات۔ جو انسان کو سعادت کی راہ سے منحرف کر کے بدبختی اور ہلاکت کی طرف لے جاتے تھے۔ اس امر کا سبب بنے کہ خدائے مہربان نے کچھ انبیاء کو منتخب کر کے آسمانی کتاب

کے ساتھ بھیجا تا کہ انسان کے اختلافات کو دور کریں، چنانچہ خدائے متعال اپنے کلام میں فر ماتا ہے:

(کان النّاس امّة واحدة فبعث الله النبيّن مبشّرين و منذرين وانزل معهم الكتٰب بالحق ليحكم بين النّاس فيما اختلفوا فيه۔۔۔) (بقرہ ۲۱۳)

(فطری اعتبار سے) سارے انسان ایک قوم تھے۔ پھر اللہ نے بشارت دینے والے اور ڈرانے والے انبیاء بھیجے اور ان کے ساتھ برحق کتاب نازل کی تا کہ لوگوں کے اختلافات کا فیصلہ کریں

دین اسلام اور اس کی آسمانی کتاب

دین اسلام، ایک عالمی اور ابدی دین ہے۔اس میں اعتقادی، اخلاقی اور عملی ضوابط کے امور کا ایک سلسلہ ہے جن پر عمل پیرا ہونے سے انسان دنیا وآخرت کی سعادت وخوش بختی حاصل کرتا ہے۔

دین اسلام کے قواعد وضوابط۔ جو خالق کائنات کی طرف سے بھیجے گئے ہیں۔ ایسے ہیں کہ اگر انسانی معاشرے کا کوئی فرد یا انسانی معاشروں میں سے کوئی معاشرہ ان پر عمل کرے تو اس کے لئے زندگی کے بہترین شرائط اور ترقی یافتہ ترین انسانی کمال حاصل ہو سکتے ہیں۔

دین اسلام، کے نیک آثار ہر فرد اور ہر معاشرے کے لئے مساوی ہیں اور چھوٹے بڑے، عالم و جاہل، مرد وعورت، سفید فام و سیاہ فام اور مشرقی ومغربی، بلا استثناء اس مقدس

دین کے فوائداور خوبیوں سے فیضیاب ہوسکتا ہے ،اوراپنی ضرورتوں کو اچھی طرح پورا کرسکتا ہے۔

دین اسلام نے اپنے معارف وضوابط کوفطرت کی بنیاد پراستوا رکیا ہے اور انسان کی ضرورتوں کو مدنظر رکھا ہے،اوران کو پورا کرتا ہے اور انسان کی فطرت اور ساخت بھی مختلف افراد،نسلوں اور متعدد زمانوں میں یکسان ہے،اس لحاظ سے واضح ہے کہ انسانی معاشرہ مشرق سے لے کر مغرب تک ایک ہی قسم کا خاندان ہے اور وہ انسانی ساخت کے اصول وارکان میں آپس میں شریک ہیں اور مختلف افراداورنسلوں کی ضرورتیں بھی مشابہ ہیں اور بشر کی آنے والے نسلیں بھی اسی خاندان کی اولاد ہیں اور یقیناانہی کے وارث ہیں اوراُن کی ضرورتیں انہی کی ضرورتیں جیسی ہوں گی۔

نتیجہ کے طور پر،اسلام ایک ایسا دین ہے جوانسان کی واقعی اورفطری ضرورتوں کو پورا کرتا ہے اورسبھی کے لئے کافی اورابدی ہے۔

اسی لئے خدائے متعال نے اسلام کودین فطرت کا نام دیاہےاورلوگوں کوانسانی فطرت کوزندہ رکھنے کی دعوت دیتاہےاوردین کے بزرگوں نےفرمایاہے:

اسلام ایک آسان دین ہے جوانسان پرمیں سختی نہیں کرتا۔

خدائے متعال نے دین اسلام کوفطرت کی بنیاد پر بنایا ہے لہذا اس کی کلیات سبھی کے لئے قابل فہم ودرک ہیں ،لیکن پھر بھی اس نے اس کے اصلی معارف وضوابط کی بنیادوں کو پیغمبراکرم حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونے والی آسمانی کتاب قرآن

مجید میں فرمایا ہے۔

دین مقدس اسلام، آخری آسمانی دین ہے اس لئے یہ مکمل ترین دین ہے۔ اس دین کے آنے کے بعد گذشتہ دین منسوخ ہو گئے، کیونکہ کامل دین کے ہوتے ہوئے ناقص دین کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دین اسلام ہمارے پیغمبر حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ بشر کے لئے بھیجا گیا ہے۔ نجات اور سعادت کا یہ دروازہ دنیا کے لوگوں کے لئے اس وقت کھولا گیا جب انسانی معاشرہ اپنی فکری ناتوانی کے دور سے گزر رہا تھا اور انسانیت کے کمال کو حاصل کرنے کے لئے مکمل طور پر آمادہ ہو چکا تھا اور الٰہی معارف اور اس کے بلند مطالب کو حاصل کرنے کی لیاقت پیدا کر چکا تھا۔

اسی لئے اسلام حقیقت پسند انسان کے لئے قابل فہم حقائق ومعارف اور پسندیدہ اخلاق لیکر آیا۔ جو انسان کا امتیاز ہے، اور انسان کی زندگی کے انفرادی و اجتماعی کاموں کو منظم کرنے والے ضوابط، لائے اور ان پر عمل کرنیکی نصیحت کی۔

ہم سب جانتے ہیں کہ دین اسلام کے معارف کلی طور پر تین حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں: اصول دین، اخلاق اور فروع فقہی نیز واضح رہے کہ اصول دین، یعنی دین کی اصلی بنیادیں، تین ہیں اور اگر انسان میں ان میں سے کوئی ایک نہ پائی جائے تو وہ دین سے خارج ہو جاتا ہے:

۱۔ توحید، یعنی خدا کی وحدانیت پر عقیدہ رکھنا۔

۲۔ انبیاء کی نبوت پر عقیدہ رکھنا، جن کے آخری پیغمبر حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ہیں۔

۳۔معاد پر ایمان ،یعنی یہ عقیدہ ہو کہ،خدائے متعال مرنے کے بعد سبھی کو زندہ کرے گا ان کے اعمال کا حساب لے گا۔نیک لوگوں کو نیکی کی جزااور برے لوگوں کو سزا دے گا۔

مذکورہ تین اصولوں میں مزید دو اصول اضافہ کئے جاتے ہیں جو مذہب شیعہ کے مخصوص عقائد ہیں کہ جن کے نہ پائے جانے پر انسان شیعہ مذہب سے خارج ہوتا ہے،اگر چہ اسلام سے خارج نہیں ہوتا اور وہ دو یہ ہیں:

۱۔امامت

۲۔عدل

دین، قرآن مجید کی نظر میں

(ان الدّین عند اللہ الاسلام وما اختلف الّذین اوتوا الکتاب الاّ من بعد ما جآء ھم العلم بغیاً بینھم و من یکفر بایات اللہ فان اللہ سریع الحساب)

(آل عمران ۱۹)

دین، اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے اور اہل کتاب نے علم آنے کے بعد ہی جھگڑا شروع کیا صرف آپس کی شرارتوں کی بنا پر اور جو بھی آیات الٰہی کا انکار کرے گا تو خدا بہت جلد حساب کرنے والا ہے۔

انبیاء نے جس دین کی طرف لوگوں کو دعوت دی ہے وہ خدا پرستی اور اس کے احکام کے مقابلہ میں تسلیم ہونا ہے۔ ادیان کے علمائ، باوجود اس کے کہ حق کی راہ کو باطل سے تشخیص دیتے تھے، تعصب و دشمنی کی وجہ سے حق سے منحرف ہوکر ہر ایک نے ایک الگ راستہ اختیار کیا، اور نتیجہ کے طور پر دنیا میں مختلف ادیان وجود میں آ گئے۔ حقیقت میں لوگوں کے اس گروہ نے آیات الٰہی کی نسبت کفر اختیار کیا ہے اور خدائے متعال ان کے اعمال کی جلد ہی سزا دے گا:

(ومن یبتغ غیر الاسلام دیناً فلن یقبل منہ وھو فی الاخرۃ من الخاسرین)

(آل عمران ۸۵)

اور جو اسلام کے علاوہ کوئی بھی دین تلاش کرے گا تو وہ دین اس سے قبول نہ کیا جائے گا اور وہ قیامت کے دن خسارہ والوں میں ہوگا۔

(یا ایّھا الذین ءآمنوا ادخلوا فی السّلم کافّۃً ولا تتّبعوا خطوات الشیطان انه لکم عدوّمّبین) (بقرہ ۲۰۸)

ایمان والو! تم سب مکمل طریقہ سے اسلام میں داخل ہو جاؤ اور شیطانی اقدامات کا اتباع نہ کرو وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

(واوفوا بعهد الله اذاعٰاهد تّم ولا تنقضوا الایمٰان بعد توکیدھٰا وقد جعلتم الله علیکم کفیلا ان الله یعلم ماتفعلون)
(نحل ۹۱)

اور جب کوئی عہد کرو تو اللہ کے عہد کو پورا کرو اور اپنی قسموں کو ان کے استحکام کے بعد ہر گز مت توڑو جب کہ تم اللہ کو کفیل اور نگران بنا چکے ہو کہ یقینا اللہ تمہارے افعال کو خوب جانتا ہے۔

اس آیۂ شریفہ کا مقصد یہ ہے کہ، مسلمان جو بھی عہد و پیمان خدا یا بندوں سے کریں، انھیں اس پر عمل کرنا چاہئے اور اسے نہ توڑیں۔

(ادع الی سبیل ربّك بالحکمة والموعظة الحسنة وجٰادلھم بالّتی ھی احسن ان ربّك ھو اعلم بمن ضلّ عن سبیله وھو اعلم بالمھتدین) (نحل ۱۲۵)

آپ اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ دعوت دیں اور ان سے اس طریقہ سے بحث کریں جو بہترین طریقہ ہے کہ آپ کا پروردگار بہتر جانتا ہے کہ کون اس کے راستہ سے بہک گیا ہے اور کون لوگ ہدایت پانے والے ہیں۔

مقصد یہ ہے کہ، دین کی ترقی کیلئے مسلمان کو ہر ایک کے ساتھ اس کی عقل وفہم کے مطابق اس

کے لئے مفید ہو، اور اگر دلیل و برہان اور نصیحت سے کسی کی راہنمائی نہ کرسکا، تو جدل (جو کہ مطلب کو ثابت کرنے کا ایک طریقہ ہے) کے ذریعہ اس کو حق کی طرف دعوت دے۔

(واذا قری القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا لعلّکم ترحمون)

(اعراف ۲۰٤)

اور جب قرآن کی تلاوت کی جائے تو خاموش ہوکر غور سے سنو شاید تم پر رحمت نازل ہو جائے

۔

(یا ایّها الّذین امنوا اطیعوا الله و اطیعوا الرّسول و اولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیءٍ فرُدّوه الی الله و الرّسول ان کنتم تومنون بالله و الیوم الاٰخر ذلك خیر و احسن تاویلا) (نساء ۵۹)

ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اور صاحبان امر کی اطاعت کرو جو تمھیں میں سے ہیں، پھر اگر آپس میں کسی بات میں اختلاف ہو جائے تو اسے خدا اور رسول کی طرف پلٹا دو اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھنے والے ہو، یہی تمہارے حق میں خیر اور انجام کے اعتبار سے بہترین بات ہے۔

مقصد یہ ہے کہ اسلامی معاشروں میں، اختلاف دور کرنے کا وسیلہ، قرآن مجید اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہے، اور ان دو دلیلوں کے ذریعہ ہر اختلاف کو حل کرنا چاہئے اور اگر کسی مسلمان نے عقل سے اختلاف دور کیا، تو وہ بھی اس لئے ہے کہ قرآن مجید نے عقل کے حکم کو قبول کیا ہے۔

(فبما رحمةٍ من الله لنت لهم ولو کنت فظّاً غلیظ القلب لانفضّوا من حولك

فاعف عنهم و استغفر لهم و شاورهم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللہ ان اللہ یحبّ المتوکّلین)

(آل عمران ۱۵۹)

پیغمبر! یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے نرم ہو ورنہ اگر تم بدمزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے ،لہذ تم انھیں معاف کردو۔ان کے لئے استغفار کرو اور ان سے جنگ کے امور میں مشورہ کرو اور جب ارادہ کر و تو اللہ پر بھروسہ کرو کہ وہ بھروسہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے

کیونکہ نیک برتاؤ، خیر خواہی اور امور میں مشورہ کرنا ،انس ومحبت کا وسیلہ ہے اور معاشرہ کے افراد کو اپنے سر پرست سے محبت کرنی چاہیئے تا کہ وہ ان کے دلوں میں نفوذ کر سکے۔خدائے متعال مسلمانوں کے سر پرست کو خوش اخلاقی اور مشورہ کا حکم دیتا ہے،اور یہ حکم اس لئے ہے کہ ممکن ہے لوگ اپنی سوچ میں غلطی کریں لہذا حکم دیتا ہے کہ مشورت کے بعد اپنے فیصلہ میں آزاد ہو اور اس لئے کہ خدا کے ارادہ سے کوئی مخالفت نہیں کرسکتا ہے،اپنے امور میں خدا پر توکل کر کے اپنے کام اسی کے سپرد کرے۔

معاشرے میں دین کا کردار

دین،ایک بہترین روش ہے،جس سے انسانی معاشرہ کو منظم کیا جا سکتا ہے اور یہ دوسری تمام روشوں سے زیادہ لوگوں کو اجتماعی قوانین کی رعایت کرنے پر ابھارتا ہے، اور جب ہم ان

اسباب وعلل کا مطالعہ کرتے ہیں جو ماضی میں انسانی معاشرے کے وجود میں آنے کا سبب بنے ہیں تو یہ حقیقت مکمل طور پر واضح ہوجاتی ہے۔

انسان زندگی میں اپنی سعادت وکامرانی کے علاوہ کسی چیز کونہیں چاہتا ہے اوراس کے لئے کوشش کرتا ہے۔البتہ یہ سعادت زندگی کے تمام وسائل کی فراہمی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ دوسری طرف انسان اپنے خداداد فہم وشعور سے درک کرتا ہے کہ وہ ان تمام ضرورتوں کوتنِ تنہا پورانہیں کرسکتا کہ جن سے وہ اپنی من پسند سعادت کوحاصل کرسکے۔واضح ہے کہ زندگی کی تمام ضرورتوں کو پورا کرنا ایک شخص کے بس کی بات نہیں ہے،خواہ وہ کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو۔اس لحاظ سے انسان اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے اپنے ہی جیسے لوگوں سے مدد لینے پر مجبور ہے تا کہ اپنے ضروری اورحیات آفرین وسائل کوحاصل کرسکے،اس صورت میں کہ ہرایک ان وسایل میں سے کسی ایک کوحاصل کرنے کی ذمہ داری کوقبول کرتا ہے اوراسے فراہم کرتا ہے ،اس کے بعد تمام افراد اپنی فعالیتوں کے ماحصل کو ایک جگہ جمع کرتے ہیں اوران میں سے ہرشخص اپنی فعالیت اورحیثیت کے مطابق حصہ لیتا ہے اوراس سے اپنی زندگی کو چلاتا ہے۔

اس طرح ،انسان اپنی سعادت کو پورا کرنے کے لئے اپنے ہم نوع انسانوں کا تعاون کرتا ہے اوراُن سے تعاون لیتا ہے ،یعنی مختصر یہ کہ تمام لوگ ایک دوسرے کے لئے کام کرتے ہیں اوراس کام کے نتیجہ کوجمع کرتے ہیں اورمعاشرے کا ہرفرد اپنی حیثیت اور فعالیت کے مطابق اپنا حصہ لے لیتا ہے۔

معاشرے کو قوانین کی ضرورت

لوگوں کی محنت ومشقت کا ماحصل چونکہ ایک ہوتا ہے اور سب اس سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں اس لئے معاشرے کو کچھ قوانین کی ضرورت ہے تاکہ ان کی رعایت سے بغاوت اور لاقانونیت کو روکا جاسکے۔واضح ہے کہ اگر معاشرے کا نظام چلانے کے لئے کچھ ضوابط وقوانین نہ ہوں تو افراتفری پھیلتی ہے اور انسانی معاشرہ اپنی زندگی کو ایک دن بھی جاری نہیں رکھ سکتا۔

البتہ یہ قوانین معاشرے اقوام،لوگوں کی فکری سطح اور حکومتی دفاتر کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں۔بہرحال کوئی بھی ایسا معاشرہ نہیں پایا جاسکتا جو ایسے قوانین سے بے نیاز ہو کہ جن کا اکثر افراد احترام کرتے ہوں۔تاریخ بشریت میں ہرگز ایسا کوئی معاشرہ نہیں پایا گیا جس میں کسی قسم کے مشترک آداب ورسوم وقوانین وضوابط نہیں تھے۔

قوانین کے مقابلہ میں انسان کا آزاد ہونا

چونکہ انسان اپنے تمام کام اپنے اختیار سے انجام دیتا ہے،اس لئے وہ ایک طرح کی آزادی محسوس کرتا ہے اور وہ اس آزادی کو مطلق یعنی بدون قیدوشرط تصور کرکے،مکمل آزادی چاہتا ہے اور ہر قسم کی پابندی سے بھاگتا ہے۔اسی وجہ سے وہ ہرطرح کی رکاوٹ ومحرومیت سے رنجیدہ ہوتا ہے اور مختصر یہ کہ وہ ہر دھمکی سے اپنے اندر دباؤ اور خاص ناکامی کا احساس کرتا ہے

،اس لحاظ سے اجتماعی قوانین چاہے کتنے ہی کم کیوں نہ ہوں ،چونکہ وہ ایک حد تک انسان کو پابند کرتے ہیں،لہذا وہ اسکی حریت پسندی کے خلاف ہوں گے۔

دوسری طرف انسان یہ سوچتا ہے کہ اگر معاشرا اوراس کے نظم ونسق کے تحفظ کے لئے وضع کئے گئے قوانین کے مقابلہ میں اپنی آزادی سے کسی حد تک دستبردار نہ ہوجائے تو افراتفری پھیل کراس کی پوری آزادی وآسائش ختم ہوجائے گی ،چنانچہ اگر وہ کسی کے ہاتھ سے ایک لقمہ لے گا تو دوسرے لوگ اس کے ہاتھ سے پورا کھانا چھین لیں گے اوراگر وہ کسی پر ظلم کرے گا تو دوسرے بھی اس پر ظلم کریں گے۔

اس لحاظ سے اسے چاہیے کہ اپنی آزادی کے ایک حصہ کو محفوظ رکھے ،اوراس کے دوسرے حصہ سے صرف نظر کرے تواس طرح وہ اجتماعی قوانین وضوابط کا احترام کرے گا۔

قوانین کی ترقی میں کمزوریاں

مذکورہ مطالب کے پیش نظر،انسان کی آزاد پسند ذہنیت اوراجتماعی ضوابط کے درمیان ایک قسم کا ٹکراؤ اورتضاد موجود ہے۔یعنی قوانین ایک قسم کی زنجیر ہے جواس کے پاؤں میں پڑی ہے اوروہ ہمیشہ اس زنجیر کو توڑنا چاہتا ہے تاکہ اس پھندے سے رہائی پائے اور یہ اجتماعی قوانین کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے جواس کی بنیادوں کو متزلزل کردیتا ہے۔

اسی لئے ہمیشہ قوانین اورعملی فرائض کی خلاف ورزی کرنے والوں کی سزا کے لئے کچھ اور قواعدوضوابط بنائے جاتے ہیں تاکہ لوگوں کو قوانین کی خلاف ورزی کرنے سے روکا جاسکے

،اس سلسلہ میں کبھی لوگوں کوقوانین کی اطاعت کرنے کی تشویق کے لئے انعامات کی امید دلائی جاتی ہے۔البتہ اس سے انکارنہیں کیا جاسکتا ہے کہ یہ مسئلہ (یعنی سزا کا خوف اور جزا کا شوق) قوانین کے نفاذ میں کسی حدتک مدد کرتا ہے۔لیکن یہ خلاف ورزی کے راستہ کوسو فیصد بند کر کے قانون کے اثر وتسلط کومکمل طور پر تحفظ نہیں بخش سکتا، کیونکہ تعزیراتی قوانین بھی دوسرے کارآمد قوانین کے محتاج ہونے کی وجہ سے خلاف ورزی سے محفوظ نہیں ہیں اور انسان کی آزاد پسند طبیعت کی طرف سے انہیں ہمیشہ خطرہ لاحق رہتا ہے۔چونکہ جولوگ مکمل طور پر نفوذ اورطاقت رکھتے ہیں وہ کسی خوف و ہراس کے بغیر کھلم کھلا مخالفت کر سکتے ہیں یا نفوذ کے ذریعہ،عدلیہ اور انتظامی محکموں کو اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔

جولوگ نفوذ وطاقت نہیں رکھتے ہیں ،وہ بھی معاشرے کی ہدایت کرنے والوں کی غفلت یا کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مخفیانہ طور پرخلاف ورزی کر سکتے ہیں، یا رشوت اورسفارش کے ذریعہ یا معاشرے کے با اثر اشخاص کے ساتھ دوستی اور رشتہ داری کے ذریعہ اپنے مقصد تک پہنچ سکتے ہیں اوراس طرح معاشرے کے نظم کو عام حالات سے خارج کرکے ناکارہ بنا سکتے ہیں۔

اس بات کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ ہم مختلف انسانی معاشروں میں اس قسم کی مخالفتوں اور قانونشکنی کے ہزاروں نمونے روزانہ مشاہدہ کرتے ہیں۔

قانون میں خامی کا اصلی سرچشمہ

اب دیکھنا چاہئے کہ اس خطرہ کا سرچشمہ کہاں ہے اور انسان کی سرکش اور آزادی پسند طبیعت کو کیسے قابو میں کیا جائے اور نتیجہ میں قانون کی مخالفت کو روکا جائے؟

اس خطرہ کا سرچشمہ۔ جو معاشرے میں فساد برپا کرنے کا سب سے بڑا سبب ہے یہاں تک کہ قوانین بھی اسے روک نہیں سکتے۔ یہ ہے کہ عام اجتماعی طریقے، جو قوانین کو وجود میں لاتے ہیں، کہ جن کا تعلق افراد کے مادی مراحل سے ہے، وہ ان کی معنویات اور باطنی فطرتوں کی کوئی اعتنا نہیں کرتے اور ان کا مقصد صرف ہماھنگی اور نظم و نسق کا تحفظ اور لوگوں کے اعمال کے درمیان توازن برقرار رکھنا ہوتا ہے تا کہ اختلاف اور کشمکش کی نوبت نہ آئے۔

اجتماعی قانون کا تقاضا یہ ہے کہ قانون کی شقوں پر عمل کیا جائے اور معاشرے کے امور کو کنٹرول کیا جائے۔ اس قانون کا انسان کے داخلی صفات اور باطنی جذبات سے کوئی تعلق نہیں ہے، جو ان اعمال کے محرک اور قوانین کے داخلی دشمن ہیں۔

اس کے باوجود اگر انسان کی آزادی پسند فطرت اور دوسرے سیکڑوں جبلتوں (جیسے خودخواہی اور شہوت پرستی جو مفاسد کے اصلی سبب ہیں) کی طرف توجہ نہ کی جائے تو معاشرے میں افراتفری اور لاقانونیت رائج ہو جائے گی اور اختلافات کا دامن روز بروز پھیلتا جائے گا، کیونکہ تمام قوانین کو ہمیشہ قوی باغیوں اور سرکشوں کے حملہ کا خطرہ لاحق ہوتا ہے جو انہی جبلتوں سے پیدا ہوتے ہیں اور کوئی قانون بُرے کو کنٹرول کر کے اختلافات کو نہیں روک سکتا ہے۔

تمام قوانین پر دین کی ترجیح

قانون کے تحفظ کے لئے آخری طریقہ،تعزیراتی قوانین وضع کرنا اور محافظ مقرر کرنا ہے لیکن جیسا کہ بیان کیا گیا،تعزیراتی قوانین اور محافظ انسان کی سرکشی اور دیگر جبلتوں کو روک نہیں سکتے تاکہ اجتماعی قوانین پر عمل ہو سکے۔

دین کے پاس مذکورہ وسائل کے علاوہ مزید دو طاقتور وسیلے بھی موجود ہیں،جن سے وہ ہر مخالف طاقت کو مغلوب کر کے اسے تہس نہس کر سکتا ہے:

١۔ ہر دین دار فرد دین کی راہنمائی سے اس حقیقت تک پہنچتا ہے کہ اس کی زندگی اس ناپائدار اور گزر جانے والی دنیا کی چند روزہ زندگی تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس کے سامنے ایک ابدی اور لامحدود زندگی ہے، جو موت سے نابود نہیں ہوتی۔اس کی ابدی سعادت اور آسائش صرف اس میں ہے کہ وہ پروردگار عالم کی طرف سے اس کے پیغمبروں کے توسط سے بھیجے گئے قوانین کی پیروی کرے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ دینی قوانین، ایک ایسے دانا اور بینا پروردگار کی طرف سے بھیجے گئے ہیں، جو انسان کے باطن وظاہر سے آگاہ ہے اور اپنی مخلوق سے ایک لمحہ بھی غافل نہیں رہتا۔ایک ایسا دن آنے والا ہے جس دن وہ اسی انسان کو اپنے پاس بلائے گا،اس کے پنہاں اور آشکار اعمال کا حساب و کتاب لے گا اور نیک اعمال کی پاداش اور برے اعمال کی سزا دے گا۔

٢۔ ہر دیندار شخص اپنے دینی عقائد کے مطابق جانتا ہے کہ جب دینی حکم کو بجالاتا ہے تو وہ

اپنے پروردگار کی اطاعت کرتا ہے، اس کے باوجود وہ بندگی کی رسم کے مطابق کسی اجر یا داش کا مستحق نہیں ہے، لیکن پروردگار کے فضل وکرم سے اس کو نیک پاداش ملے گی، اس لحاظ سے ہر اطاعت کو انجام دے کر اس نے حقیقت میں اپنے اختیار سے ایک معاملہ اور ایک لین دین کیا ہے۔ چونکہ وہ اپنی مرضی سے اپنی آزادی کے ایک حصہ سے دست بردار ہوا ہے اور اس کے مقابلہ میں اپنے پروردگار کی خوشنودی ومہربانی حاصل کی ہے، اس لئے اسے اپنی نیکیوں کی پاداش ملے گی۔

دیندار شخص، دینی قوانین وضوابط کی پیروی کر کے اپنی پوری خوشی سے معاملہ کرنے میں مشغول ہوجاتا ہے اور جو کچھ اپنے اختیار سے دیتا ہے اس کے کئی گنا نفع کماتا ہے۔ وہ ایک چیز کو بیچ کر اس کے بدلے میں اس سے بہتر مال خرید لیتا ہے۔ لیکن جو شخص دین کا پابند نہیں ہوتا، چونکہ وہ ضوابط کی رعایت اور قانون کی پیروی کو اپنے لئے ایک نقصان تصور کرتا ہے اور اس کی آزادی پسند طبیعت اس کی آزادی کے ایک حصہ کو کھو دینے سے ناراض ہوتی ہے۔ وہ اس موقع کی تلاش میں ہوتا ہے کہ اس زنجیر کو توڑ کر اپنی آزادی حاصل کرے۔

نتیجہ

مذکورہ بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ معاشرے کی زندگی کے تحفظ کے لئے دین کا اثر غیر دینی طریقوں کی نسبت زیادہ قوی اور عمیق ہے۔

دوسروں کی کوشش

دنیا کے پسماندہ ممالک، جوقرن اخیر میں ترقی وپیش رفت کی فکر میں ہیں، اگر چہ انہوں نے اجتماعی حکومت کوقبول کیا ہے، لیکن قانون کی ضعیف شقوں کی طرف توجہ نہیں کی ہے اور دین کی طاقت سے استفادہ نہیں کیا ہے، اس لئے ان کی دنیا تاریک ہوئی ہے اوران کی زندگی کا ماحول جنگل کے قانون میں تبدیل ہوا ہے۔

ان کے مقابلہ میں، دنیا کی ترقی یافتہ اور ہوشیار قوموں نے، قوانین کی کمزوری سے آگاہ ہوکر ،قانون کو حتمی ناکامی سے نجات دلانے کے لئے، کچھ کوششیں کر کے ایک دوسرا راستہ اختیار کیا ہے۔

ان قوموں نے تعلیم وتربیت کے نظام کو ایسے منظم کیا ہے کہ لوگوں میں خود بخود صحیح اخلاق پید ہوں اور جب وہ عملی میدان میں قدم رکھیں، تو قانون کو مقدس اور نا قابل مخالفت سمجھیں۔

اس قسم کی تربیت قانون کے عام طور پر نافذ ہونے کا سبب بنتی ہے اور نتیجہ میں قابل توجہ حد تک معاشرے کی سعادت کو پورا کر کے قانون کو ناکامی سے نجات دلائی جاتی ہے۔ لیکن جاننا چاہئے کہ ایسے معاشروں میں پرورش پانے والے افکار دو قسم کے ہوتے ہیں:

۱۔انسان دوستی جیسے عقائد وافکار، اپنے ماتحتوں کے ساتھ خیر خواہی اور رحم دلی، جو حقیقت پسندی پر استوار ہوں، بیشک ان کو آسمانی ادیان سے لیا گیا ہے اور قدیم زمانے سے (جبکہ ترقی یافتہ معاشرے وجود میں نہیں آئے تھے) دین، لوگوں کو ان افکار کی طرف دعوت دیتا رہا ہے۔

لہذا، جوخوش بختی اورسعادت ان افکار کے ذریعہ ترقی یافتہ معاشروں میں نظر آرہی ہے، وہ دین کے برکات میں شمار ہوتی ہے۔

۲۔بیہودہ اورافسانوی عقائدوافکار،جن کی خرافات کے بازار کے علاوہ کہیں کوئی اہمیت نہیں ہے،مثال کے طور پر افراد کوتلقین کی جاتی ہے کہ اگر وطن کی نجات کی راہ میں کوئی تکلیف اٹھائی یاقتل کئے گئے تو،تمہارا نام تاریخ کے صفحات میں سنہرے حروف سے لکھا جائے گااگر چہ،اس قسم کےخرافاتی تصورات کاایک عملی نتیجہ ہوتاہےاور یہ بھی ممکن ہےکوئی شخص اس پروپیگنڈے سے متاثر ہوکر میدان جنگ میں جان نثاری کا ثبوت دے اور بہت سے دشمنوں کوقتل کردے،لیکن وہ فائدے کے بجائےقوم کو بہت بڑا نقصان پہنچاتا ہے، کیونکہ یہ تفکرانسان کوخرافاتی بنا کراس کی حقیقت پسندانہ فطرت کو بیکار بنادیتی ہے، جولوگ خدااور قیامت پرایمان نہیں رکھتے اورموت کونابودی اورفنا سمجھتے ہیں،ان کی نظر میں موت کے بعد ابدی اورکامیاب زندگی کامفہوم ومعنی نہیں ہے۔

انسان کے آرام و آسائش میں اسلام کی اہمیت

جیسا کہ ہم نے بیان کیا، دینی قوانین، دوسرے اجتماعی طریقوں کی بہ نسبت ممتاز ہیں۔ تمام ادیان میں اسلام کو برتری حاصل ہے۔ اس لحاظ سے انسانی معاشروں کے لئے اسلام دوسرے تمام روشوں سے زیادہ مفید ہے۔ اور اسلام اور دوسرے ادیان اور اجتماعی طریقوں کے موازنہ سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے۔

اسلام کا دوسرے ادیان سے موازنہ

اسلام، تمام ادیان کے درمیان منفرد دین ہے جو سو فیصد اجتماعی ہے۔ اسلام کی تعلیمات آج کل کے عیسائی دین کے مانند نہیں ہیں جو صرف لوگوں کی اخروی سعادت کو مدنظر رکھتا ہے اور ان کی دینوی سعادت کے بارے میں خاموش ہے اور نہ ہی یہودیوں کے موجودہ دین کے مانند ہیں جو صرف ایک ملت کی تعلیم و تربیت کی مقبولیت کو مدنظر رکھتا ہے۔ اسلام کی تعلیمات مجوس اور دیگر مذاہب کے مانند صرف اخلاق و اعمال سے مربوط چند موضوعات تک محدود نہیں ہیں، بلکہ اسلام میں تمام لوگوں کے لئے دنیا و آخرت کی تعلیم و تربیت کو ہمیشہ کے لئے اور ہر زمان و مکان میں، مدنظر رکھا گیا ہے بدیہی ہے کہ اس کے علاوہ معاشرے کی اصلاح اور لوگوں کی دنیا و آخرت کی سعادت کے لئے کوئی اور راستہ نہیں ہے:

اوّلاً: تمام انسانی معاشروں میں۔ جو اچھے روابط سے روز بروز نزدیک اور محکم تر ہو رہے ہیں

۔صرف ایک معاشرہ یا ایک ملت کی اصلاح کرنا حقیقت میں ایک فضول کوشش ہے اور ایک بڑے آلودہ تالاب یا نہر کے ایک قطرہ پانی کو تصیفہ کرنے کے مانند ہے۔

ثانیا: دوسرے معاشروں کے بارے میں غفلت کرتے ہوئے صرف ایک معاشرے کی اصلاح کرنا ایک ایسا امر ہے جو اصلاح طلبی کی حقیقت کے خلاف ہے۔اسلامی تعلیمات میں کائنات اور انسان کی خلقت کے بارے میں انسان کے ذہن میں پیدا ہونے والے افکار ،اخلاق اور انسانی زندگی میں پائی جانے والی تمام سرگرمیاں،کی تحقیق کی گئی۔

لیکن اسلام میں افکار کے بارے میں، جو عقائد حقیقت پسندانہ پہلوؤں پر مشتمل ہیں اور ان میں سرفہرست خدائے متعال کی وحدانیت ہے،وہ اصل اور بنیاد قرار پائے ہیں۔اور اخلاق اسلامی میں،وہ حقیقت جسے عقل سلیم قبول کرتی ہے،وہ توحید کی بنیاد پر استوار ہوئی ہے پھر اس کے بعد اخلاق کی بنیاد پر،قواعد وضوابط اور عملی قوانین بیان کئے گئے ہیں،جس کے نتیجہ میں ہر کالے گورے،شہری و دیہاتی ،مرد وعورت،چھوٹے بڑے،غلام و آقا،حاکم ورعایا،امیر وغریب اور عام وخاص کے لئے انفرادی واجتماعی فرائض بیان کئے گئے ہیں:

(...كلمةً طيبةً كشجرة طيبةٍ اصلها ثابت وفرعها فى السّماء) (ابراهيم ۲۴)

...کلمہ طیبہ کی مثال شجرہ طیبہ سے بیان کی ہے جس کی اصل ثابت ہے اور اس کی شاخ آسمان تک پہنچی ہوئی ہے۔

جو شخص اسلام کے بنیادی معارف،اخلاقی تعلیمات اور فقہ اسلامی پر محققانہ نظر ڈالے،گا تو وہ ایک ایسے بے کراں سمندر کا مشاہدہ کرے گا جس کی حدود اور گہرائیوں تک پہنچنے میں انسانی

عقل وشعور قاصر ہے اس کے باوجود اس کا ہر جزء ودوسرے اجزا سے متصل اور متناسب ہے اور یہ سب اجزاء مل کر خدا پرستی اور انسان پروری کو تشکیل دیتے ہیں، جیسا کہ خدائے متعال نے اپنے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی کی ہے۔

سماج کے رسم ورواج سے اسلام کا موازنہ

جب ہم دنیا کے ترقی یافتہ معاشروں کے طور طریقوں پر سنجیدگی سے نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اگر چہ ان معاشروں کی سائنسی اور صنعتی ترقی نے عقلمندوں کو متحیر کر دیا ہے، وہ طاقت وترقی کے بل بوتے پر مریخ اور چاند پر کمند ڈال رہے ہیں، ان کی ملکی تشکیلات نے انسان کو حیرت میں ڈال دیا ہے، لیکن یہی ترقی کے راستے اپنی قابل ستائش ترقی کے باوجود ، عالم بشریت پر بدبختی وبدنصیبی ایسے مصائب کا سبب بنے ہیں۔ پچیس سال سے کم عرصہ میں دنیا کو دو بار خاک وخون میں غرق کر کے لاکھوں انسانوں کو نابود کر دیا ہے اور اس وقت بھی تیسری عالمی جنگ کا فرمان ہاتھ میں لئے ہوئے عالم بشریت کو نابود کرنے کی دھمکی دے رہے ہیں۔ انہی طریقوں نے اپنی پیدائش کے پہلے ہی دن سے انسان دوستی اور آزادی دلانے کے نام پر دنیا کے دیگر ممالک اور ملتوں کے ماتھے پر غلامی کے داغ لگا کر دنیا کے چار بڑے براعظموں کو اپنی استعماری زنجیروں میں جکڑ کر کسی قید وشرط کے بغیر براعظم یورپ کا غلام بنا دیا ہے اور ایک حقیر اقلیت کو کروڑوں بے گناہ انسانوں کے مال، جان ورعزت پر مسلط کر دیا ہے۔

البتہ یہ بات نا قابل انکار ہے کہ ترقی یافتہ ملتیں اپنے ماحول میں مادی نعمتوں اورلذتوں سے سرشار ہیں اور بہت سے انسانی آرزؤوں جیسے اجتماعی انصاف اور ثقافتی وصنعتی ترقی تک پہنچ چکے ہیں۔لیکن وہ اس کے ساتھ ہی بے پناہ بدبختیوں اور بےشمار تاریکیوں سے دوچار ہوئے ہیں کہ ان میں سے اہم ترین یہ ہے کہ بین الاقوامی کشمکش اور خون ریزیاں دنیا کے مستقبل کوعوامی سطح پر اور ہر لمحہ ماضی سے بدتر وحوادث کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں۔

واضح رہے کہ یہ سب تلخ وشرین نتائج ،ان ملتوں ومعاشروں کی تہذیب وتمدن اور زندگی کے طور طریقوں کے درخت کا پھل ہیں جو بظاہر ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔

لیکن جاننا چاہئے کہ اس کے میٹھے پھل جن سے انسان نے بہرہ مند ہوکر معاشرے کو باسعادت بنادیا ہے،ان ملتوں کے بہت سے پسندیدہ اخلاق جیسے سچائی،صحیح کام،فرض شناسی،خیر خواہی اور فداکاری کا نتیجہ ہے،نہ صرف قانون کا! کیونکہ یہی قوانین پسماندہ ملتوں ،جیسے ایشیا اور افریقہ میں بھی موجود ہیں حالانکہ ان کی پستی اور بدبختی میں دن بدن اضافہ ہوتا جارہاہے۔

لیکن اس درخت کا تلخ پھل۔جس سے انسان آج تک کو تلخ کام ہے وہ انسان کے لئے تاریکی اور بدبختی کا سبب بنا ہے اور خود ان ترقی یافتہ ملتوں کو بھی دوسروں کی طرح نابودی کی طرف کھینچ رہا ہے۔ کچھ ناپسندیدہ اخلاق ہیں،جن کا سرچشمہ:حرص،طمع، بے انصافی، بے رحمی،غرور،تکبر،ضد،اور ہٹ دھرمی ہے۔

اگر ہم دین مقدس اسلام کے قوانین پر سنجیدگی سے غور کریں،تو ہم متوجہ ہوں گے کہ اسلام

مذکورہ صفات کے پہلے حصہ کا حکم دیتا ہے اور دوسرے حصہ سے روکتا ہے، مختصر یہ کہ کلی طور پر تمام حق اور نیک انسان کی مصلحت کے امور کی دعوت دیتا ہے اور انھیں اپنی تربیت کی بنیاد قرار دیتا ہے اور ہر اس ناحق اور برے کام سے روکتا ہے جو انسان کی زندگی کے آرام میں خلل ڈالتا ہے (خواہ کسی خاص قوم وملت سے مربوط ہو)

نتیجہ

مذکورہ بیانات کے نتیجہ کے طور پر مندرجہ ذیل چند نکات ذکر کئے جاتے ہیں:

۱۔اسلام کا طریقہ دوسرے تمام اجتماعی طریقوں سے زیادہ پسندیدہ اور انسانیت کے لئے زیادہ مفید ہے:

(...ذلك دين القيّم ولكن اكثر النّاس لا يعلمون) (روم ۳۰)

...یقینا یہی سیدھا اور مستحکم دین ہے مگر لوگوں کی اکثریت اس بات سے بالکل بے خبر ہے

۲۔موجودہ دنیا کی تہذیب وتمدن کے واضح نقوش اور میٹھے پھل سبھی دین مقدس اسلام کی برکتیں اور اس کے آثار کی زندہ شقیں اور اصول ہیں جو مغرب والوں کے ہاتھ لگ گئے ہیں ، کیونکہ اسلام ،مغربی تمدن کے آثار کے رونما ہونے سے صدیوں پہلے لوگوں کو انہی اخلاقی اصولوں کی طرف دعوت دے رہا تھا کہ یورپ والوں نے ان پر عمل کرنے میں ہم سے پیش قدمی کی۔

امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام زندگی کے آخری لمحات میں لوگوں سے فرماتے تھے:

تمہارا برتاؤ ایسا نہ ہو کہ دوسرے لوگ قرآن مجید پر عمل کرنے میں تم سے آگے بڑھ جائیں (۱)۔

۳۔اسلام کے حکم کے مطابق اخلاق کو اصلی مقصد قرار دینا چاہئے اورقوانین کو اس کی بنیاد پر مرتب کرنا چاہئے، کیونکہ پسندیدہ اخلاق کو فراموش کرنا (جو انسان کو حیوان سے ممتاز کرنے کا سبب ہے) انسان کو معنویت سے مادیت کی طرف ڈھکیل دیتا ہے اوراس کو بھیڑیئے، چیتے اور گائے جیسا درندہ بنا دیتا ہے نیز اس میں گوسفند کے صفات پیدا کر دیتا ہے۔

....

۱۔نہج البلاغہ، صبحی صالح، ص۴۲۲۔

اسی وجہ سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

بُعِثتُ لاُتَمِّم مکارم الاخلاق (۱)

میری بعثت کا اصلی مقصد، لوگوں کی اخلاقی تربیت ہے

....

۱۔بحارالانوار، ج۷۱، ص۳۷۳۔

طبیعی وسائل سے اسلام کی ترقی

غیر طبیعی وسائل، کہ جن کا کوئی مادی وجود نہیں ہے، ناکام ہوتے ہیں اورجلد یا کچھ مدت بعد نابود ہوجاتے ہیں، اسلام جیسے دین میں جو کہ بشریت پر ہمیشہ حکومت کرنا چاہتا ہے، ان غیر

طبیعی وسائل سے استفادہ کرنا صحیح نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اپنی ترقی میں طاقت کا سہارا نہیں لیا ہے. یہ جو بعض لوگ کہتے ہیں کہ اسلام تلوار کا دین ہے حقیقت میں یہ لوگ صدر اسلام کی جنگوں کو ظاہری طور پر دیکھتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ غلط فہمی کا شکار ہوجاتے ہیں اور آنکھیں بند کر کے فیصلہ کر دیتے ہیں ۔جو دین علم و ایمان کی بنیاد پر وجود میں آیا ہو،اس کے لئے بعید ہے کہ وہ اپنی ترقی اور لوگوں کے دلوں میں ایمان پیدا کرنے کے لئے تلوار کا سہارا لے لے (اسلام میں جہاد کے فلسفہ کا مطالعہ فرمائیں)اسی لئے اسلام نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے نیرنگ،جھوٹ اور سیاسی شعبدہ بازی کا سہارا نہیں لیا ہے اور انہیں صحیح نہیں جانا ہے، کیونکہ اسلام صرف یہ چاہتا ہے کہ حق زندہ ہو اور باطل نابود ہو اور حق تک پہنچنے کے لئے باطل کی راہ پر گامزن ہونا ،حق کی نابودی کا سبب بنتا ہے۔

خدائے متعال اپنے کلام میں فرماتا ہے:

خدا ظالموں ،بدکاروں اور حق کو چھپانے والوں کو اپنے مقصد میں کامیاب ہونے نہیں دیتا (۱)

تبلیغ اور دعوت اسلام

اسلام نے لوگوں کی ہدایت اور حق کو پھیلانے کے لئے ایک ایسے راستہ کا انتخاب کیا ہے جو انسان کی فطرت اور خلقت کے عین مطابق ہے اور وہ تبلیغ اور دعوت کا راستہ ہے، جو انسان

کے لئے حقائق، حقیقت پسندانہ فطرت اور سعادت طلبی کو واضح کر کے اسے بیدار کر دیتا ہے اور آسانی کے ساتھ اسے حق کے حوالے کرتا ہے۔

یہ روش، یعنی تبلیغ ودعوت، ایک ایسی روش ہے جسے تمام انبیاء علیہم السلام نے اختیار کیا ہے۔ اسلام، جو خاتم ادیان اور بھر پور صلاحیتوں کا حامل دین، میں اس سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا گیا ہے اور اس راستہ کا اپنانا مسلمانوں پر واجب کیا گیا ہے، تاکہ دین کی نشر واشاعت میں کوتاہی نہ کریں۔

خدائے متعال اپنے پیغمبر ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

میرا اور میرے پیروؤں کا راستہ یہ ہے کہ وہ مکمل بصیرت کے ساتھ لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دیتے ہیں (۲)

....

۱۔بقرہ ۱۵۹ و ۱۷٤۔

۲۔یوسف ۱۰۸۔

تبلیغ کا طریقہ

مذکورہ آیہ شریفہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوت وتبلیغ کا کام مکمل بصیرت سے انجام پانا چاہئے، مختصر یہ کہ مبلغ کو تبلیغ سے مربوط دینی مسائل سے آگاہ ہونا چاہئے، اور تبلیغ کے طریقہ کار،

شرائط اوراس کے آداب سے پوری طرح باخبر ہونا چاہئے۔البتہ تبلیغ کے شرائط وآداب بہت زیادہ ہیں، جیسے: خوش اخلاقی ،خندہ پیشانی، وقار و بردباری اورحق وانصاف کا احترام وغیرہ لیکن ان میں سب سے اہم علم وعمل ہے۔ کیونکہ جو شخص علم کے بغیر تبلیغ کرتا ہے، چونکہ وہ حقیقت سے آگاہ نہیں ہے اس لئے باطل کی تبلیغ کرنے والوں کی طرح ،لوگوں کی حق تلفی کرنے اورانھیں گمراہ کرنے میں پروانہیں کرتا ہے اور جو اپنے علم پر عمل نہیں کرتا، حقیقت میں وہ جو کچھ کہتا ہے، اس کی اپنے عمل سے تردید کرتا ہے اور جس چیز کی اپنی زبان سے تعریف کرتا ہے، اس کی اپنے کردار سے، مذمت کرتا ہے جو شخص کسی چیز کی طرف دوسروں کو دعوت دیتا ہے،لیکن خوداس پرعمل نہیں کرتا،اس کی مثال اس شخص کی سی ہے، جوایک ہاتھ سے کسی چیز کو کھینچتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے اسے ڈھکیلتا ہے۔

خدائے متعال اپنے کلام میں فرماتا ہے:

کیاتم،لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہواوراپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟(۱)

ہمارے آٹھویں امام حضرت امام رضا علیہ السلام نے فرمایا ہے:

لوگوں کو اپنے گفتار وکردار سے دعوت دو، نہ صرف گفتار سے (۲)

....

۱۔(اتامرون النّاس بالبرّ وتنسون انفسکم ...)(بقرہ/٤٤)۔

۲۔بحارالانوار،ج،ص۳۰۸۔

اسلام میں تعلیم و تربیت

اسلام، جہل و نادانی کی سرزنش کرتے ہوئے علم و دانش کی مدح کرتا ہے، اوراپنے پیروؤں کو علم وفضیلت حاصل کرنے کی تشویق کرتا ہے، جبکہ دوسرے ادیان کی کتابیں آزادانہ غور وفکر اور مخالفوں کی باتوں کی تحقیق کرنے سے منع کرتی ہیں۔ اسلام کی آسمانی کتاب (قرآن مجید) حق کو قبول کرنے، کا حکم دیتی ہے خواہ وہ مخالف ہی کی طرف سے کیوں نہ ہو اور انسان کے ساتھ استدلال اور آزادانہ طریقہ سے گفتگو کرتی ہے اور لوگوں کو آسمان وزمین اور ان میں موجود ہر چیز کی پیدائش، انسان کی خلقت، اسلاف کی تاریخ اور کائنات کی فطری گردش کے بارے میں غور وفکر کرنے کی تاکید کرتی ہے، بلکہ اس کے علاوہ محسوسات کے دائرہ سے آگے بڑھ کر اور ماوراء طبیعت کے بارے میں غور وفکر کی تاکید کرتی ہے۔

اس موضوع کے بارے میں جو آیات اور روایات پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے جانشینوں سے ہم تک پہنچی ہیں، وہ بے شمار ہیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علم حاصل کرنے کو اس قدر اہمیت دیتے تھے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے(۱)۔

....

۱۔ طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم (بحار الانوار، ج۱،۱۷۲)۔

اسلامی تعلیمات کے دو اہم شاہکار

مختلف انسانی معاشروں میں موجود ہر روش میں کچھ اسرار پوشیدہ ہوتے ہیں، اگر وہ اسرار عام لوگوں پر ظاہر ہو جائیں، تو معاشرے کو چلانے والے حکام اور ان کی شہوانی خواہشات متاثر ہوتی ہیں، اس لئے وہ ہمیشہ کچھ حقائق کو لوگوں سے پوشیدہ رکھتے ہیں اور اس مطلب کا سبب یہ ہے کہ بہت سے مطالب اور ضوابط ان کے دماغ کی اپج ہوتے ہیں، چونکہ انھیں اپنی عقل اور معاشرے کی مصلحت کے خلاف پاتے ہیں، اس لئے ڈرتے ہیں کہ اگر یہ اسرار فاش ہو گئے تو ان پر اعتراضات کی بوچھار ہو جائے گی اور ان کے مفاد خطرہ میں پڑ جائیں گے۔

اسی وجہ سے عیسائیوں کے کلیسا اور دوسرے ادیان کے روحانی مراکز انسان کو آزادانہ غور وفکر کرنے کی اجازت نہیں دیتے، بلکہ دینی معارف اور مذہبی کتابوں کی توضیح وتفسیر کا حق صرف اپنے سے مخصوص کرتے ہیں اور لوگوں کو ان کی ہر بات چون و چرا اور بحث ومباحثہ کے بغیر قبول کرنا ہوتی ہے۔ اسی روش نے بہت سی دینی روشوں کو نقصان پہنچایا ہے اور عیسائیوں کی موجودہ روش اس بیان کی سچائی کی گواہ ہے۔ لیکن اسلام اپنی حقانیت پر اطمینان و اعتماد رکھتا ہے اور اپنی راہ میں کسی قسم کے مبہم اور تاریک گوشہ کو نہیں پاتا اس لئے دوسرے تمام مذہبی اور غیر مذہبی طریقوں کے برخلاف حسب ذیل دو مسائل پر زیادہ توجہ دیتا ہے:

۱۔ اسلام کسی بھی حقیقت کو پوشیدہ نہیں رکھتا اور نہ ہی اپنے پیروؤں کو اس بات کی اجازت

دیتاہے کہ کسی حقیقت کو چھپائیں، کیونکہ اس مقدس دین کے قوانین فطرت اور خلقت کے قانون کے مطابق مرتّب ہوئے ہیں اور حق وحقیقت کی رو سے اس کی کوئی چیز قابل تردید نہیں ہے۔

اسلام میں، حقائق کو چھپانا گناہان کبیرہ میں شمار ہوتا ہے اور خدائے متعال نے سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۵۹ میں حق کو چھپانے والوں پر لعنت کی ہے۔

۲۔ اسلام اپنے پیروؤں کو حکم دیتا ہے کہ حقائق اور معارف کے بارے میں آزادانہ طور پر غور و فکر کریں اور جہاں پر بھی معمولی سا ابہام نظر آئے، وہیں رک جائیں اور آگے نہ بڑھیں تاکہ ان کا روشن ایمان شک وشبہہ کی تاریکی سے ہمیشہ کے لئے محفوظ رہے اور اگر شک وشبہہ سے دوچار ہو جائیں تو نہایت انصاف اور حق پسندی سے اس کو رفع کرنے کی کوشش کریں اور آزادانہ طور پر ان کو حل کریں۔ خدائے متعال فرماتا ہے:

جس چیز کا تمھیں علم نہیں ہے اس کے پیچھے مت جاؤ۔(۱)

آزادی فکر اور حق پوشی

غور وخوض کے ذریعہ حقائق کو درک کر کے انھیں قبول کرنا انسان کے ذہن و دماغ کی گراں قیمت پیداوار ہے اور انسان کو حیوان پر امتیاز، فضیلت، شرف اور فخر بخشنے کا واحد سبب ہے، اور انسان دوستی وحقیقت پسندی کی فطرت کر دیا جائے، تقلیدی افکار کو تھوپ کر انسان کی آزادی فکر کو سلب کر لیا جائے یا حقائق کو چھپا کر اس کی عقل کو گمراہ کر دیا جائے۔ مختصر یہ کہ

اسابات کی اجازت نہیں دیتی کہ خدا پسند افکار کو ناکارہ بنادیا جائے۔لیکن اس حقیقت سے بھی غافل نہیں رہنا چاہئے کہ جہاں پر انسان کسی حقیقت کو سمجھنے کی طاقت نہیں رکھتا یا مد مقابل کی ہٹ دھرمی اور سخت رویہ کی وجہ سے ومنزلت کے لئے،

۱۔(ولاتقف مالیس لک بہ علم...)(اسرائ/۳٦)۔

انسان کے ذہن ودماغ کی گمراہی اور دوسرے مالی، جانی اورعزت کو پہنچنے والے خطرات سے محفوظ رکھنے کے لئے حقائق کی پردہ پوشی کو جائز سمجھتی ہے۔

ائمہ اطہار علیہم السلام نے اپنی بہت سی حدیثوں میں لوگوں کو بعض ایسے حقائق کے بارے میں غور وفکر کرنے سے منع کیا ہے جن کو سمجھنے کی انسان میں استعداد نہیں ہوتی۔خدائے متعال نے بھی اپنے کلام میں دوموقعوں پر تقیہ کے طور پر حق چھپانے کو جائز جانا ہے۔(۱)

....

۱۔سورہ آل عمران، آیت ۲۸ اورسورہ نحل آیت ۱۰٦۔

نتیجه

اسلام چند مواقع پر حق وحقیقت کے چھپانے کو بلامانع بلکہ ضروری سمجھتا ہے:

۱۔تقیہ کے موقع پر: یہ ایسی جگہ ہے کہ جہاں حق کے آگے بڑھنے کی کوئی امید نہیں ہو، بلکہ اس کے اظہار سے مال، جان اورعزت کو خطرہ لاحق ہوتا ہے۔

۲۔ایسے موقع پر جہاں حق کسی کے لئے قابل فہم نہ ہو بلکہ اس کا اظہار گمراہی کا سبب بنے یا خود حق کی بے حرمتی کا باعث ہو۔

۳۔ایسے مواقع پر جہاں آزادفکر، استعداد کے فقدان کی وجہ سے،حق کو برعکس دکھاتے اور گمراہی کا سبب بنے۔

سماجی زندگی میں اسلام کی خدمات

افراد کے منافع کا تحفظ اور رفع اختلاف

گزشتہ بحثوں سے واضح ہوا کہ دین مقدس اسلام،ایک مکمل اجتماعی طریقہ ہے،اور واضح ہے کہ ایک معاشرے کی مکمل سعادت اور سب سے بڑی آرزو یہ ہوتی ہے کہ اس کی ضروریات زندگی پوری ہوں اور زندگی کو لاحق کشمکش اور ان زیادتیوں کا حتی الامکان سدّ باب کیا جائے جن سے زندگی اور اس کے امن وامان کو خطرہ لاحق ہے تا کہ معاشرہ آرام اور تکامل کی طرف بڑھ سکے۔

البتہ ایک انسان کی فطری آرزو یہ ہوتی ہے کہ یہ اپنی زندگی میں حقیقت پسندی کے ساتھ ساتھ جسم وروح کے لحاظ سے سالم ہواور اس کے شایان شان روٹی، کپڑا،مکان اس کے پاس ہو۔اور وہ خاندان کو تشکیل دے کر اپنی جوانی اور بوڑھاپے کی آرزؤں کو پا سکے،اور امن وامان کے ماحول میں آرام کی زندگی گزارے،اس طرح انسانیت کی شاہراہ پر کسی مزاحمت

اور روکاوٹ کے بغیر اپنی تلاش وکوشش کو جاری رکھے اور تکامل تک پہنچ جائے۔

ایک انسانی معاشرہ بھی اپنے افراد کے لئے ،اس سے بڑھ کر آرزو نہیں رکھتا ہے اسلام نے اس انفرادی اور اجتماعی آرزو کو عملی جامہ پہنایا ہے، کیونکہ اس نے معاشرے کو ایک ایسا نہج دے دیا ہے کہ اگر اس کو حقیقت بینی کی روشنی میں قبول کیا جائے تو انسان کی زندگی کے مفادات محفوظ رہیں گے اور ان کے اختلافات دور ہو جائیں گے۔

اسلام کا طریقہ کار اور اس کی بنیاد

اسلام نے اپنی پہلی توجہ انسان کی حقیقت پسندی کے نہج پر مرکوز ہے، کیونکہ یہ مقدس نہج انسان کی تربیت کرنا چاہتا ہے اور ایسے بے زبان حیوان نہیں پالنا چاہتا کہ جس کا مقصد پیٹ بھرنا اور جنسی خواہشات کو پورا کرنا ہو۔انسان ایک ایسی زندہ مخلوق ہے ،جو جذبات اور ہمدردیوں کے علاوہ عقل اور حقیقت پسندی کی توانائی سے بھی مسلح ہے۔

انسان اپنی فطرت،یعنی اپنی خالص حقیقت پسندانہ فطرت کے مطابق ،درک کرتا ہے کہ وہ عالم ہستی کا ایک جزو ہے اور عالم ہستی کے دیگر اجزاء کے مانند ماورائے طبیعت ،یعنی ایک لامتناہی زندگی،قدرت اور علم سے وابستہ ہے،عقل بھی اسی (خدا) کی مخلوق ہے۔اسی لئے اسلام نے اپنی روش کو توحید کی بنیاد پر استوار کیا ہے اور جو شخص خدا پرست نہ ہو،وہ اسے انسان نہیں جانتا۔

یہاں پر توحید سے مراد خدا کی یکتائی پر عقیدہ رکھنا ہے، جو اپنے دین کے ذریعہ انسان کو

سعادت کی دعوت دیتا ہے اور ایک دن اسکے اعمال کا حساب لیکر اسے مناسب جزا دے گا۔

خدائے متعال اپنے کلام میں فرماتا ہے:

یہ سب (یعنی توحید سے بے خبر لوگ) جانوروں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی کچھ زیادہ گمراہ ہیں (۱)۔

توحید کے جو معنی بیان کئے گئے ہیں ان کے مطابق وہ اسلام کی پہلی اصل اور اس کا بنیادی ستون ہے۔

اسلام کا دوسرا استون پسندیدہ اخلاق ہے، جو توحید پر استوار ہے، کیونکہ اگر انسان توحید کے مطابق اخلاق نہ رکھتا ہو، تو اس کا مقدس ایمان محفوظ نہیں رہے گا۔

اور اسی طرح، جیسا کہ بیان کیا گیا، قوانین اور ضوابط خواہ کتنے ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہوں، ہرگز ایک ایسے معاشرے کو نہیں چلا سکتے جس میں اخلاقی انحطاط پایا جاتا ہو۔

اس لحاظ سے، اسلام میں عقیدۂ توحید کے مطابق اخلاقیات کا ایک طویل سلسلہ جیسے: انسان دوستی، رحم دلی، عفت اور عدالت کے جیسے دوسرے امور انسانی معاشرے کے لئے مرتب کئے گئے ہیں جو توحید کے عقیدہ کے نفاذ کے ضامن اور قوانین وضوابط کے محافظ ہیں۔

معاشرے کی سعادت میں مفید و مؤثر ہونے کی وجہ سے اخلاق کا دوسرا درجہ ہے، چوں کہ توحید پہلے درجہ پر ہے۔

توحید اور اخلاق کے اصولوں کو مستحکم اور استوار کرنے کے بعد اسلام نے قوانین کا ایک طویل سلسلہ وضع کیا ہے، جن کا تعلق اخلاق سے رابطہ ہے، یعنی مذکورہ قوانین کا سر چشمہ پسندیدہ

اخلاق ہے اور پسندیدہ اخلاق بھی اپنے قوانین کے ذریعہ مستحکم ہوتا ہے۔ اور یہی

....

۱۔(۔۔۔ان ہم الا کالانعام بل ہم اضل سبیلا)(فرقان ٤٤)

قوانین وضوابط ہیں جو معاشرے کے حیات بخش مفاد کا تحفظ کرتے ہیں اور لوگوں کے اختلافات کو دور کرتے ہیں۔

سماجی اختلافات

انسان کے اختلافات، جو اتحاد و اتفاق کے رشتہ کو تو ڑ دیتے ہیں اور اجتماعی نظام کو درہم برہم کر دیتے ہیں، دو قسم کے ہیں:

۱۔ وہ اختلافات جو اتفاقی طور پر دو افراد کی ذاتی چپقلش کے نتیجہ میں رونما ہوتے ہیں، جیسے دو افراد کے درمیان کسی موضوع پر ہونے والا جھگڑا اور ایسے اختلافات کو عدلیہ رفع کرتی ہے

۔

۲۔ وہ اختلافات جو طبیعی طور پر معاشرے کو دو مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیتے ہیں، اور اجتماعی انصاف کی طرف کسی قسم کی توجہ کئے بغیر، ایک گروہ کو دوسرے گروہ پر مسلط کیا جاتا ہے اور کمزور طبقہ کی سعی و کوشش کے ماحصل کو طاقتور گروہ کے نام مخصوص کیا جاتا ہے، جیسے: حاکم ومحکوم، دولت مند و فقیر، عورت و مرد اور ملازم و افسر کے طبقے ترقی یافتہ اور بے دین معاشروں میں اسی صورت میں زندگی کرتے ہیں اور ہمیشہ طاقتور لوگ کمزوروں اور اپنے

ماتحتوں کا استحصال کرتے ہیں۔

منافع کی حفاظت اوررفع اختلافات کے بارے میں اسلام کا عام نظریہ اسلام کلی طور پر، معاشرے کی سعادت، جو کہ لوگوں کے مفاد کی حفاظت اوران کے اختلافات کے سدِّ باب کی مرہون منت ہے، کودو چیزوں کے ذریعہ فراہم کرتا ہے:

۱۔طبقاتی امتیاز کوکلی طور پرلغوکر کے اس کی اہمیت کوختم کردیتا ہے،اس معنی میں کہ اسلامی معاشرے میں لوگ آپس میں بھائی بھائی ہیں اورکسی کو ہرگز یہ حق نہیں ہے کہ دولت یا اجتماعی طاقت کے بل بوتے پر دوسروں پر برتری جتائے اورانھیں حقیر وخوار سمجھے اوران سے فروتنی اختیار کرنے اورتسلیم ہونے کا تقاضا کرے، یا اپنے مخصوص عہدہ کی بنا پر خودکوبعض اجتماعی ذمہ داریوں سے مستثنیٰ قراردے یا کسی جرم کے مرتکب ہونے پرخودکومعاف اورسزا سے بری سمجھے۔قوانین وضوابط کے نفاذ میں معاشرے کے سرپرست کا حکم نافذ ہے اورسب کواس کے سامنے سرتسلیم خم کرنا چاہیئے اوراس کا احترام کرنا چاہیئے،لیکن اس کواپنے ذاتی اغراض و مقاصد میں یہ توقع نہیں رکھنی چاہیئے کہ دوسرے لوگ اس کے سامنے سرتسلیم خم کریں یا جو کچھ وہ انجام دے اس کے بارے میں انھیں اعتراض وتنقید کرنے کا حق نہیں ہے کیونکہ وہ معاشرے کا فرمانروا ہے،اس لئے اسے بعض عام اورسماجی ذمہ داریوں اورفرائض سے مستثنیٰ قراردیا جائے۔اسی طرح ایک دولت مند شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنی دولت کواپنے لئے فخر ومباہات کا سبب قراردیکر غریبوں،محتاجوں اوراپنے ماتحتوں کی سرکوبی کرے۔اس کے علاوہ معاشرے کے فرمانرواؤں کو یہ توقع نہیں کرنی چاہیئے کہ لوگ ان کی اطاعت کرتے

ہوئے ان کی ہر فضول بات کو معاشرہ کے پسماندہ اور ناداروں کے مسلم حق کے مقابلہ میں فوقیت دیں۔

نیز اسلام ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتا ہے کہ کسی بھی طبقہ میں ایک طاقتور لوگ ناحق کمزوروں پر مطلق حکمرانی کریں۔خدائے متعال اپنے کلام میں فرماتا ہے:

اسلام کے پیرو آپس میں بھائی اور مساوی ہیں۔(۱)

....

۱۔ (انّما المؤمنون اخوہ...)(حجرات/۱۰)۔

نیز فرماتا ہے:

خدا کا دین تمہاری (اہل کتاب اور مسلمان) آرزؤں اور خواہشوں کا تابع نہیں ہے، جو بھی برا کام انجام دے گا، اسے سزا ملے گی ۔(۱)

البتہ دین اسلام میں کچھ خصوصیات ، جیسے : دین کے پیشواؤں کی اطاعت اور والدین کا احترام، ہیں کہ اس میں مساوات نہیں ہے بلکہ صرف ایک طبقہ کے لئے دوسرے طبقہ کی نسبت کچھ فرائض ہیں، لیکن اس سلسلہ میں بھی جس کے حق میں یہ حکم ہے، وہ دوسروں پر برتری نہیں جتلا سکتا، یعنی وہ دوسروں کے مقابلہ میں اپنے مقام پر فخر نہیں کرسکتا ہے۔

جی ہاں، چونکہ انسان فطری طور پر امتیاز وفضیلت طلبی کی جبلّت رکھتا ہے، اسلام نے اس کی اس فطری جبلّت کو سرکوب کئے بغیر اس کے لئے ایک عمل معین فرمایا ہے اور وہ تقویٰ ہے۔

اسلام میں حقیقی قدر و قیمت پرہیزگاری کے لئے ہے اور چونکہ تقویٰ کا حساب چکانے والا

خدائے متعال ہے، اس لئے یہ امتیاز جس قدر زیادہ ہو جائے، کوئی رکاوٹ ایجاد نہیں کرتا، اس کے برعکس طبقاتی امتیاز معاشرے میں فساد پھیلانے کا سب سے بڑا سبب اور افراد کے آپس میں ایک دوسرے کے لئے رکاوٹ کا باعث بنتا ہے۔

اسلام کی نظر میں، ایک پرہیز گار فقیر، بے تقوی سرمایہ داروں کے ایک گروہ پر فضیلت رکھتا ہے اور ایک پرہیز گا عورت سیکڑوں لاابالی مردوں سے بہتر ہے۔

....

۱۔(لیس باما نیکم ولا امانی اهل الکتاب من یعمل سوء ایجز به۔۔۔)(نساء ۱۲۲)۔

خدائے متعال فرماتا ہے:

انسانو! ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور پھر تم میں شاخیں اور قبیلے قرار دیئے ہیں تاکہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچان سکو، بیشک تم میں سے خدا کے نزدیک زیادہ محترم وہی ہے جو زیادہ پرہیز گار رہے۔(۱)

نیز فرماتا ہے:

میں تم میں سے کسی بھی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا، چاہے وہ مرد ہو یا عورت، سب ایک نوع سے ہیں اور انسان ہیں۔(۲)

۲۔ چوں کہ تمام افراد، انسانیت اور معاشرے کے رکن ہونے کے لحاظ سے شریک ہیں اور تمام لوگوں کا کام اور ان کی کوشش محترم ہے، لہذا کچھ قوانین بنائے گئے ہیں تاکہ ان کی روشنی

میں ہر فرد کے مفادات کا تعین ہو سکے اور اجتماعی تجاوز اور کشمکش کا راستہ خود بخود بند ہو جائے۔ ابتدائی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ قوانین کچھ اس طرح بنائے گئے ہیں کہ معاشرے کے مختلف طبقاتی فاصلے بالکل ختم ہو جائیں، دوریوں کو نزدیکیوں میں بدل دیا جائے۔ ان بیانات کی روشنی میں مفادات کے تحفظ اور معاشرے کے اختلافات کو دور کرنے کے سلسلہ میں اسلام کا خاص طریقہ اجمالی طور پر واضح ہو جاتا ہے۔

....

۱۔(یاایّھا النّاس انّا خلقنکم من ذکرٍ و انثی وجعلنکم شعوباً وقبائل لتعارفوا انّ اکرمکم عنداللہ اتقٰکم۔۔۔)(حجرات ۱۳)۔

۲۔(۔۔۔انّی لااضیع عمل عاملٍ منکم من ذکرٍاو انثی بعضکم من بعض۔۔۔)(العمران ۱۹۵)۔

عداوت واختلاف سے اسلام کا مقابلہ

معاشرے کے مختلف طبقات میں طبیعی طور پر پیدا ہونے والے اختلافات، جیسے رعایا اور حاکم کا طبقہ، غلام و مالک اور کام لینے والے و مزدور کے درمیان اختلافات دو طریقوں سے وجود میں آتے ہیں:

۱۔ایک شخص کا دوسرے شخص کے حقوق پر تجاوز کرنے سے: مثلاً کام لینے والا، مزدور کی

مزدوری ادا نہ کرے، ایک مالک اپنے نوکر کی پوری اجرت نہ دے اس کے حق میں ظلم اور ناانصافی کرے یا حاکم اپنی رعایا میں سے کسی کے حق میں ظالمانہ حکم جاری کرے۔

اسلام نے اس مشکل کو حل کرنے کے لئے بہت سے قوانین مقرر کئے ہیں، کہ ان کو نافذ کرنے سے ہر ایک کے حقوق محفوظ رہ سکتے ہیں اور ہر شخص اپنے کھوئے ہوئے حقوق کو پا سکتا ہے۔ اسلام نے اس کام کے لئے معاشرے کی ہر فرد کو اجازت دی ہے کہ اگر کوئی شخص اس کے ساتھ ظلم کرے (چاہے وہ حاکم وقت ہی کیوں نہ ہو) تو قاضی کے پاس شکایت کرنی چاہئے۔

امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام کی خلافت کے زمانہ میں ایک مسلمان کا حضرت کے ساتھ کچھ اختلاف ہو گیا، اس نے قاضی کے پاس جا کر استغاثہ کیا۔ حضرت ایک عام شخص کی طرح اس قاضی (جسے خود آپ نے منصوب فرمایا تھا) کے پاس حاضر ہوئے اور فیصلہ ہوا۔ تعجب کا مقام یہ ہے کہ حضرت نے قاضی سے فرمایا کہ شکایت کرنے والے اور میرے درمیان برتاؤ میں کسی قسم کا فرق نہ کرے۔

۲۔ ایک طاقتور شخص کا کمزور اور اپنے ماتحت کے اوپر دھونس جمانا اور اس کے ساتھ زیادتی کرنا، جیسے ایک کام لینے والا اپنے مزدوروں کو ذلیل وخوار سمجھے، کوئی مالک اپنے سامنے کھڑا رکھے، اور اسے اپنے سامنے جھک کر تعظیم کرنے پر مجبور کرے یا حاکم اپنی رعایا سے اعتراض اور استغاثہ کا حق چھین لے، کیونکہ اس قسم کے برتاؤ میں غیر خدا کی پرستش کا پہلو پایا جاتا ہے، اس لئے اسلام نے ان چیزوں سے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے۔ اسلام میں کوئی بھی شخص اپنے

ماتحت سے انجام فریضہ کے علاوہ کسی قسم کی توقع نہیں رکھ سکتا ہے اوران پر اپنی بزرگی وعظمت کا مظاہرہ نہیں کرسکتا ہے۔ اسلام میں بہت سے ایسے اخلاقی احکام موجود ہیں جو لوگوں کو سچائی، انصاف اورحسن اخلاق کی دعوت دیتے ہیں اورعہد و پیمان کی رعایت کرتے ہیں، نیکی اور خدمت کرنے والوں کی تشویق کرتے ہیں اور، بدکرداروں، نااہلوں اور برے لوگوں کو سزادیتے ہیں۔

یہ ایسے پسندیدہ اخلاق ہیں کہ اگر معاشرے میں یہ نہ ہوں تو معاشرہ بدبختی سے دوچار ہوجائے گا اور دنیاوآخرت میں ناکامی و بدبختی میں مبتلا ہوگا۔

ممکن ہے کہ کسی کو ان قوانین سے بے اعتنائی اوران پر عمل نہ کرنا اس کے لئے بظاہر معمولی فائدہ ہو، لیکن دوسری طرف یہ ایک ناپاک اورخطرناک ماحول کو پیدا کرتا ہے کہ جو اس کو اس معمولی فائدہ سے محروم کرنے کے علاوہ اوربھی بہت سے فائدوں سے اس کو محروم کرتا ہے اور اس شخص کی مثال اس آدمی کی سی ہے جو ایک عمارت کے سنگ بنیاد کو باہر نکال کر اس پر ایک نئی عمارت تعمیر کرتا ہے اوراس طرح اس عمارت کی ویرانی کا سبب بنتا ہے۔

رفع اختلاف کے لئے ایک عام وسیلہ

اسلام نے اپنے پیروؤں کو حکم دیا ہے کہ وہ معاشرے کے فائدے کے بارے میں سوچیں اورخودخواہی سے پرہیز کرکے اپنے ذاتی مفاد کو اسلامی معاشرے کے فائدہ میں دیکھیں اور معاشرے کے نقصان کو اپنا نقصان سمجھیں۔

ایک مسلمان کو پہلے حقیقی مسلمان ہونا چاہئے، اس کے بعد وہ ایک تاجر، کسان، صنعت گر یا مزدور بنے اور جو شخص خاندان کو تشکیل دینا چاہتا ہے، اسے پہلے مسلمان ہونا چاہئے اس کے بعد اپنے فیصلہ پر عمل کرے۔ مختصر یہ کہ وہ جو بھی کام انجام دینا چاہے اور جو بھی مقام اور عہدہ سنبھالنا چاہے، اس کے لئے صحیح دین وایمان کی ضرورت ہے۔

ایسا شخص ہر کام اور ہر فیصلہ کے سلسلہ میں سب سے پہلے اسلام و مسلمین کی مصلحتوں اور فائدوں کو مد نظر رکھتا ہے، اس کے بعد اپنی ذاتی مصلحت کو مد نظر رکھتا ہے اور وہ ہرگز کوئی ایسا کام انجام نہیں دیتا جس میں اسلام و مسلمین کے لئے نقصان ہو اگر چہ اس کام میں اس کا ذاتی فائدہ بھی نہ ہو۔

البتہ معلوم ہے اگر کسی معاشرے میں اس قسم کی فکر پیدا ہو جائے تو اس معاشرے کے افراد میں کبھی اختلاف پیدا نہیں ہوگا۔ خدائے متعال فرماتا ہے:

(واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا۔۔۔)

(آل عمران ۱۰۳)

اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہو اور آپس میں تفرقہ نہ پیدا کرو

نیز فرماتا ہے:

(و انّ ھذا صراطی مستقیماً فاتّبعوہ ولاتتّبعوا السّبل فتفرق بکم عن سبیلہ۔۔۔) (انعام ۱۵۳)

اور یہ ہمارا سیدھا راستہ ہے اس کا اتباع کرو اور دوسرے راستوں کے پیچھے نہ جاؤ کہ راہ

خدا سے الگ ہو جاؤ گے....

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

مسلمانوں کو آپس میں بھائی بھائی ہونا چاہئے تا کہ اغیار کے مقابلہ میں ایک طاقت کی صورت میں آئیں۔(۱)

....

۱۔سفینۃ البحار، ج۱، ص۱۹۔

نماز، روزہ اور حج یا رفع اختلافات کا وسیلہ

اسلام کے فخر و مباہات میں سے ایک مسئلہ عبادت ہے اور وہ یہ ہے کہ دوسرے ادیان کے لوگ، جیسے یہود و نصاری اپنے دینی احکام کے مطابق عمومی عبادت خانوں کے علاوہ عبادت سے محروم ہیں اور ان کے مذہبی قانون کی نظر میں وہ کلیسا اور اپنے عبادت خانوں کے علاوہ کہیں عبادت انجام نہیں دے سکتے اور نماز نہیں پڑھ سکتے ہیں۔لیکن اسلام میں اِن پابندیوں کو ختم کر دیا گیا ہے اور ہر مسلمان پر واجب ہے کہ اپنی عبادت کو جہاں چاہے انجام دے، مسجد میں ہو یا کہیں اور، مسلمان معاشرے میں ہو یا کفر کے معاشرے میں، لوگوں کے درمیان ہو یا تنہا، صحت مندی کی حالت میں ہو یا بیماری کی حالت میں۔

۱۔والمسلمون تتکافأ دماؤھم وھم ید علی من سواھم ...(اصول کافی، ج۱، ص۴۰۳)۔

بہر حال اپنی عبادت کوانجام دینا چاہئے ،اور یہ بذات خود اسلام کی کامیابی کے اسرار میں سے ایک ہے۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

میرے لئے تمام روئے زمین عبادت خانہ اور پرستش گاہ ہے۔(۱)

اسی لئے شریعت اسلام نے نماز، روزہ اور حج کو پہلے مرحلہ میں انفرادی قرار دیا ہے، اس معنی میں کہ ہر فرد سے اس کی انجام دہی کا مطالبہ کیا ہے اور جماعت میں شریک ہونے کو لازم نہیں کیا ہے۔لیکن دوسرے مرحلہ میں ان عبادتوں کے اجتماعی فوائد کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے اور انھیں اجتماعی اہمیت دی ہے مثلا انسان اس کے ذریعہ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں اپنی بندگی ونیازمندی کا اظہار کرتا ہے لہذا جماعت میں حاضر ہونا مستحب قرار دیا ہے۔

اسی طرح روزہ جو انفرادی ریاضت کے لئے قرار دیا گیا ہے اور مسلمانوں کو سال میں ایک مہینہ دن کے میں کھانے پینے اور جنسی آمیزش سے پرہیز کرنا چاہئے اور اس کے ذریعہ اپنے اندر پرہیز گاری اور تقویٰ پیدا کرے، اس کے باوجود اس کے کہ یہ ایک انفرادی فریضہ ہے اور اس میں اجتماعی پہلو نہیں پایا جاتا، لیکن شوال کی پہلی تاریخ کو ماہ مبارک رمضان میں فریضہ کے انجام کے شکرانہ میں مسلمان عید منائیں اور ان پر فرض ہے کہ نماز عید فطر کو باجماعت پڑھیں۔

اسی طرح حج میں جس کے ذریعہ ،خدا کی دعوت پر لبیک اور مادی میلانات سے دوری اور پروردگار کی ذات کی طرف توجہ کرنا ہوتا ہے، باوجودیکہ یہ ایک انفرادی عبادت ہے، لیکن چونکہ عبادت کی ایک خاص ومعین جگہ ہے، لہذا دنیا کے مسلمان مجبورا ایک جگہ پر جمع ہو

تے ہیں اورایک دوسرے کے حالات سے آگاہ ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ ذی الحجہ کی دسویں تاریخ کو۔جس دن حج کے بعض اعمال انجام دیئے جاتے ہیں۔اسلامی عید قرار دیا گیا ہے اور مسلمانوں پر واجب ہے کہ ایک جگہ جمع ہوکر نماز عید پڑھیں۔

اسلام میں جو یہ اجتماعات مقرر ہوئے ہیں ، یہ لوگوں کے طبقاتی اختلافات کو دور کرنے کا بہترین وسیلہ ہے، کیونکہ طبقاتی اختلافات کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دینے کے لئے موثر ترین طریقہ ایک دوسرے کے درمیان موجود غلط فہمی کو دور کرنا ہے اور یہ خاصیت اجتماعی عبادت میں مکمل طور پر موجود ہے کیونکہ جو خدا کی عبادت کو اخلاص کے ساتھ انجام دیتا ہے،اس کا خدا کے سوا کسی اور کے ساتھ سروکار نہیں ہوتا ہے اور خدا کی رحمتوں کے دروازے ہر ایک کے لئے کھلے ہیں اور اس کی ابدی نعمتوں کا خزانہ کبھی ختم ہونیوالا نہیں ہے اور اس کی ذات اقدس رکاوٹ کے بغیر ہر ایک کو قبول کرتی ہے،جس کے نتیجہ میں اجتماعی عبادت کے دوران جو انس ،اورالفت ومحبت لوگوں میں پیدا ہوتی ہے وہ اختلافات اور کدورتوں کو دور کرنے کا بہترین وسیلہ ہے۔

چنانچہ پہلے بھی اشارہ کیا جاچکا ہے، کہ ہم سب جانتے ہیں کہ دین مقدس اسلام کے معارف کلی طور پر تین حصوں میں تقسیم ہوئے ہیں: اصول دین،اخلاق اور فقہی فروع۔

واضح ہے کہ اس کے علاوہ اصول دین ،یعنی دین کی بنیاد، تین اصولوں پر مشتمل ہے کہ انسان ان میں سے ایک کے نہ ہونے پر دین سے خارج ہوجاتا ہے:

۱۔توحید،یعنی کائنات کے پروردگار کی یکتائی کا اعتقاد۔

۲۔خدائے متعال کے انبیاء علیہم السلام پر عقیدہ رکھنا ہے جن کے آخری پیغمبر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

۳۔معاد پر ایمان، یعنی یہ عقیدہ رکھنا کہ خدائے متعال موت کے بعد سب کو زندہ کرے گا اور ان کے اعمال کا حساب وکتاب لیا جائے گا، نیک لوگوں کو ان کی نیکی کی جزا دی جائے گی اور برے لوگوں کو انکی برائی کی سزا دی جائے گی۔

مذکورہ تین اصولوں میں دو اصولوں کا اور اضافہ کیا جاتا ہے، جو شیعہ عقائد کا حصہ اور مسلمات میں سے ہیں، اور انسان ان میں سے کسی ایک پر عقیدہ نہ رکھنے کی وجہ سے شیعہ مذہب سے خارج ہوجاتا ہے، اگر چہ اسلام کے دائرہ سے خارج نہیں ہوتا، یہ دو اصول حسب ذیل ہیں:

۱۔عدل

۲۔امامت

توحید

۲۔نبوت

۳۔معاد

٤۔عدل

٥۔امامت

۱۔توحید

اثبات صانع

انسان جب حقیقت بینی کی فطرت سے کام لیتا ہے تو عالم ھستی کے ہر گوشہ و کنار پر نظر ڈالنے سے اسے پروردگار عالم اور خالق کائنات کے وجود کی بہت سی دلیلیں نظر آتی ہیں، کیونکہ انسان اپنی حقیقت پسندانہ فطرت سے محسوس کرتا ہے کہ مخلوقات میں سے ہر ایک، وجود کی نعمت سے مالا مال ہے اور ان میں سے ہر ایک اپنے وجود میں، قہری طور پر ایک معین راستہ کو طے کر رہا ہے اور ایک مدت کے بعد وہ اپنی جگہ کو دوسرے کے لئے چھوڑتا ہے، اس نے ہرگز اپنے اس وجود کو خود ہی اپنے لئے فراہم نہیں کیا ہے اور جس منظم راہ پر گامزن ہے، اسے خود ہی اپنے لئے نہیں بنایا ہے اور اپنے سفر کے راستہ کی ایجاد اور اس کے نظم و نسق میں کسی قسم کی مداخلت نہیں رکھتا، کیونکہ انسان نے، انسانیت اور انسانی خصوصیات کو اپنے لئے خود اختیار

نہیں کیا ہے، بلکہ انسان کو پیدا کیا گیا ہے اور انسانی خصوصیات اسے عطا کی گئی ہیں۔
اسی طرح حقیقت پسندانہ انسانی فطرت اس بات کو قبول نہیں کرتی ہے کہ یہ سب اشیاء خود بخود وجود میں آئی ہوں گی اور کائنات میں موجود نظام یوں ہی کسی حساب و کتاب کے بغیر وجود میں آگئے ہوں گے، جبکہ انسان کا ضمیر اس قسم کے اتفاق کو منظم طور پر ایک دوسرے کے اوپر چنی گئی چند اینٹوں کے بارے میں قبول نہیں کرتا۔ یہاں پر انسان کی حقیقت پسندانہ فطرت اعلان کرتی ہے کہ عالم ھستی کی ضرور کوئی پناہ گاہ ہے، جو ھستی کا سرچشمہ، اور کائنات کو پیدا کرنے اور اسے باقی رکھنے کے لئے اس کی حفاظت کرنے والا ہے، اور وہ لامحدود وجود اور علم وقدرت کا سرچشمہ، خدائے متعال کی ذات ہے، اور اس کائنات کے وجود کا سرچشمہ خدا کی ذات ہے، چنانچہ خدائے متعال فرماتا ہے:
(الّذی اعطی کل شیء خلقه ثم هدی) (طه۵۰)
(خالق کائنات) وہ ہے جس نے ہر شے کو اس کی مناسب خلقت عطا کی ہے اور پھر ہدایت بھی دی ہے۔
اسی فطرت کی وجہ سے، جہاں تک تاریخ بتاتی ہے، انسانی معاشرہ کی اکثریت، کائنات کیلئے ایک خدا کے قائل رہے ہیں اور اسلام کے علاوہ دوسرے تمام ادیان جیسے نصرانیت، یہودیت، مجوسیت اور بدھ مت اس سلسلہ میں ہم عقیدہ ہیں اور جو پروردگار کے وجود کے مخالف ہیں، ان کے پاس اسکے وجود کے انکار کے سلسلہ میں ہرگز کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ حقیقت میں وہ کہتے ہیں کہ: ہم پروردگار کے وجود کی کوئی دلیل نہیں رکھتے یہ نہیں کہتے ہیں کہ

ہمارے پاس اس کے عدم وجود کی کوئی دلیل ہے۔

مادہ پرست انسان کہتا ہے: میں نہیں جانتا یہ نہیں کہتا ہے نہیں ہے دوسرے الفاظ میں مادہ پرست انسان مذبزب ہے نہ منکر۔

خدائے متعال اپنے کلام میں اس مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

(وقالوا ما ہی الاّ حیاتنا الدّ نیا نموت ونحیا وما یہلکنا الاّ الدّھر وما لہم بذلک من علم ان ہم الا یظنون)

(جاثیہ ٢٤)

اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ صرف زندگانی دنیا ہے اس میں مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور زمانہ ہی ہم کو ہلاک کر دیتا ہے اور انھیں اس بات کا کوئی علم نہیں ہے کہ یہ صرف ان کے خیالات ہیں اور بس۔

ابتدائے خلقت کی بحث

انسان اپنی خداداد فطرت سے ہر مظہر وحادثہ کا مشاہدہ کرنے کے بعد اس کے وجود میں آنے کی علت تلاش کرتا ہے اور ہرگز احتمال نہیں دیتا ہے کہ کوئی چیز خود بخود اور کسی سبب کے بغیر وجود میں آئی ہوگی۔ اگر کسی ڈرائیور کی گاڑی خراب ہوجاتی ہے تو وہ گاڑی سے اتر کر گاڑی میں اس جگہ کو دیکھتا ہے جہاں خراب ہونے کا احتمال ہوتا ہے تا کہ گاڑی کے رکنے کا سبب معلوم کر سکے اور اسے ہرگز یقین نہیں ہوتا ہے کہ گاڑی خرابی کے بغیر رک گئی، اور گاڑی کو پھر

چلانے کے لئے اس کے تمام وسائل سے استفادہ کرتا ہے اور ہرگز اس اتفاق کا منتظر نہیں رہتا ہے کہ گاڑی خودبخود چلے گی۔

انسان کو اگر بھوک لگ جائے تو وہ روٹی کی فکر میں پڑتا ہے اور جب اسے پیاس لگتی ہے تو پانی تلاش کرتا ہے اور اگر سردی محسوس کرتا ہے تو لباس اور آگ ڈھونڈتا ہے۔ وہ کبھی کسی اتفاق کے ذریعہ ان ضرورتوں کو دور کرنے کا انتظار نہیں کرتا اور اس خوش فہمی میں آرام سے نہیں بیٹھتا۔

جو شخص کسی عمارت کو تعمیر کرنا چاہتا ہے وہ لامحالہ اس کے ساز وسامان، معمار اور مزدور وغیرہ کا انتظام کرتا ہے اور وہ بالکل یہ امید نہیں رکھتا کہ اس کی آرزو خودبخود پوری ہو جائے۔ انسان جب سے ہے اسی وقت زمین پر پہاڑ، جنگل، وسیع دریا اور سمندر موجود ہیں۔ اور اس وقت سے سورج، چاند اور چمکتے ہوئے ستاروں کو آسمان پر منظم اور مسلسل متحرک دیکھ رہا ہے۔ اس کے باوجود دنیا کے سائنسدان اپنی انتھک علمی کوشش اور تگ دو سے مخلوقات اور حیرت انگیز مظاہر کے وجود میں آنے کے اسباب وعلل کے بارے میں بحث کر رہے ہیں اور وہ ہرگز یہ نہیں کہتے کہ جب سے ہم ہیں اسی وقت سے ان کو اسی طرح دیکھ رہے ہیں، لہذا یہ خودبخود پیدا ہوئے ہیں۔

اسی جستجو کی فطرت اور اسباب وعلل کی بحث وتحقیق نے انسان کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ عالم ہستی اور اس کے حیرت انگیز نظام کی پیدائش کے بارے میں کھوج کرے کہ کیا یہ وسیع کائنات ،جس کے اجزا ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور حقیقت میں ایک عظیم مظہر ہے، خودبخود وجود

میں آیا ہے یا اس کا سرچشمہ کہیں اور ہے؟اور کیا یہ حیرت انگیز نظام، جو ثابت اور بلا استثناء قوانین کے مطابق کائنات کے گوشہ وکنار میں جاری ہے اور ہر چیز کو اس کے خاص مقصد کی طرف راہنمائی کرتا ہے، ایک بے انتہا قدرت اور علم کی طرف سے جاری اور اس کا نظام چلایا جاتا ہے، یا کسی حادثہ اور اتفاق کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے؟

معرفت خدا اور ملتیں

ہم جانتے ہیں کہ عہد حاضر میں روئے زمین پر دین داروں کی اکثریت ہے، اور وہ خالق کائنات پر اعتقاد رکھتے ہیں اور اس کی پرستش کرتے ہیں۔کل کے انسان کی حالت بھی آج کے انسان کی سی تھی، جہاں تک تاریخ بتاتی ہے، وہ یہ کہ انسانوں کی اکثریت دین دار تھی اور وہ کائنات کے لئے ایک خدا کے قائل تھے۔

اگر چہ خداشناس اور دین دار معاشروں میں، فکری اختلاف بھی تھا اور ہر قوم چشمہ تخلیق کو مخصوص اوصاف سے متصف کرتی تھی، لیکن اصل مقصد میں وہ اتفاق نظر رکھتے تھے، حتی قدیم ترین تمدن کے آثار جنھیں انسان نے کشف کیا ہے، ان میں دین اور خداشناسی کی علامتیں پائی جاتی ہیں اور ایسی علامتیں بھی ملی ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ماورائے طبیعت پر بھی اعتقاد وایمان رکھتے تھے۔حتی جدید براعظموں جیسے امریکہ اور آسٹریلیا اور قدیمی براعظموں کے دور دراز جزائر جو آخری صدیوں میں کشف ہوئے ہیں، ان کے اصل باشندے بھی خدا کے معتقد تھے، اور وہ تصور کائنات کے سلسلہ میں اختلافات نظر کے باوجود

کائنات کا ایک سرچشمہ تسلیم کرتے تھے اگر چہ قدیم دنیا سے ان کے رابطہ کی تاریخ معلوم نہ ہو سکی۔

اس بات پر غور کرنا کہ خدا کا اعتقاد انسانوں کے درمیان ہمیشہ سے موجود تھا، اس مطلب کو واضح کرتا ہے کہ خدا کو پہچاننا انسان کی فطرت ہے اور انسان اپنی خداداد فطرت سے، کائنات کی تخلیق کے لئے ایک خدا کو ثابت کرتا ہے۔خدائے متعال نے انسان کی اس فطری خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

(ولئن سألتهم من خلقهم ليقولن الله...) (زخرف۸۷)

اگر ان سے پوچھو گے کہ انھیں کس نے پیدا کیا ہے؟ تو یقینا کہیں گے خدا نے

نیز فرماتا ہے:

(ولئن سألتهم من خلق السموات والارض ليقولن الله...)

(لقمان ۲۵)

اگر ان سے پوچھو گے کہ انھیں کس نے پیدا کیا ہے؟ تو یقینا کہیں گے: خدا

انسان کی زندگی میں تجسس کا اثر

اگر انسان نے خالق کائنات اور اس کے نظام کے پیدا کرنے والے۔جو کہ اس کی فطرت کا اقتضاء ہے۔کے بارے میں مثبت جواب دیا، تو اس نے کائنات اور اس کے حیرت انگیز نظام کی پیدائش کے لافانی مبداء کو ثابت کیا اور اس نے تمام چیزوں کو خدا کے محکم ارادہ سے

جواسکی لامحدود قدرت وعلم پر مبنی ہے۔اور نتیجہ میں وہ پورے وجود میں ایک قسم کے اطمینان واعتماد کو محسوس کرتا ہے۔اور وہ اپنی زندگی میں رونما ہونے والی ہر قسم کی مشکلات اور سختیوں سے دو چار ہونے پر ہرگز نا امید نہیں ہوتا ہے بلکہ ان سے نپٹنے کے لئے ہر قسم کی تدبیر سے کام لیتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ کوئی بھی علت وسبب۔خواہ وہ کتنا قوی ہو۔اس کی باگ ڈور خدا کے ہاتھ میں ہے اور ہر چیز اس کے زیر فرمان ہے۔

ایسا شخص کبھی اسباب وعلل کے سامنے سراپا تسلیم نہیں ہوتا اور جب کبھی دنیا کے حالات اس کے مطابق ہوتے ہیں تو غرور وتکبر سے اس کا دماغ خراب نہیں ہوتا اور وہ اپنی اور کائنات کی حقیقی حیثیت کو فراموش نہیں کرتا، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ظاہری اسباب وعلل خود مختار نہیں ہیں بلکہ ان کا تعلق حکم خدا سے ہے۔آخر کار ایسا انسان یہ جان لیتا ہے کہ عالم ہستی میں خدائے متعال کے علاوہ کسی اور کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرنا چاہئے اور خدا کے فرمان کے علاوہ کسی بھی فرمان کے سامنے مطلق طور پر تسلیم نہیں ہونا چاہئے۔لیکن جس نے مذکورہ سوالات کا منفی جواب دیا، وہ اس امید اور حقیقت پسندی عالی منشی اور فطری شجاعت کا حامل نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ جن ملتوں میں مادیت کا غلبہ ہے وہاں روز بروز خودکشی کے واقعات زیادہ رونما ہوتے ہیں، اور جن کا اعتقاد حسی اسباب وعلل تک محدود ہو وہ چھوٹے سے چھوٹے نامناسب حالات کے رونما ہونے پر اپنی سعادت وکامیابی سے ناامید ہو کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر دیتے ہیں، لیکن جو لوگ خدا شناسی کی نعمت سے مالا مال ہیں، وہ موت کے دہانے پر بھی ناامید نہیں ہوتے، کیونکہ وہ خدائے قادر وبینا پر ایمان رکھتے ہیں، اس لئے

مطمئن وامیدوار ہوتے ہیں۔

حضرت امام حسین علیہ السلام اپنی زندگی کے آخری لمحات میں جبکہ چاروں طرف سے دشمن کے تیر وتلوار کا نشانہ بنے ہوئے تھے، فرماتے ہیں:

تنہا جو چیز اس ناگوار مصیبت کو میرے لئے آسان بنا رہی ہے، وہ یہ ہے کہ میں خدائے متعال کو مستقل اپنے اعمال پر ناظر دیکھتا ہوں۔

توحید کے بارے میں قرآن مجید کا اسلوب

اگر انسان پاک طبیعت اور مطمئن دل سے، کائنات پر نظر ڈالے تو اس کے ہر گوشہ و کنار میں وجود خدا کے آثار و دلائل کا مشاہدہ کرے گا اور اس حقیقت کے ثبوت میں ہر در و دیوار سے گواہی سن لے گا۔ اس دنیا میں جو چیز بھی انسان کے سامنے آتی ہے وہ خدا کی پیدا کی ہوئی اور مظہر ہے، یا کوئی خاصیت خدا نے اس میں پیدا کر دی ہے، یا ایک ایسا نظام ہے جو خدا کے حکم سے ہر چیز میں جاری ہے اور انسان بھی انہی میں سے ایک ہے اور اس کا پورا وجود اس حقیقت کی گواہی دیتا ہے، کیونکہ نہ اس کا اپنا وجود اپنے آپ سے ہے اور نہ ہی اس سے ظاہر ہونے والی خاصیتیں اس کے اختیار میں ہیں اور نہ اس نے اپنی زندگی کی اس نظام کو خود بنایا ہے جو اس کی پیدائش سے ابھی تک جاری ہے اور وہ یہ فرض کر سکتا ہے کہ اس کائنات کا نظام اتفاقی طور پر وجود میں آ گیا ہے، اور نہ ہی وہ اپنے وجود اور اپنے وجود کے نظام کو اس ماحول کی طرف نسبت دے سکتا ہے جس میں وہ پیدا ہوا ہے، کیونکہ مذکورہ وجود اور یہ نظام خود اس

ماحول کی پیداوار نہیں ہے اور نہ وہ اتفاقاً وجود میں آیا ہے۔

یہاں پر انسان کو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ عالم ھستی کے لئے ایک سر چشمہ تسلیم کرے جو اشیا کو خلق کرنے والا اور ان کی پرورش کرنے والا ہے۔ وہی ہر مخلوق کو پیدا کرتا ہے اور اس کے بعد بقا اور ایک خاص نظام کی شاہراہ پر اس کے مخصوص کمال کی طرف ہدایت کرتا ہے ، چونکہ انسان عالم ھستی میں اشیاء کو آپس میں ایک دوسرے سے مربوط اور ایک خاص نظام سے منسلک پاتا ہے ،اس لئے مجبورا فیصلہ کرتا ہے کہ خلقت کا سر چشمہ اور اس کے نظام کو چلانے والا ایک ہی ہے۔

انسان پر یہ حقیقت معمولی توجہ سے واضح ہوجاتی ہے، اور اس میں کسی قسم کا ابہام نہیں پایا جاتا۔سوائے اس کے کہ انسان کبھی زندگی کی کشمکشوں میں ایسا گرفتار ہوتا ہے کہ اپنی عقل وشعور کی تمام توانائیوں کو حیاتی مبارزوں کی راہ میں استعمال کرتا ہے اور اپنے تمام وقت کو زندگی کی دوڑ دھوپ میں صرف کرتا ہے، اور اس قسم کی چیزوں کے بارے میں غور کرنے کی تھوڑی سی بھی فرصت نہیں نکال پاتا اور نتیجہ میں اس حقیقت سے غافل رہتا ہے، یا یہ کہ طبیعت کے دل فریب مظاہر سے متاثر ہوکر ہوس رانیوں اور عیاشیوں میں سرگرم ہوتا ہے۔ چونکہ ان حقائق کی پابندی انسان کو بہت سی مادی لاابالیوں سے روکتی ہے،اس لئے وہ فطری طور پر ان حقائق کی تحقیق کے سلسلہ میں پہلوتہی کرتا ہے اور اس ذمہ داری کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا۔

اس لئے قرآن مجید میں مخلوقات کی پیدائش اور ان میں جاری نظام کے بارے میں گوناگون

طریقوں سے بہت زیادہ توجہ دلائی گئی ہے اور برہان و دلائل پیش کئے گئے ہیں، کیونکہ اکثر لوگ خاص کر وہ لوگ جو فطرت کے دل فریب مظاہر کے شیفتہ ہو چکے ہیں اور وہ اپنی زندگی کی سعادت و کامیابی کو عیاشیوں و خوش گزرانیوں میں پاتے ہیں، اور مادیات و محسوسات سے انس و محبت کی وجہ سے فلسفی فکر اور نظریات کی عقلی تحقیق سے محروم ہیں۔

لیکن انسان ہر حالت میں عالم ھستی کا ایک جزو ہے اور کائنات کے دیگر اجزاء اور اس میں جاری جزئی اور کلی نظاموں سے ایک لحہ بھی بے نیاز نہیں ہے، اور ہر لحہ اپنے ذہن کو عالم ھستی اور اس میں جاری نظام کی طرف متوجہ کرسکتا ہے، اور کائنات کے خالق کے وجود کو پاسکتا ہے۔خدائے متعال اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے:

(اِنَّ فی السمٰوات و الارض لَاٰیٰتٍ للمومنین، و فی خلقکم و ما یبثُّ من دآبّة آیت لقوم یوقنون و اختلاف الّیل و النّھار و ما انزل اللہ من السمآء من رزق فاحیا به الارض بعد موتھا و تصریف الریح ء اٰیٰت لقوم یعقلون) (جاثیہ۳۔۵)

بیشک آسمانوں اور زمینوں میں صاحبان ایمان کے لئے بہت سی نشانیاں پائی جاتی ہیں۔اور خود تمہاری خلقت میں بھی اور جن جانوروں کو وہ پھیلاتا رہتا ہے ان میں بھی صاحبان یقین کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔اور رات دن کی رفت و آمد ہیں اور جو رزق خدا نے آسمان سے نازل کیا ہے، جس کے ذریعہ سے مردہ زمینوں کو زندہ بنایا ہے اور ہواؤں کے چلنے میں اس قوم کے لئے نشانیاں پائی جاتی ہیں جو عقل رکھنے والی ہے۔

مثال اور وضاحت

قرآن مجید میں آیتیں ہیں،جن میں انسان کو چاند،ستاروں،زمین ،آسمان ،سورج ،پہاڑوں، دریاؤں،نباتات، حیوانات اور خود انسان کی خلقت کے بارے میں غور وفکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے، اور ان میں سے ہر ایک کا جو حیرت انگیز نظام ہے اس کی یاد دہانی کرائی گئی ہے۔

حقیقت میں کائنات کا نظام ، جو کائنات کی گونا گون سرگرمیوں کو خلقت کے مقاصد اور کائنات کے اہداف کی طرف بڑھاتا ہے، وہ نہایت ہی حیرت انگیز اور تعجب خیز ہے۔ گیہوں کا ایک دانہ یا بادام کی ایک گٹھلی زمین سے اگنے کے بعد ایک پودے یا میوہ دار درخت میں تبدیل ہوجاتا ہے۔اور یہ دانہ یا گٹھلی مٹی میں قرار پانے کے بعد شگافتہ ہو کراس کی سبز نوک باہر نکلتی ہے اور اس میں جاتی ہے، جب یہ پودا اپنے مقصد کی منزل تک پہنچتا ہے تو اس دوران مختلف اور عظیم نظام سرگرم ہوتے ہیں کہ جن کی عظمت و وسعت کا مشاہدہ کرکے عقل متحیر رہ جاتی ہے۔

ستارے،آسمان اور چمکتا ہوا سورج اور درخشان اور زمین ہر ایک اپنی وضعی وانتقالی گردشوں اور اپنے اندر پوشیدہ توانائیوں سے اور اسی طرح اس دانہ یا گٹھلی میں قرار دی گئی ، پر اسرار طاقتیں،اور سال کے موسم،اور ان کے حالات،ابر وہوا اور بارش،اور شب وروز، گندم کے ایک پودے کے اگنے میں مدد کرتے ہیں ،اس نئے پودے کو پرورش کے لئے اپنے گہوارہ میں سلاتے ہیں،دایا اور نرسوں کے مانند ایک دوسرے کا تعاون کرتے ہوئے کوشش کرتے

ہیں یہاں تک کہ یہ دانہ اپنی بالیدگی ورشد کے آخری مرحلہ تک پہنچ جائے۔

یہی مثال انسان کے ایک نومولود بچے کی ہے کہ جس کا نظام پیدائش ایک پودے یا کسی دوسری چیز کی پیدائش سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے۔ یہ خلقت کے منظم وپیچیدہ نظام کے لاکھوں بلکہ کروڑوں سال کی سرگرمیوں کا ماحصل ہے۔

ایک انسان کی روزمرہ کی زندگی کی گردش۔ اپنے وجود سے باہر عالم ھستی سے رکھنے والے رابطہ کے علاوہ۔ اپنے وجود کے اندر ایک حیرت انگیز نظام سے نشاط سے مربوط ہے کہ دور اندیش سائنسدانوں کی فکریں صدیوں سے مسلسل ان کے ظاہر کا مشاہدہ کرنے میں سرگرم عمل رہی ہیں اور ہر روز ان اسرار سے پردہ اٹھایا جاتا ہے اور ابھی بھی ان کی معلومات مجھولات کی نسبت بہت کم ہیں۔

قرآن مجید کی نظر میں خدا شناسی کا طریقہ

جس شیر خوار بچہ نے دودھ پینے کے لئے ماں کا پستان پکڑ رکھا ہے اور دودھ پی رہا ہے، حقیقت میں وہ دودھ چاہتا ہے، اس کے علاوہ اگر کسی چیز کو ہاتھ میں اٹھاتا ہے تو اسے کھانے کے لئے اپنے منہ تک لے جاتا ہے، دراصل اس چیز کو اس نے کھانے کے لئے اٹھایا تھا اور جو ں ہی احساس کرتا ہے کہ اس نے غلطی کی ہے اور اٹھائی ہوئی چیز کھانے کی نہیں ہے، تو اسے پھینک دیتا ہے۔

اسی ترتیب سے، انسان جس مقصد کے پیچھے دوڑتا ہے، اصل میں وہ حقیقت کو چاہتا ہے، اگر اس کے لئے واضح ہو جائے کہ اس نے غلطی کی ہے اور غلط راہ پر چلا ہے، تو اپنی غلطی اور خطا سے ناراض ہوتا ہے اور غلط مقصد کی راہ کی محنت پر افسوس کرتا ہے اور مختصر یہ کہ انسان ہمیشہ اشتباہ اور خطا سے پرہیز کرتا ہے اور حتی الامکان حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔

یہاں پر معلوم ہوتا ہے کہ انسان فطرت اور جبلت کی رو سے حقیقت پسند ہے، یعنی لامحالہ ہمیشہ حقیقت کی جستجو اور حق کی پیروی کرنے والا ہوتا ہے، اس نے اس فطری عادت کو کسی سے یاد اور کہیں سے نہیں سیکھا ہے۔

انسان اگر کبھی سخت رویہ اختیار کر کے حق کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالتا ہے، وہ اس لئے ہے کہ وہ خطا و اشتباہ سے دوچار ہوتا ہے اور حق وحقیقت اس کے لئے واضح نہیں ہوتی ہے اگر اس کے لئے حق واضح ہوتا تو غلط راستہ پر نہ چلتا۔

کبھی انسان نفسانی خواہشات کی پیروی میں ایک قسم کی دماغی بیماری سے دو چار ہوتا ہے اور حق کی شیرینی کا مزہ اس کے منہ میں کڑوا بن جاتا ہے، اس وقت حق کو جانتے ہوئے بھی اس کی پیروی نہیں کرتا ہے۔اس کے باوجود کہ وہ حق کی حقانیت اور یہ کہ اسے اس کی پیروی کرنی چاہئے، کا اعتراف کرتا ہے، لیکن اسکی اطاعت کرنے سے سرکشی کرتا ہے۔ چنانچہ بہت سے ایسے اتفاقات بھی ہوتے ہیں کہ انسان مضر اور نقصان دہ چیزوں کا عادی ہو کر، اپنی انسانی فطرت، جو کہ خطرہ اور ضرر سے محفوظ رکھتی ہے، کو پامال کرتا ہے، اور ایک ایسے کام کو انجام دیتا ہے، جس کے بارے میں جانتا ہے کہ وہ نقصان دہ ہے۔ (جیسے: سگریٹ، شراب اور نشہ آور چیزوں کے عادی لوگ) قرآن مجید انسان کو حق پسندی اور حق کی پیروی کرنے کی دعوت دیتا ہے اور اس سلسلہ میں زیادہ تاکید کرتا ہے اور گوناگون بیانات کے ذریعہ انسان سے درخواست کرتا ہے کہ حق پسندی اور حق کی پیروی کی فطرت کو اپنے اندر زندہ رکھے۔

خدائے متعال فرماتا ہے:

(...فماذا بعد الحق الا الضلل...) (یونس ۳۲)

اور حق کے بعد ضلالت کے سوا کچھ نہیں ہے۔

(والعصر انّ الانسان لفی خسر الّا الذین ءآمنوا وعملوا الصّلحت وتواصوا بالحق وتواصوا بالصّبر) (عصر ۱-۳)

قسم ہے عصر کی، بیشک انسان خسارہ میں ہے۔علاوہ ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کئے اور ایک دوسرے کو حق اور صبر کی وصیت و نصیحت کی۔

واضح ہے کہ خداوند عالم کی یہ ساری تاکیدیں اس لئے ہیں کہ اگر انسان اپنی حقیقت پسندی کی فطرت کو زندہ نہ رکھے اور حق وحقیقت کی پیروی کی کوشش نہ کرے تو اپنی سعادت وکامیابی کا پابند نہ ہوگا اور وہ نفسانی خواہشات اور اپنی مرضی کے مطابق جو چاہے گا کہے گا اور جو چاہے گا کرے گا۔ اور غلط تصورات اور خرافی افکار میں گرفتار ہوگا اور اس وقت ایک چوپایہ کی طرح اپنی راہ (جو انسانی سرمایہ ہے) سے بھٹک کر، ہوا وہوس، لا ابالی اور اپنی نادانی کی بھینٹ چڑھ جائیگا۔ خدائے متعال فرماتا ہے:

(ارء یت من اتّخذ الٰهه هوٰه افانت تکون علیه وکیلا ٭ ام تحسب ان اکثر هم یسمعون او یعقلون اِنّ هم الّا کالانعام بل هم اضلّ سبیلا) (فرقان ۴۳،۴۴)

کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنی خواہشات ہی کو اپنا خدا بنالیا ہے، کیا آپ اس کی بھی ذمہ داری لینے کے لئے تیار ہیں؟ کیا آپ کا خیال یہ ہے ان کی اکثریت کچھ سنتی اور سمجھتی ہے؟ ہرگز نہیں یہ سب جانوروں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی کچھ زیادہ گم کردہ راہ ہیں۔

البتہ جب انسان کی حقیقت پسندانہ فطرت زندہ ہوتی ہے اور حق کی پیروی کرنے کی عادت اس میں کارفرما رہتی ہے، تو یکے بعد دیگرے اس کے لئے حقائق واضح ہوتے چلے جاتے ہیں اور وہ جس حق وحقیقت کو پالے گا اسے دل سے قبول کرے گا اور سعادت وخوشبختی کی راہ میں روز بروز آگے بڑھتا چلا جائے گا۔

خداوند متعال تمام صفات کمالیہ کا مالک ہے

کمال کیا ہے؟

ایک گھر کواس وقت کامل گھر کہہ سکتے ہیں، جب ایک گھرانے کی ضروریات زندگی کے تمام چیزیں اس میں موجود ہوں، چنانچہ اس میں مہمان خانہ، باورچی خانہ، غسل خانہ وغیرہ کے لئے کافی کمرے موجود ہوں، جس گھر میں جس قدر یہ وسائل کم ہوں اسی قدر اسے ناقص سمجھا جائے گا۔

اسی طرح ایک انسان میں اس کی فطری خلقت کے مطابق جن چیزوں کا موجود ہونا ضروری ہے، اگر وہ سب اس میں پائی جاتی ہوں تو وہ کامل ہے، اگر ان میں سے کسی ایک کی کمی ہو، یعنی وہ ہاتھ، پاؤں یا آنکھ سے محروم ہوتو اسی اعتبار سے ناقص سمجھا جائے گا۔

لہذا مذکورہ بیان سے معلوم ہوا کہ صفت کمال وہ چیز ہے کہ جو خلقت کی ضرورتوں کو پیدا کرتی ہے اور اس کے نقص کو دور کرتی ہے، علم کی صفت کے مانند کہ جہل کی تاریکی کو دور کرکے عالم کے لئے معلوم کو واضح کردیتا ہے اور قدرت کہ صاحب قدرت شخص کے مقاصد اور اغراض کو ممکن بنا دیتی ہے اور اسے ان پر مسلط کردیتی ہے ایسے ہی دوسرے صفات ہیں جیسے صفت حیات وغیرہ۔

ہمارا ضمیر فیصلہ کرتا ہے کہ خالق کائنات (جو ہستی عالم اور مخلوقات عالم کا سرچشمہ ہے، ہر فرض کی گئی ضرورت کو پورا کرتا ہے اور ہر نعمت وکمال کو فراہم کرتا ہے) تمام صفات کمال کا مالک ہے، کیونکہ ایک حقیقت پسند نظر کے مطابق یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ کوئی شخص ایسی نعمت کسی کو

بخش دے جوخود نہ رکھتا ہو یا جس عیب میں وہ خود مبتلا ہو دوسروں سے اس کو دور کرے۔خدائے متعال اپنے کلام پاک میں اپنے تمام صفات کمال کی ستائش کرتا ہے اور خود کو ہر قسم کے عیب ونقص سے پاک ومنزہ قرار دیتا ہے:

(وربّك الغنيّ ذوالرّحمة۔۔۔) (انعام ۱۳۳)

تیرا پروردگار بے نیاز اور مہربان ہے

(اللہ لا الہ الّاالہ ھولہ الاسماء الحسنی) (طہ ۸)

وہ اللہ ہے جس کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے،اس کے لئے بہترین نام ہیں۔

وہ زندہ، عالم،دیکھنے والا،سننے والا،قادر،خالق اور بے نیاز ہے، پس خدائے متعال کو تمام صفات کمال کا مالک اور اس کی ذات اقدس کو ہر صفت نقص سے پاک ومنزہ جاننا چاہیئے ،کیونکہ اگر اس میں نقص ہوتا تو اسی لحاظ سے نیاز مند ہوتا اور اس اعتبار سے اس سے بالاتر کسی اور خدا کو ہونا چاہیئے تھا جو اس کی نیاز مندی کو دور کر سکتا۔

(سبحانہ وتعالی عمّا یشرکون) (یونس ۵)

وہ پاک وپاکیزہ ہے اور ان کے شرک سے بلند وبرتر ہے

توحید اور یکتائی

(لو کان فیھما آلھة الّا اللہ لفسدتا۔۔۔) (انبیاء ۲۲)

یادرکھو اگر زمین وآسمان میں اللہ کے علاوہ اور خدا بھی ہوتے تو زمین وآسمان دونوں برباد ہو جاتے۔

وضاحت

اگر کائنات پر کئی خداؤں کی حکومت ہوتی ،جیسا کہ بت پرست کہتے ہیں کہ کائنات کے ہر شعبہ کاایک الگ خدا ہے۔زمین وآسمان اور دریا وجنگل کا الگ الگ خدا ہوتا ہے۔اگر ایسا ہوتاتو کائنات کی ہر جگہ پر خداؤں کے درمیان اختلاف کی وجہ سے الگ الگ انتظام برقرار ہوتا اوراس صورت میں کائنات کا کام لامحالہ تباہی وبربادی سے دوچار ہوتا ،چونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات کے تمام اجزاء آپس میں ھم آہنگ اور مکمل طور پر موافق ہیں اورسب مل کرایک نظام کوتشکیل دیتے ہیں،اس بناپر،کہنا چاہئے کہ خالقِ کائنات ایک سے زیادہ نہیں ہے۔

یہاں پر یہ تصورنہیں کرنا چاہئے کہ فرض کئے گئے خدا،چونکہ عاقل ہوں گےاوروہ جانتے ہوں گے کہ ان کا اختلاف کائنات کوتباہی وبربادی کی طرف لے جائے گا،لہذا وہ ہرگز آپس میں اختلاف نہیں کریں گے،کیونکہ اس صورت میں وہ ایک دوسرے کے کام میں مؤثر ہوں گے اور ہرایک دوسرے کی موافقت اوراجازت کا محتاج ہوگا اورا کیلے ہی کوئی کام انجام نہیں دے سکتا۔جب کہ خدائے تعالی کواحتیاج سے منزہ وپاک ہونا چاہئے۔

خدائے متعال کا وجود،قدرت اور علم

اس وسیع وعریض کائنات کے آپس میں ملے ہوئے اجزاء،اوراس کی عام اورحیرت انگیز گردش،اور کائنات کے گوشہ وکنار میں جاری،آپس میں مرتبط اورآنکھوں کوخیرہ دینے

والے جزئی نظام اور نتیجہ کے طور پر مختلف انواع کے مظاہر اپنے خاص مقصد کی طرف، انتہائی نظم وترتیب کے ساتھ حرکت میں ہیں، یہ نظم ہر عقلمند انساں کے لئے واضح کر دیتا ہے کہ عالم ھستی اور جو کچھ اس میں ہے اپنے وجود وبقا کے لئے ایک لا فانی وجود سے متصل ہیں، جس نے اپنی لامحدود قدرت وعلم سے کائنات اور کائنات میں موجود ہر شئے کو خلق کیا ہے اور اپنی ہر مخلوق کو پرورش کے گھوارہ میں قرار دیا ہے اور اپنی خاص عنایتوں سے ان کے مطلوب کمال کی طرف ابھارتا ہے یہ وہی ہے جس کی ھستی لا فانی ہے اور ہر چیز کو جانتا ہے اور اس پر قادر ہے، خدائے متعال فرماتا ہے:

(لہ ملک السمٰوات والارض یحی ویمیت وہو علی کل شی ء قدیر☆ ہوالاوّل والآخر والظّاھر والباطن وہو بکل شی ءعلیم)(حدید ۲ ۳)

آسمان وزمین کا کل اختیار اسی کے پاس ہے اور وہی حیات وموت کا دینے والا ہے اور ہر شے پر اختیار رکھنے والا ہے۔ وہی اول ہے وہی آخر وہی ظاہر ہے وہی باطن اور وہی ہر شے کا جاننے والا ہے۔

خدا کی قدرت

(۔۔۔وللہ ملك السمٰوات والارض وما بینهما یخلق ما یشآء واللہ علی کل شی ء قدیر) (مائدہ ۱۷)

اور اللہ ہی کے لئے زمین وآسمان اور ان کے درمیان کی کل حکومت ہے۔ وہ جیسے بھی چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور ہر شے پر قدرت رکھنے والا ہے

وضاحت

جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص موٹر کار خریدنے کی قدرت رکھتا ہے،تو ہمارا مقصد یہ ہوتا ہے ،کہ جو موٹر کار خریدنے کا محتاج ہے اس کے پاس اس کے خریدنے کی مالی طاقت ہے،اور اگر ہم یہ کہیں کہ فلاں شخص بیس کلوگرام وزنی پتھر اٹھانے کی طاقت رکھتا ہے،تو ہمارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس میں بیس کلوگرام پتھر اٹھانے کی طاقت موجود ہے۔

حقیقت میں، کسی چیز پر توانائی وقدرت رکھنے کے یہ معنیٰ ہیں کہ اس کے تمام ضروری وسائل اس کے پاس ہیں،اور چونکہ عالم ھستی میں جس وجود کو بھی فرض کیا جائے ،اس کی نیاز مندی اور زندگی کی گردش کی ضرورت خدا کے وجود سے پوری ہوتی ہے،یہ کہنا چاہئے کہ خدائے متعال ہر چیز کی قدرت وتوانائی رکھتا ہے اور اسی کی ذات پاک کائنات کا سرچشمہ ہے۔

خدا کا علم

(الا یعلم مَن خلق...) (ملک[14])

کیا پیدا کرنے والا نہیں جانتا ہے؟

وضاحت

چونکہ ہر مخلوق اپنی پیدائش وھستی میں خدائے متعال کی لامحدود ذات کی محتاج ہے، اس لئے اس مخلوق اور خدا کے درمیان پردے اور رکاوٹ کا تصور نہیں کیا جا سکتا ہے یا اس کا خدا سے پوشیدہ ہونا تصور نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اس کے لئے ہر چیز آشکار ہے اور ہر چیز کے داخل وخارج پر تسلّط اور احاطہ کرتا ہے۔

خدا کی رحمت

جب ہم ایک ناتوان محتاج کو دیکھتے ہیں، تو اپنی توانائی کے مطابق اس کی ضرورت کو پورا کرتے ہیں، یا کسی مصیبت زدہ بے چارہ کی مدد کرتے ہیں یا ایک نابینا کا ہاتھ پکڑ کر اسے اس کی منزل مقصود تک پہنچاتے ہیں۔ ایسے کاموں کو ہم مہربانی اور رحمت شمار کر کے پسندیدہ اور قابل ستائش جانتے ہیں۔

جن کاموں کو کارساز اور بے نیاز خدا انجام دیتا ہے، وہ رحمت کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتے، کیونکہ وہ اپنی بے شمار نعمتوں کو بخش کر سبھی کو بہرہ مند کرتا ہے اور ہر بخشش سے۔ خود کسی کا نیاز مند ہوئے بغیر۔ مخلوقات کی ضرورتوں کے ایک حصہ کو پورا کرتا ہے، چنانچہ فرماتا ہے:

(...و ن تعدوا نعمت اللہ لا تحصوھا...) (ابراھیم ٣٤)

اگر تم اس کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو گے تو ہرگز شمار نہیں کر سکتے۔

(ورحمتی وسعت کلّ شیٔ...) (اعراف ١٥٦)

اور میری رحمت نے تمام چیزوں کا احاطہ کیا ہے۔

تمام صفات کمالیہ

(وربّك الغنیّ ذوالرّحمة...) (انعام ۱۳۴)

تمہارے پروردگار بے نیاز اور صاحب رحمت ہے

وضاحت

کائنات میں موجود ہر خوبی اور زیبائی ،جس کمال کی صفت کے بارے میں تصور کریں ،وہ ایک نعمت ہے جسے خدائے متعال نے اپنی مخلوقات کو عطا کیا ہے اور اس کے ذریعہ خلقت کی ضرورتوں میں سے کسی ایک کو پورا کیا ہے،البتہ اگر وہ خود اس کمال کا مالک نہ ہوتا،تو اس کمال کو دوسروں کو بخشنے میں عاجز ہوتا اور خود بھی ضرورتوں میں دوسروں کا شریک بن جاتا ،پس خداوند عالم کے تمام صفات کمال خود اسی کے ہیں اور اس نے کوئی کمال کسی دوسرے سے حاصل نہیں کیا ہے اور اس نے کسی کے سامنے دست نیاز دراز نہیں کیا ہے، بلکہ خود تمام صفات کمال ،جیسے: حیات، علم ،قدرت وغیرہ کا مالک ہے اور تمام صفات عیب اور نیاز مندی واحتیاج کے اسباب جیسے: ناتوانی ، نادانی ،موت ،گرفتاری وغیرہ سے پاک ومنزہ ہے۔

۲۔نبوت

انسان کو پیغمبر کی ضرورت

خدائے متعال نے اپنی کامل قدرت سے جو کہ ہر اعتبار سے بے نیاز ہے کائنات اور کائنات میں گونا گوں مخلوقات کو خلق کیا اور انھیں بیشمار نعمتوں سے نوازا ہے۔

انسان اور تمام دوسری جان دار وغیر جان دار مخلوقات کی پرورش پیدائش کے دن سے لیکر کائنات کے آخری دن تک ،خدا ہی کرتا ہے،اور ان میں سے ہر ایک ،خاص نظم ونسق اور خاص تربیت سے ایک معلوم ومعین مقصد کی طرف ہدایت پاتے ہیں اور اسی کی طرف بڑھتے ہیں جبکہ تمام لحات میں وہ اپنی شایان شان عنایتوں سے نوازے جاتے ہیں۔

اگر ہم صرف اپنی زندگی کے بارے میں غور وخوض کریں ،یعنی شیر خوارگی ،بچپن ،جوانی اور بوڑھاپے کے دور پر نظر ڈالیں ،تو خدائے متعال کا وہ کامل لطف وکرم جو ہمارے شامل حال ہے، کے بارے میں ہمارا ضمیر گواہی دے گا ،اور جب یہ مسئلہ ہمارے لئے واضح ہو جائے گا تو یقینا ہماری عقل فیصلہ دے گی کہ خالق کائنات ،اپنی مخلوق کے لئے سب سے زیادہ مہربان ہے۔اسی مہربانی کی وجہ سے ہمیشہ ان کے حالات کے مطابق مصلحت کی رعایت کرتا ہے اور حکمت ومصلحت کے بغیر ہرگز ان کے فساد وتباہی کے کاموں سے راضی نہیں ہوتا ۔انسان،خدا کی ایک ایسی مخلوق ہے۔کہ جس کی فلاح وبہبود اور سعادت اس میں ہے کہ

حقیقت پسند اور نیک منش ہو ،یعنی اس میں صحیح عقائد ،پسندیدہ اخلاق اور نیک کردار ہونا چاہیئے۔

ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ انسان اپنی خداداد عقل سے اچھے اور برے کو پہچان سکتا ہے اور چاہ کو راہ سے تشخیص دے سکتا ہے،لیکن یہ جاننا چاہئے کہ عقل اکیلے ہی اس گرہ کو کھول کر انسان کی حقیقت پسندی اور نیکی کی طرف رہنمائی نہیں کرسکتی ، کیونکہ انسانی معاشرے میں جو مشاہدہ کیا جارہا ہے وہ یہ ہے کہ زیادہ تر برائیاں ان لوگوں سے انجام پارہے ہیں ، جو عقل وشعور اور برے بھلے کی تمیز رکھتے ہیں ،لیکن خود پرستی ،منافع پرستی اور ہوس رانی کے نتیجہ میں ان کی عقل اس کے جذبات اور ہواو ہوس کی تابع ہوکر گمراہی سے دوچار ہوتی ہے۔لہذا خدائے متعال کو ایک دوسرے راستہ سے یا ایک ایسے وسیلہ سے سعادت کی طرف ہماری راہنمائی کرنا چاہئے جو کبھی ہواو ہوس سے مغلوب نہ ہواور اپنی رہبری میں کبھی اشتباہ وغلطی کا شکار نہ ہو،ایسا راستہ صرف نبوت کا ہے۔

انبیاء کی تبلیغ

ہماری عقل جو فیصلہ کرتی ہے اور اس کے مطابق حکم دیتی ہے کہ انسان کے لئے نبوت کے نام کا ایک راستہ کھلا ہونا چاہئے ۔ یہ چیز عملا بھی مورد تاکید قرار پاکر انجام پایا ہے۔انسانوں میں سے (انبیائ) نامی کا ایک گروہ خدائے متعال کی طرف سے منتخب ہوا ہے۔جنہوں نے لو گوں کی ہدایت کے لئے اعتقادی کچھ عملی قوانین وضوابط پیش کئے اور ان کو صحیح راستے پر چلنے

کی دعوت دی ہے

ان پیغمبروں نے اپنے دعوی کے صحیح ہونے اوراپنے دین کے سچے ہونے کومعقول طریقوں سےلوگوں کے لئے ثابت کیا،اوراپنے تربیتی مکتب میں کچھ شائستہ افراد کی پرورش کی۔

عقل معاش، جسے ہم عقل علمی بھی کہتے ہیں (وہ شعور جس سے ہم اپنی زندگی کو چلاتے ہیں) ہمیں یہ اجازت دیتی ہے کہ ہم اپنی زندگی کے فائدے کے لئے ہر قابل استفادہ چیز سے استفادہ کریں، جیسے: فضا، ہوا، درختوں، ان کے پھل، پتوں اور لکڑیوں حیوانات، ان کے گوشت، دودھ، اون اور کھال سے استفادہ کریں۔اسی طرح ہم اپنی بے شمار ضرورتوں کے پیش نظر اپنے ہم نوع انسانوں کی سرگرمیوں سے بھی اپنے نفع میں استفادہ کرتے ہیں۔

ان چیزوں کے مصرف اور استفادہ کا حکم ہمیں ہماری عقل وشعور نے دیا ہے اور اسی نے ان کے جائز ہونے کی تصدیق کی ہے،اس لئے ہے کہ اگر کوئی ہم سے پوچھے کہ بھوک کے وقت تم کیوں کھانا کھاتے ہو؟ پیاس کے وقت کیوں پانی پیتے ہو؟ یا ہوا میں کیوں سانس لیتے ہو؟ تو اس کے یہ سوالات مضحکہ خیز ہوں گے۔

لیکن جب ہم اپنے ہم نوع انسان کے کام وکوشش سے استفادہ کرنے کے لئے ان سے پہلی بار رابطہ برقرار کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی ہماری طرح ہیں جس طرح ہم ان کی سر گرمیوں کے نتیجہ سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں، اسی طرح وہ بھی ہماری سرگرمیوں کے نتیجہ سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں۔کیونکہ ہم اپنی سرگرمیوں کے نتیجہ کو انھیں مفت میں دینے کے لئے تیار نہیں ہیں لہذا ان کے پاس بھی جو کچھ ہے وہ اسے مفت میں دینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ہم اجتماعی طور پر ایک دوسرے کا تعاون کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور اپنے ہم نوع انسان کی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں ان کی مدد کرتے ہیں تا کہ اس کے مقابلہ میں وہ بھی ہماری مدد کریں۔

اسی احتیاج وضرورت کے پیش نظر، مختلف انسان آپس میں جمع ہو گئے اور ایک دوسرے کی مدد اور کام سے استفادہ کرتے ہیں، حقیقت میں مختلف افراد کے کام اور ان کی کوششیں ایک دوسرے پر بٹ جاتی ہیں، اور اس کے بعد ہر ایک اپنی حیثیت اور اجتماعی سرگرمی کے مطابق اس سے استفادہ کرتا ہے۔

معاشرے میں قوانین وقواعد کی ضرورت

جیسا کہ بیان کیا جا چکا کہ انسان مجبور ہو کر اجتماعی تعاون پر آمادہ ہوتا ہے ورنہ فطری طور پر وہ صرف اپنی زندگی کے نفع کا خواہاں ہے، لہذا جب بھی اسے موقع ملتا ہے وہ دوسروں کے منافع پر تجاوز کرتا ہے جبکہ اس نے اپنے منافع سے کوئی چیز دوسروں کو انہیں دی ہے کہ تعادل برقرار رہے۔ اسی لئے ہر معاشرے میں کچھ قوانین ومقررات کا ہونا ضروری ہے تا کہ ان کی رعایت کرنے سے، انسان کی اجتماعی قدر و قیمت محفوظ رہے، اور ان کو تجاوز کرنے سے روکا جا سکے۔ قوانین وضوابط کو لوگوں کے اتفاق نظر یا ان کی اکثریت کی رائے سے منظور کیا جانا چاہئے تا کہ ہر فرد اپنے انفرادی واجتماعی فرائض سے آگاہ ہو جائے۔

قواعد وضوابط کی تکوینی بنیاد

قوانین وضوابط ایسے فرائض ہیں جو انسانی زندگی کی مصلحتوں کی حفاظت کے لئے وضع ہوئے ہیں ۔اس لحاظ سے ان کی قدر وقیمت اجتماعی ہے نہ فطری وتکوینی ۔یعنی فطرت میں حکم فرما قوانین کا خود بخود کوئی اثر نہیں ہے، بلکہ جب معاشرے کے لوگ انھیں جاری کرتے ہیں تو یہ جاری ہوتے ہیں ورنہ یہ ایک بے اثر افسانہ کے علاوہ کچھ نہیں ہوتے۔

اس کے باوجود یہ قوانین وضوابط ،فطرت وتکوین سے بے ربط بھی نہیں ہیں، بلکہ ان میں تکوین کی اصل موجود ہے ۔فطرت اورانسان کی فطری ضرورت ان کا سرچشمہ ہے .یعنی خدائے متعال نے انسان کی خلقت کچھ اس طرح کی ہے کہ خواہ نخواہ اجتماعی افکار کے ایک سلسلہ کو وجود میں لاکر انھیں قابل استفادہ قرار دیتا ہے اور اپنی تکوینی زندگی کو ان پر تطبیق کرتا ہے اور اپنے وجودی مقاصد تک پہنچتا ہے۔

زندگی کے قوانین کی طرف تکوینی ہدایت

ہم جانتے ہیں کہ خدائے متعال اپنی عنایت کاملہ اور بے پناہ محبت کی بدولت اپنی ہر مخلوق کو اس کے وجودی مقصد تک پہنچاتا ہے اور انسان بھی اس قانون سے مستثنیٰ نہیں ہے، پس خدائے متعال کے لئے ضروری ہے کہ انسان کے لئے کچھ ایسے قوانین وضوابط وضع کرے جو اس کی زندگی کی راہ ورسم کو تشکیل دے اور ان پر عمل کے ذریعہ انسان کی مصلحتیں اور منافع پورے ہوسکیں اور ان کو حاصل کرنے کے لئے صرف عقل کافی نہیں ہے۔ کیونکہ کبھی خود عقل

بھی درک کرنے میں خطا کرتی ہے اور اکثر اوقات عقل عادت ،تقلید اور وراثت میں ملی صفات سے متاثر ہوکر ہواوہوس سے مغلوب ہوکر انسان کو ہلاکت کی طرف لے جاتی ہے ۔جیسا کہ ہم جان چکے کہ، عقل انسان کومنافع طلبی کے قانون کی طرف رہنمائی کرتی ہے،اور اگر انسان کبھی دوسروں کے لئے حق کا قائل ہوتا ہے اور عام قانون کی پیروی کرتا ہے،تو وہ بنابرمجبوری اوراپنے شخصی منافع کوحاصل کرنے کے لئے ہوتا ہے،اسی وجہ سے اکثر لوگ جب قدرت وتوانائی کے عروج پر پہنچتے ہیں تو اپنے مقابلہ میں کسی حریف اورمخالف کو کچھ نہیں سمجھتے ،ہر قانون وحکم کی سرکشی کرتے ہیں اوردوسروں کے منافع کو اپنے لئے مخصوص کراتے ہیں اور ان کے حقوق کو پامال کرتے ہیں۔

لہذا خدائے متعال کو چاہئے کہ لوگوں کوان کی زندگی کی راہ ورسم کے بارے میں ایک ایسے طریقہ سے راہنمائی کرے،جو ہرقسم کی خطاولغزش سے محفوظ ہو اور وہ طریقہ (نبوت) ہے،اوروہ یہ ہے کہ خدائے متعال اپنے بعض بندوں کوراہ فکر وعقل کے علاوہ ایک اورراہ (راہ وحی) سے معارف واحکام کے ایک سلسلہ کی تعلیم دے تا کہ ان پرعمل کے ذریعہ لوگوں کی حقیقی سعادت کی طرف رہنمائی کر سکے۔

نتیجه

مذکورہ بیان سے معلوم ہوا کہ خدائے متعال کو چاہئے کہ اپنے بعض بندوں کوغیبی تعلیم کے قوانین سے آگاہ کر کے بھیجے جوانسانی سعادت کے ضامن ہیں۔خدا کے پیغام لانے والے

انسان کو پیغمبر یا خدا کا رسول کہتے ہیں، اور خدا کی طرف سے لائے گئے پیغامات کے مجموعہ کو دین کہتے ہیں۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ خدا کی طرف سے بھیجے گئے دینی معارف اور الٰہی قوانین کو صحیح طور پر تبدیلی، اور کمی بیشی کے بغیر لوگوں کے پاس پہنچنا چاہیئے۔ یعنی خدا کا پیغمبر وحی الٰہی کو حاصل کرنے میں خطا نہ کرے اور اس کی حفاظت میں بھول چوک اور لغزش سے دو چار نہ ہو اور اس کو لوگوں تک پہنچانے میں غلطی یا خیانت نہ کرے۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا کہ ضروری معارف اور زندگی کے قوانین کی طرف لوگوں کی ہدایت نظام خلقت کا جزو ہے اور یہ انسان کی تخلیق کا ایک مقصد ہے۔ خلقت اپنی راہ کو طے کرنے میں ہرگز خطا اور لغزش کو قبول نہیں کرتی، مثال کے طور پر یہ ممکن نہیں ہے کہ نظام خلقت، انسان کے تناسل سے ایک پتھر یا پودے کو وجود میں لائے یا گیہوں کے دانہ کو بونے کے بعد ایک حیوان پیدا ہو یا انسان کی آنکھ موجودہ حالت میں معدہ کا کام انجام دے یا کان دل کا کام انجام دے۔

اس چیز سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے انبیاء کو معصوم ہونا چاہیئے۔ یعنی جس کام کو وہ خود واجب جانتے ہوں اسے ترک نہ کریں اور جس کام کو وہ خود گناہ جانتے ہوں انہیں انجام نہ دیں، کیونکہ ہم (انسان) اپنے ضمیر سے جانتے ہیں کہ جو اپنی بات پر عمل نہ کرے، حقیقت میں وہ اس بات کے صحیح اور سچ ہونے کا قائل نہیں ہے۔ اس صورت میں اگر پیغمبر گناہ کا مرتکب ہو جائے، تو کوئی اس کی بات پر یقین نہیں کرے گا اور تبلیغ کا مسئلہ بے اثر ہوگا اور اگر بعد میں توبہ اور اظہار ندامت بھی کرتا ہے تو بھی ہمارا دل اس کی طرف سے صاف نہیں ہوگا اور ہر حالت

میں تبلیغ کا مقصد فوت پر جائے گا۔خدائے متعال فرماتا ہے:

(عالم الغیب فلا یظھر علی غیبہ احداً ☆ الّا من ارتضی من رسول فانّہ یسلک من بین یدیہ ومن خلفہ رصداً ☆ لیعلم ان قد ابلغو ارسٰلت ربّھم ۔۔۔)(جن ۲۶ ۲۸)

وہ عالم الغیب ہے اور اپنے غیب پر کسی کو بھی مطلع نہیں کرتا۔مگر جس رسول کو پسند کر لےتو اس کے آگے پیچھے نگہبان فرشتے مقرر کر دیتا ہے،تا کہ وہ دیکھ لے کہ انہوں نے اپنے رب کے پیغامات کو پہنچا دیا ہے۔

انسان اور دوسری مخلوقات کی ہدایت میں فرق

توحید کی بحثوں سے واضح ہوتا ہے کہ اشیاء کی تخلیق خدا کی طرف سے ہے،لہذا ان کی پرورش بھی اسی سے مربوط ہے۔واضح الفاظ میں یہ کہا جائے کہ کائنات کی ہر مخلوق ،اپنی پیدائش کے آغاز سے اپنی بقااور نقائص کو دور کرنے میں سرگرم عمل ہوتی ہے اورا اپنی کمیوں وضرورتوں کو یکے بعد دیگر رفع کرتی ہے اور امکان کی حدتک اپنے آپ کو کامل اور بے نیاز کرتی ہے۔اپنی بقاکے سفر میں ایک منظم حرکت کے تحت اپنے وجود کو جاری رکھتی ہے،اس سفر کو منظم کرنے والا اور ہر منزل پر اسکا رہبر خدائے متعال ہے۔

اس نظریہ کے مطابق ایک قطعی نتیجہ نکلتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کائنات کی ہر قسم کی مخلوق ایک خاص تکوینی پروگرام کے تحت باقی ہے اور اس میں اپنی خاص سرگرمی ہوتی ہے۔دوسرے الفاظ میں،کائنات کے مظاہر میں سے ہر معیّن گروہ کے لئے،اپنی بقاکے سفر میں کچھ معیّن فرائض

ہیں جو خدائے متعال کی طرف سے انھیں عطا ہوتے ہیں ۔ چنانچہ قرآن مجید اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

(۔۔۔ربّنا الّذی عطی کلّ شیئٍ خلقہ ثمّ ہدی)(طہ ۵۰)

...ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر شے کو اس کی مناسب خلقت عطا کی ہے اور پھر ہدایت بھی دی ہے

خلقت کے تمام اجزا اس کلی حکم میں شامل ہیں اور ان میں سے ہرگز کوئی مستثنیٰ نہیں ہے آسمان کے ستارے اور ہمارے پیروں تلے زمین اور ان میں موجود عناصر اور ابتدائی مظاہر کو ظاہر کرنے والی ترکیبیں اور نباتات وحیوانات، سبھی کی یہی حالت ہے ۔اس عام ہدایت میں انسان کی حالت بھی دوسری مخلوقات کے مانند ہے، سوائے یہ کہ انسان اور دوسری مخلوقات کے درمیان ایک فرق ہے۔

انسان اور دوسری مخلوقات میں فرق

مثال کے طور پر کرۂ زمین کو لاکھوں سال پہلے خلق کیا گیا ہے، جو اپنی تمام پوشیدہ توانائیوں کو استعمال میں لاکر اپنے دائرہ حدود میں جب تک مخالف عوامل مانع نہیں ہوتے اس وقت تک سرگرم عمل ہے اور اپنی وضعی وانتقالی حرکت کے نتیجہ میں اپنے وجودی آثار کو ظاہر کرتا ہے اور اس طرح اپنی بقا کی ضمانت حاصل کرتا ہے اور جب تک کوئی اس سے قوی مخالف عامل رکاوٹ نہ بنے، اسی سرگرمی کو جاری رکھے گا، اور اپنے فرائض کو نبھانے میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کرے گا۔

بادام کا درخت گٹھلی سے باہر آنے کے وقت سے کامل درخت کی صورت اختیار کرنے تک، تغذیہ، رشد ونمو وغیرہ میں، دوسرے الفاظ میں اپنے تکامل کے سفر کی راہ میں کچھ فرائض انجام دیتا ہے کہ اگر کوئی قوی تر مخالف عامل رکاوٹ نہ بنے تو اپنے فرائض کو انجام دینے میں ہرگز کوتاہی نہیں کریگا اور کوئی کوتاہی کر بھی نہیں سکتا۔ ہر دوسری مخلوق کی بھی یہی حالت ہے ۔لیکن انسان، اپنی خصوصی سرگرمیوں کو اپنے اختیار سے انجام دیتا ہے اور جو کام انجام دیتا ہے، اس کا سرچشمہ اس کی فکر اور اس کا فیصلہ ہوتا ہے۔ ممکن ہے انسان کبھی ایک ایسے کام کو انجام دینے سے پہلو تہی کرے، جو سو فیصدی اس کے نفع میں ہو اور کوئی مخالف عامل بھی رکاوٹ نہ بنے اور اس کے مقابلہ میں ایک ایسے کام کو جان بوجھ کر انجام دے جس میں سو فیصدی ضرر اور نقصان ہو، مثلاً کبھی دوائی کھانے سے پرہیز کرتا ہے اور کبھی جام زہر نوش کر کے خودکشی کرتا ہے۔

البتہ واضح ہے کہ جو مخلوق مختار پیدا کی گئی ہے ہو، عام ہدایت اس کے لئے جبری نہیں ہوگی۔ یعنی انبیاء، خیر وشر اور سعادت و بدبختی کی راہ کو خدائے متعال کی طرف سے لوگوں کو بیان کرتے ہیں اور دین کے پیرؤں کو ثواب کا مژدہ سنا کر پروردگار کی رحمت سے امیدوار بناتے ہیں سرکشوں اور باغیوں کو خدا کے عذاب سے ڈراتے ہیں اور وہ ان میں سے ہر ایک کو اختیار کرنے میں آزاد و مختار ہوں گے۔

صحیح ہے کہ انسان اپنے خیر وشر اور نفع ونقصان کو اجمالاً عقل سے سمجھتا ہے۔ لیکن یہی عقل، اکثر اوقات اپنے کو گم کر کے نفسانی خواہشات کی پیروی کرتی ہے، اور کبھی غلط راستہ پر چلتی

ہے لہذا خدا کی ہدایت عقل کے علاوہ کسی اور راستہ سے بھی انجام پانی چاہئے اور وہ اس راستہ کو خطا ولغزش سے بالکل محفوظ ہونا چاہئے۔ یا دوسرے الفاظ میں خدائے متعال اپنے احکام کو اجمالی طور پر عقل سے لوگوں کو سمجھاتا، اور ایک دوسرے راستہ سے اس کی تصدیق فرماتا۔
یہ راستہ، وہی نبوت کا راستہ ہے کہ خدائے متعال اپنے سعادت بخش احکام کو وحی کے ذریعہ اپنے بندوں میں سے کسی ایک کو سمجھاتا ہے اور اسے مامور کرتا ہے کہ انھیں لوگوں تک پہنچائے اور انھیں امید وخوف کے ذریعہ شوق دلا کر اور ڈرا کر ان احکام پر عمل کرنے کے لئے مجبور کرے۔ خدائے متعال اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے:
(انّا وحینا لیک کما وحینا الی نوحٍ والنّبیّن من بعدہ۔۔۔رسلاً مبشّرین ومنذرین لئلا یکون للنّاس علی اللہ حجّۃ بعد الرّسل۔۔) (نسائ ۱٦۵۱٦۳)
ہم نے آپ کی طرف اسی طرح وحی نازل کی ہے جس طرح نوح اور ان کے بعد کے انبیاء کی طرف وحی کی تھی ... یہ سارے رسول بشارت دینے والے اور ڈرانے والے اس لئے بھیجے گئے تا کہ رسولوں کے آنے کے بعد انسانوں کی حجت خدا پر قایم نہ ہونے پائے

پیغمبر کی صفات

مذکورہ بیان سے واضح ہوا کہ پیغمبر میں حسب ذیل صفات ہونی چاہئیں:

۱۔اپنے فریضہ کوانجام دینے میں خطا سے محفوظ اور معصوم ہونا چاہئے اور ہر طرح کی فراموشی اور دوسری ذہنی آفتوں سے بھی محفوظ ہونا چاہئے تا کہ جو چیز اس پر وحی ہوتی ہے اس کو صحیح طور پر حاصل کر کے، کسی لغزش و غلطی کے بغیر لوگوں تک پہنچا دے، کیونکہ اگر ایسا نہ کیا تو الٰہی ہدایت اپنے مقصد تک نہیں پہنچ سکتی اور عام ہدایت کا قانون اپنی کلی حیثیت کو کھو کر انسان پر اثر انداز نہیں ہوسکتا ہے۔

۲۔پیغمبر کو اپنے کردار و گفتار میں لغزش اور گناہ سے محفوظ ہونا چاہئے چونکہ گناہ کی صورت میں تبلیغ موثّر واقع نہیں ہوتی ،جس کے قول و فعل میں اختلاف ہو،لوگ اس کے قول کو قابل قدر نہیں جانتے حتی اس کے کردار کو بھی جھوٹ کی دلیل سمجھ کر کہتے ہیں: (اگر وہ سچ کہتا تو وہ اپنی بات پر عمل کرتا)

ان دو مطالب کو ایک عبارت میں جمع کیا جا سکتا ہے: تبلیغ کے صحیح و موثّر واقع ہونے کے لئے پیغمبر کا خطا اور معصیت سے معصوم ہونا ضروری ہے، جیسا کہ قرآن مجید کی دلیل بھی بیان کی گئی۔(۱)

....

۱۔جن ۲۸۔۲٦۔

۳۔پیغمبر کو اخلاقی فضائل کا مالک ہونا چاہئے، جیسے: عفت، شجاعت، عدالت وغیرہ کیونکہ یہ سب پسندیدہ صفات شمار ہوتی ہیں اور جو ہر قسم کی معصیت سے محفوظ ہو اور دین کی مکمل طور پر اطاعت کرتا ہو اس کا دامن کبھی اخلاقی، برائیوں سے داغدار نہیں ہوسکتا۔

انبیاء، انسانوں کے درمیان

تاریخ کی رو سے مسلّم ہے کہ لوگوں کے درمیان کچھ پیغمبر تھے جنھوں نے دعوت کے ذریعہ انقلاب برپا کیا ہے، لیکن پھر بھی ان کی زندگی کے بارے میں تاریخ زیادہ واضح نہیں ہے۔صرف حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کی تاریخ میں کسی طرح کا ابہام نہیں ہے۔اور قرآن مجید، جو آنحضرت ﷺ کی آسمانی کتاب ہے اور اس میں آپ ﷺ کے دین کے عالی مقاصد درج ہیں، گزشتہ انبیاء کی دعوت کے موضوع کو بھی واضح کرتا ہے اور ان کے مقاصد کو بھی بیان کرتا ہے۔

قرآن مجید بیان کرتا ہے کہ خدائے متعال کی طرف سے بہت سے انبیاء رلوگوں کی طرف آئے ہیں اور انہوں نے متفقہ طور پر توحید اور دین کی دعوت کی ہے، چنانچہ فرماتا ہے:

(وما ارسلنا من قبلك من رّسول الّا نوحی الیه انّه لا اله الّا انا فاعبدون)

(انبیاء۲۵)

اور ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر یہ کہ اس کی طرف وحی کرتے رہے کہ میرے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے، لہذا سب لوگ میری ہی عبادت کرو۔

صاحب شریعت انبیا

قرآن مجید بیان فرماتا ہے کہ خدا کے سارے نبی آسمانی کتاب کے حامل نہیں تھے اور نہ ہی مستقل شریعت لے کرآئے تھے۔خدائے متعال فرماتا ہے:

(شرع لکم من الدّین ماوصّی به نوحاً والّذی وحینا الیك وما وصّینا به ابرهیم وموسٰی وعیسٰی...) (شوریٰ ۱۳)

اس نے تمھارے لئے دین میں وہ راستہ مقرر کیا ہے جس کی نصیحت نوح کو کی ہے اور جس کی وحی پیغمبر! تمھاری طرف بھی کی ہے اور جس کی نصیحت ابراہیم، موسی اور عیسی کو بھی کی ہے...

اس بنا پر بڑے انبیاء میں سے پانچ نبی جو صاحب شریعت اور آسمانی کتابوں کے حامل تھے، حسب ذیل ہیں:

۱۔حضرت نوح علیہ السلام

۲۔حضرت ابراہیم علیہ السلام

۳۔حضرت موسی (کلیم) علیہ السلام

٤۔حضرت عیسی (مسیح) علیہ السلام

٥۔حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ان انبیاء میں سے ہر ایک کی شریعت اپنے گزشتہ نبی کی شریعت کو مکمل کرنے والی تھی۔

اولوالعزم پیغمبر اور دوسرے انبیا

ہم یہ بیان کر چکے کہ جو پیغمبر آسمانی کتاب اور مستقل شریعت لے کر آئے تھے وہ پانچ ہیں لیکن خدا کے رسول صرف یہی پانچ افراد نہیں تھے، بلکہ ہر امت کا ایک نبی تھا اور خدا کی طرف سے لوگوں کے لئے بہت سے انبیاء بھیجے گئے ہیں، کہ ان سے میں صرف بیس افراد کا نام قرآن مجید میں موجود ہے، چنانچہ خدائے متعال فرماتا ہے:

(...منهم من قصصنا عليك ومنهم من لم نقصص عليك...) (غافر ۷۸)

...جن میں سے بعض کا تذکرہ آپ سے کیا ہے اور بعض کا تذکرہ بھی نہیں کیا ہے

(ولكلّ امّةٍ رسول...) (یونس ۴۷)

اور ہر امت کے لئے، ایک رسول ہے۔

(...ولكلّ قومٍ هاد...) (رعد ۷)

اور ہر قوم کے لئے ایک ہدایت کرنے والا ہے...

جی ہاں، اولواالعزم پیغمبروں میں سے ہر ایک کے بعد جتنے بھی پیغمبر آئے ہیں، انہوں نے انسانوں کو انہی پیغمبروں کی شریعت کی طرف دعوت دی ہے اور اس طرح، بعثت ودعوت کا سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ خدائے متعال نے پیغمبر اکرم حضرت محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گزشتہ پیغمبروں کے سلسلہ کو ختم کرنے اور آخری احکام وکامل ترین دینی ضوابط کو پہنچانے کے لئے مبعوث فرمایا اور آپ کی آسمانی کتاب کو آخری آسمانی کتاب قرار دیا نتیجہ میں، آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا دین قیامت تک جاری رہے گا اور آپ کی شریعت

ہمیشہ کے لئے زندہ رہے گی۔

۱۔حضرت نوح علیہ السلام

سب سے پہلے پیغمبر جسے خدائے متعال نے شریعت اورآسمانی کتاب کے ساتھ عالم بشریت میں بھیجا،حضرت نوح علیہ السلام تھے۔

حضرت نوح علیہ السلام لوگوں کوتوحید، یکتا پرستی کی ترغیب اورشرک وبت پرستی سے پرہیز کرنے کی دعوت دیتے تھے۔چنانچہ قرآن مجید میں ان کے قصوں سے واضح ہے کہ طبقاتی اختلافات کوختم کرنے اورظلم وستم کو جڑ سے اکھاڑنے کے لئے آپ ؑ سخت جہاد ومبارزہ کرتے تھے اوراستدلال کے زریعہ جواس زمانہ کے لوگوں کے لئے نیا تھا،اپنی تعلیمات پہنچاتے تھے۔

آپ ؑ نے ایک طولانی مدت تک جاہل،ضدی اورسرکش لوگوں سے دست بگریبان ہونے کے بعدایک چھوٹے گروہ کی ہدایت کی اورخدائے متعال نے ایک طوفان کے ذریعہ کفارکو ہلاک کرکے زمین کوان کے ناپاک وجود سے پاک فرمایا۔حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے کچھ پیرووں کے ساتھ نجات پانے کے بعد دنیامیں ایک نئے دینی معاشرہ کی بنیاد ڈالی۔

یہ معزز پیغمبر،شریعت توحید کے بانی اورخدا کے پہلے کچھ مور ہیں،کہ جنھوں نے ظلم وستم اور سرکشی کا مقابلہ کیااوردین حق وحقیقت کی عظیم خدمت کی لہذا خدائے متعال کی طرف سے خاص درودوسلام کے مستحق قرار پائے اوررہتی دنیا تک زندہ وپائندہ رہیں گے:

(سلٰم علی نوحٍ فی العٰلمین) (صافات۷۹)
ساری خدائی میں نوح پر ہمارا سلام

۲۔حضرت ابراہیم علیہ السلام

حضرت نوح علیہ السلام کے بعد ایک طویل عرصہ گزر چکا تھا۔اوراس عرصہ میں اگر چہ بہت سے انبیاء جیسے حضرت ہود علیہ السلام ،حضرت صالح علیہ السلام اوران کے علاوہ دوسرے انبیاءلوگوں کی خدائے متعال اورحق کی طرف رہنمائی فرماتے رہے،لیکن پھربھی دن بدن شر ک وبت پرستی کا بازارگرم ہوتا جارہا تھا ، یہاں تک کہ تمام عالم میں بت پرستی پھیل گئی اورخدائے متعال نے اپنی حکمت سے حضرت ابراھیم علیہ السلام کومبعوث فرمایا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام فطری انسان کےایک کامل نمونہ تھے۔آپ نے پاک وبےآلائش فطرت سےحقیقت کے لئے جستجو کرکے خالق کائنات کی وحدانیت کو پایا اوراپنی زندگی کے آخری لمحات تک شرک وظلم سےلڑتے رہے۔

جیسا کہ قرآن مجید سے ثابت ہے اوراہل بیت کی روایتیں بھی دلالت کرتی ہیں،کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بچپن شہر کےشوروغل سے دورایک غار میں گزرا۔آپ کی ملاقات صرف کبھی کبھی اپنی والدہ سے اس وقت ہوتی تھی جب وہ آپ کے لئے کھانا پانی لے کرآتی تھیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک دن اپنی والدہ کے ساتھ غار سے باہر نکلے اورشہر تشریف

لائے۔اور اپنے چچا آزر کے پاس گئے، وہ جو چیز بھی دیکھتے تھے وہ ان کے لئے نئی اور حیرت انگیز ہوتی تھی۔ان کی پاکیزہ فطرت ہزاروں حیرت وتعجب کے عالم میں بڑی بے چینی و بے تابی کے ساتھ ان چیزوں کی خلقت کی طرف متوجہ تھی جن کا وہ مشاہدہ کرتے تھے اور وہ ان کی تخلیق کے اسرار تک پہنچنے کی جستجو میں تھے، جب انہوں نے ان بتوں کو دیکھا کہ جنہیں آزر اور دوسرے لوگوں نے تراشا تھا اور وہ ان کی پرستش کرتے تھے۔تو انکی حقیقت کے بارے میں سوال کیا لیکن ان بتوں کے رب ہونے کے بارے میں جو وضاحت کی جاتی تھی وہ اس سے مطمئن نہیں ہوتے تھے۔

جب حضرت ابراہیم نے کچھ لوگوں کو ستارۂ زہرہ، کچھ لوگوں کو چاند اور کچھ لوگوں کو سورج کی پوجا کرتے ہوئے پایا، جو کہ ایک مدت کے بعد ڈوب جاتے تھے، تو آپ نے ان کے رب ہونے کو قبول نہ کیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کے بعد خدائے واحد کی پرستش اور شرک سے اپنی بیزاری کا لوگوں میں بلا خوف اعلان کر دیا اور اب وہ بت پرستی اور شرک سے مقابلہ کرنے کے علاوہ کسی اور چیز کے بارے میں نہیں سوچتے تھے۔بت پرستوں کے ساتھ انتھک مقابلہ کرتے اور ان کو توحید کی طرف دعوت دیتے تھے۔

آخر کار ایک بت خانہ میں داخل ہوئے اور بتوں کا توڑنا ان لوگوں میں سب سے بڑا جرم شمار ہوتا تھا آپ کے خلاف مقدمہ دائر کیا گیا۔مقدمہ کی سماعت کے بعد آپ کو آگ میں جلانے کی سزا سنادی گئی، کارروائی مکمل کرنے کے بعد آپ کو آگ میں ڈال دیا گیا، لیکن خدائے

متعال نے آپ کی حفاظت فرمائی اور آپ آگ سے صحیح وسالم باہر نکل آئے۔
حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کچھ مدت کے بعد اپنی جائے پیدائش ملک بابل سے سرزمین شام اور فلسطین کی طرف ہجرت کی اور اس علاقہ میں اپنی دعوت کو جاری رکھا۔
زندگی کے آخری ایام میں خدائے متعال نے آپ کو دو فرزند عطا کئے۔ان میں سے ایک حضرت اسحاق تھے جو اسرائیل کے والد اور دوسرے اسماعیل تھے جو مصری عرب کے باپ ہیں۔
حضرت ابراہیم نے حضرت اسماعیل کو شیر خواری کے ایام میں ہی خدا کے حکم سے ان کی والدہ کے ہمراہ حجاز لے جا کر تہامہ کے پہاڑوں کے بیچ میں ایک بے آب وگیاہ اور باشندوں سے خالی سرزمین میں چھوڑ دیا، اس طرح صحرانشین عربوں کو توحید کی دعوت دی۔اس کے بعد خانہ کعبہ کی سنگ بنیاد ڈالی اور اعمال حج انجام دینے کا تشرع فرمایا کہ اسلام کے ظہور اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت تک یہ عمل عربوں میں رائج تھا۔
حضرت ابراہیم علیہ السلام قرآن مجید کی نص کے مطابق دین فطرت کے حامل تھے۔آپ وہ پہلے شخص ہیں کہ جس نے خدا کے دین کو اسلام اور اس کے پیروؤں کو مسلمین کہا، اور دنیا میں ادیان توحید یعنی یہودیت ،نصرانیت اور اسلام آپ پر منتہی ہوتے ہیں، کیونکہ ان تینوں ادیان کے پیشوا حضرت موسیٰ کلیم ،حضرت عیسیٰ مسیح اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور یہ سب دعوت دینے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نقش قدم پر تھے۔

۳۔حضرت موسی کلیم اللہ علیہ السلام

حضرت موسی بن عمران علیہ السلام تیسرے اولوالعزم پیغمبر اور صاحب کتاب وشریعت ہیں۔آپ اسرائیل (یعقوب) کی اولاد میں سے ہیں۔

حضرت موسی علیہ السلام کی زندگی شوروغل سے بھری ہوئی تھی۔آپ کی پیدائش کے وقت بنی اسرائیل مصر میں قبطیوں کے درمیان ذلت واسیری کی زندگی گزارر ہے تھے اور فرعون (۱) کے حکم سے بچوں کے سرقلم کئے جارہے تھے۔

حضرت موسی علیہ السلام کی ماں کوخواب میں جو حکم دیا گیا تھا اس کے مطابق موسی کولکڑی کے ایک صندوق میں رکھ کر دریائے نیل میں ڈال دیا۔پانی نے صندوق کو بہا کر فرعون کے محل کے قریب پہنچادیا۔فرعون کے حکم سے صندوق کو پانی سے نکالا گیا، جب صندوق کو کھولا گیا تو اس میں ایک خوبصورت بچے کو پایا گیا۔

فرعون نے ملکہ کے اصرار پر بچے کوقتل نہیں کیا،اور چونکہ وہ لا ولد تھا،لہذا اسے اپنا بیٹا بنالیا اور دایہ کے حوالہ کیا گیا اتفاق سے وہی اس کی ماں تھی۔

حضرت موسی علیہ السلام ابتدائے جوانی تک فرعون کے دربار میں تھے۔اس کے بعد ایک قتل کے حادثہ کی وجہ سے فرعون سے ڈر کر،مصر سے بھاگ کر مداین چلے گئے اور وہاں پر حضرت شعیب پیغمبر علیہ السلام سے ملاقات ہوئی اور حضرت شعیب کی ایک بیٹی سے شادی کی۔

کئی سال تک حضرت شعیب کی بھیڑ بکریوں کو چراتے رہے۔ایک دن انھیں اپنے وطن کی یادآئی۔اپنے اہل وعیال اور ساز وسامان کے ساتھ راہی مصر ہوئے ۔اس سفر کے دوران

جب رات کے وقت طور سینا پہنچے تو خدائے متعال کی طرف سے رسالت کے عہدہ

۱۔مصر میں بادشاہ کو (فرعون) کہتے تھے۔

پر فائز ہوئے اور آپ کو مامور کیا گیا کہ فرعون کو دین توحید کی دعوت دیں اور بنی اسرائیل کو قبطیوں سے نجات دلائیں اور اپنے بھائی ہارون کو اپنا وزیر قرار دیں۔

لیکن اپنے فریضہ کو انجام دینے اور پیغام الٰہی کو پہنچانے کے بعد فرعون، جو کہ بت پرست تھا اور خود کو خدا کہتا تھا، نے آپ کی رسالت اور دعوت کو مسترد کر دیا اور بنی اسرائیل کی آزادی کا ضامن نہیں ہوا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سالہا سال تک لوگوں کو توحید کی دعوت دی اور بہت سے معجزے دکھائے لیکن اس کے باوجود فرعون اور اس کی قوم ان کے ساتھ سختی اور تند مزاجی کا مظاہرہ کرتی رہی۔ یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام خدا کے حکم سے بنی اسرائیل کے ہمراہ رات کے اندھیرے میں مصر سے کوچ کر کے صحرائے سینا کی طرف چلے گئے۔ جب وہ بحر احمر پہنچے تو فرعون کو یہ معلوم ہو گیا اور اس نے اپنے لشکر کے ساتھ ان کا پیچھا کیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے معجزہ کے ذریعہ سمندر کو شگافتہ کیا اور اپنی قوم کے ساتھ پانی سے گزر گئے ،لیکن فرعون اور اس کا لشکر غرق ہو گیا۔اس واقعہ کے بعد خدائے متعال نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر توریت نازل فرمائی اور بنی اسرائیل میں کلیمی شریعت کو نافذ کیا۔

۴۔حضرت عیسی مسیح علیہ السلام

حضرت مسیح اولوا العزم اور صاحب کتاب و صاحب شریعت پیغمبروں میں سے چوتھے پیغمبر ہیں۔آپ کی پیدائش غیر معمولی تھی۔آپ کی والدہ حضرت مریم،ایک مقدس و پارسا دوشیزہ تھیں جو بیت المقدس میں عبادت کرنے میں مشغول تھیں کہ خدا کی طرف سے روح القدس آپ پر نازل ہوئے اور حضرت مسیح کی بشارت دی پھر ان کی آستین میں پھونک ماری کہ جس سے وہ حاملہ ہو گئیں۔

حضرت مسیح نے پیدا ہونے کے بعد اپنی ماں پر لوگوں کی طرف سے لگائی جانے والی تہمتوں کا جواب گہوارہ میں دیا اور اپنی والدہ کا دفاع کیا اور اپنی نبوت اور کتاب کے بارے میں لوگوں کو خبر دی۔اس کے بعد جوانی میں لوگوں کو دعوت دینے میں مشغول ہوئے اور حضرت موسی کی شریعت میں تھوڑی سی تبدیلی کر کے اسے زندہ کیا۔آپ اپنے حواریوں کو اسلام کے مبلّغ کی حیثیت سے مختلف علاقوں میں بھیجتے تھے۔

ایک مدت کے بعد جب ان کی دعوت پھیل گئی،تو یہودی (آپ کی قوم) آپ کو قتل کرنے کے درپے ہو گئے،لیکن خدائے متعال نے آپ کو نجات دی اور یہودیوں نے آپ کی جگہ پر کسی اور کو پکڑ کر سولی پر چڑھا دیا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ خدائے متعال نے قرآن مجید میں حضرت عیسی علیہ السلام پر نازل ہونے والی کتاب کا نام انجیل بیان کیا ہے،یہ انجیل ان انجیلوں کے علاوہ ہے،جو آپ کے بعد آپ کی سیرت اور دعوت کے بارے میں لکھی گئی ہیں۔ان میں سے چار انجیلیں

لوقا، مرقس، متی، اور یوحنا کی تالیف رسمی طور پر قبول کی گئی ہیں۔

ہ۔خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۵۷۰ء میں ہجرت سے ۵۳ سال پہلے حجاز کے ایک شریف و نجیب ترین عرب خاندان (بنی ہاشم) میں پیدا ہوئے۔

جیسا کہ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں دنیا حیرت انگیز حد تک اخلاقی گراوٹ سے دو چار تھی اور دن بدن جہل و نادانی کے بھنور میں پھنس کر اس کی حالت بد سے بدتر ہوتی جارہی تھی اور ہر لحہ انسانی معنویات سے دور ہوتی جارہی تھی۔خاص کر جزیرہ نمائے عرب ،جس کے اکثر باشندے صحرانشین تھے اور قبیلوں کی صورت میں زندگی بسر کرتے تھے،تمام شہری حقوق سے محروم تھے۔وہ لوگ کچھ خرافی اور بیہودہ افکار (من جملہ اپنے ہاتھوں سے پتھر ،لکڑی اور کبھی خشک دہی کے بنائے گئے بتوں کی پرستش) میں زندگی گزارتے تھے۔اور اپنے اسلاف کی تقلید کرنے ،لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت کے علاوہ کسی قسم کا فخر ومباہات نہیں رکھتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ،ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کے والد گرامی عبداللہ اس دنیا سے رحلت کر گئے اور چار سال کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کی

والدہ کا بھی انتقال ہو گیا۔لہذا آپ کی پرورش کی ذمہ داری آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کے دادا عبدالمطلب نے سنبھالی ۔تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اپنے دادا سے بھی محروم ہو گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کے چچا حضرت ابو طالب آپ کو اپنے گھر لے گئے اور اپنے ایک بیٹے کی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کو پالا۔

مکہ کے عرب دوسرے عربوں کی مانند بھیڑ بکری اور اونٹ پالتے تھے اور کبھی اپنے ہمسایہ ممالک بالخصوص شام کے ساتھ تجارت بھی کرتے تھے۔ یہ لوگ ان پڑھ تھے اور اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کے لئے کوئی اہتمام نہیں کرتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر چہ ان کے درمیان زندگی گزار رہے تھے۔لیکن بچپن سے ہی کچھ پسندیدہ اوصاف کی وجہ سے معاشرے میں امتیازی حیثیت کے مالک تھے،آپ صلی اللہ علیہ وآلہ ہرگز بتوں کی پرستش نہیں کرتے تھے،جھوٹ نہیں بولتے تھے، چوری اور خیانت نہیں کرتے تھے، برے ناپسند اور نا مناسب کام انجام دینے سے پرہیز کرتے تھے،عقل وشعور رکھتے تھے،اسی لئے تھوڑے ہی عرصہ میں لوگوں کے درمیان قابل توجہ محبوبیت حاصل کر لی اور محمد امین کے نام سے مشہور ہوئے، چونکہ عرب اپنی امانتوں کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کے سپرد کرتے تھے اور آپ کی امانتداری اور لیاقت کی تعریفیں کرتے تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ تقریباً بیس سال کے تھے کہ مکہ کی ایک دولت مند عورت (خدیجہ کبریٰ) نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کو اپنی تجارت کے کارندہ کی حیثیت سے معین کیا۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کی سچائی،اچھائی اور عقل ولیاقت کی وجہ سے اس کو تجارت میں کافی منافع

ملا اور فطری طور وہ پر آپ صلی اللہ علیہ و آلہ کی شخصیت سے متاثر ہوئی، اور آخر کار آپ صلی اللہ علیہ و آلہ کے ساتھ شادی کرنے کی پیش کش کی، آپ صلی اللہ علیہ و آلہ نے بھی اسے قبول کیا اور ان کے ساتھ شادی کی اور اس کے بعد بھی برسوں تک اپنی شریک حیات کے ساتھ تجارت میں مشغول رہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم چالیس برس تک لوگوں میں عام زندگی بسر کرتے تھے اور معاشرے کے ایک فرد کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے، فرق صرف اتنا تھا کہ آپ پسندیدہ اخلاق کے مالک تھے اور دسرے لوگوں کے مانند بد کرداری میں آلودہ نہیں تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ و آلہ میں ظلم، سنگدلی اور جاہ طلبی کا شائبہ تک نہیں تھا، اس وجہ سے لوگوں میں محترم اور قابل اعتماد تھے۔ جب عربوں نے خانہ کعبہ کی مرمت کرنا چاہی اور حجر اسود کو نصب کرنے کے بارے میں عرب قبائل کے درمیان اختلاف اور جھگڑا پیدا ہوا تو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ کو حَکَم قرار دیا اور آپ صلی اللہ علیہ و آلہ کے حکم سے ایک عبا کو پھیلا کر حجر اسود کو اس میں رکھا گیا اور قبائل کے سرداروں نے عبا کے اطراف کو پکڑ کر اٹھایا اور آپ صلی اللہ علیہ و آلہ نے اپنے ہاتھوں سے حجر اسود کو اس کی جگہ پر نصب فرمایا اور اس طرح قبائل کے درمیان کشمکش، لڑائی جھگڑا اور احتمالی خونریزی کا خاتمہ ہوا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ بعثت سے پہلے اگرچہ خدائے یکتا کی پرستشکرتے تھے اور بت پرستی سے اجتناب کرتے تھے، لیکن بت پرستی کے عقائد سے مقابلہ نہیں کرتے تھے اس لئے لوگ آپ سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے۔ اس زمانے میں دوسرے ادیان کے پیرو جیسے

یہود ونصاری بھی عربوں میں محترمانہ طور پر زندگی گزارتے تھے اور اعراب ان کے لئے بھی کوئی مزاحمت ایجاد نہیں کرتے تھے۔

بحیرا راہب کا قصہ

جن دنوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ اپنے چچا حضرت ابوطالب کے ہاں زندگی بسر کررہے تھے اور ابھی بالغ نہیں ہوئے تھے، ان دنوں حضرت ابوطالب تجارت کی غرض سے شام گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔

ایک بڑا قافلہ تھا، کافی مال تجارت کے ساتھ لوگوں کی ایک بڑی تعداد تھی، قافلہ سرزمین شام میں داخل ہوا اور شہر بصری میں پہنچا، ایک دَیر کے قریب پڑاو ڈالا اور خیمے نصب کر کے آرام کرنے لگے۔

ایک راہب جس کا لقب بحیرا دَیر سے باہر آیا اور قافلہ کی دعوت کی، سب نے بحیرا کی دعوت قبول کی اور دیر میں گئے۔ حضرت ابوطالب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ کو سامان کے پاس بیٹھا کر دوسرے لوگوں کے ساتھ بحیرا کی دعوت پر گئے۔

بحیرا نے پوچھا: کیا سب آ گئے؟

ابوطالب نے کہا: سب سے چھوٹے ایک نوجوان کے علاوہ سب لوگ آ گئے ہیں۔

بحیرا نے کہا: اسے بھی لے کے آیئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ زیتون کے ایک درخت کے نیچے کھڑے تھے، حضرت ابوطالب

نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کو بلایا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ بھی راہب کے پاس آ گئے۔

بحیرا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ پر ایک گہری نظر ڈالنے کے بعد کہا: میرے قریب آجاو ،میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ کو ایک طرف لے گیا۔حضرت ابو طالب بھی ان کے پاس گئے۔

بحیرا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ سے کہا: آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں اور تم کو لات وعزی کی قسم دیتا ہوں کہ جواب ضرور دینا۔(لات وعزّیٰ دو بتوں کے نام ہیں کہ جن کی مکہ کے لوگ پرستش کرتے تھے)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ نے فرمایا: سب سے زیادہ میں ان دونوں بتوں سے نفرت کرتا ہوں۔

بحیرا نے کہا: تم کو خدائے یکتا کی قسم دیتا ہوں سچ کہنا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ نے فرمایا: میں ہمیشہ سچ بولتا ہوں اور کبھی جھوٹ نہیں بولتا ہوں آپ اپنا سوال کیجئے۔

بحیرا نے پوچھا: کس چیز کو سب سے زیادہ پسند کرتے ہو؟

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ نے فرمایا: تنہائی کو۔

بحیرا نے پوچھا: کس چیز پر زیادہ نظر ڈالتے ہو اور اسے دیکھنا پسند کرتے ہو۔؟

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ نے فرمایا: آسمان اور اس میں موجود ستاروں کو۔

بحیرا نے پوچھا: کیا سوچ رہے ہو؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ نے خاموشی اختیار کی لیکن بحیرا بغور اور سنجیدگی کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کی پیشانی کو دیکھتا رہا۔

بحیرا نے کہا: کس وقت اور کس فکر میں سوتے ہو؟

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ نے فرمایا: اس وقت جب آنکھیں آسمان پر جمائے ہوتا ہوں اور ستاروں کو دیکھتا ہوں، انھیں اپنی آغوش میں اور خود کو ان کے اوپر پاتا ہوں۔

بحیرا نے کہا: کیا خواب بھی دیکھتے ہو؟

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ نے فرمایا: جی ہاں، جو خواب میں دیکھتا ہوں، اسے بیداری میں بھی دیکھتا ہوں۔

بحیرا نے کہا: مثلا، خواب میں کیا دیکھتے ہو؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ: نے خاموشی اختیار کی اور بحیرا بھی خاموش رہا۔

تھوڑی دیر رکنے کے بعد بحیرا نے پوچھا: کیا میں آپ کے دونوں شانوں کے درمیان دیکھ سکتا ہوں؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ اپنی جگہ سے اٹھے بغیر بولے: آؤ اور دیکھ لو۔

بحیرا اپنی جگہ سے اٹھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کے قریب آیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ کے شانوں سے لباس ہٹایا، ایک سیاہ تل نظر آیا، ایک نظر ڈال کر زیر لب بولا: وہی ہے!

ابوطالب نے پوچھا: کون ہے؟ کیا کہتے ہو؟

بحیرا نے کہا: ایک علامت جس کی ہماری کتابوں میں خبر دی گئی ہے۔

ابوطالب نے پوچھا: کون سی علامت؟

بحیرا نے دریافت کیا: اس جوان سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟

ابوطالب چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کو اپنے بیٹے کی طرح چاہتے تھے، اس لئے بولے: یہ میرا بیٹا ہے۔

بحیرا نے کہا: نہیں، اس جوان کا باپ مر چکا ہونا چاہئے۔

ابوطالب نے پوچھا: تم کیسے جانتے ہو؟ جی ہاں یہ جوان میرا بھتیجا ہے!

بحیرا نے ابوطالب سے کہا: سن لو، اس جوان کا مستقبل اتنا درخشان اور حیرت انگیز ہے، کہ جو میں نے دیکھا ہے اگر اسے دوسرے دیکھ لیں گے اور اسے پہچان لیں گے تو اسے قتل کر ڈالیں گے، اسے دشمنوں سے مخفی رکھنا اور اس کی حفاظت کرنا۔

ابوطالب نے کہا: بتاؤ وہ کون ہے؟

بحیرا نے کہا: اس کی آنکھوں میں ایک عظیم پیغمبر کی علامت اور اس کی پشت پر اس کی واضح نشانی ہے۔

نسطورا راہب کا قصہ

چند برسوں کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ حضرت خدیجہ کبریٰ کی تجارت کے کارندے کی حیثیت سے ان کا مال لیکر دوبارہ شام گئے۔ حضرت خدیجہ نے میسرہ نامی اپنے ایک غلام کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کے ہمراہ بھیجا اور اس سے تاکید کی کہ مکمل طور پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ

کی اطاعت کرے ۔اس سفر میں بھی جب قافلہ شام کی سرزمین پر پہنچا،تو شہر بصری کے نزدیک ایک درخت کے نیچے پڑاؤ ڈالا، وہاں قریب میں نسطورا نامی ایک راہب کی عبادت گاہ تھی، جسے میسرہ پہلے سے جانتا تھا۔

نسطورا نے میسرہ سے پوچھا: درخت کے نیچے سویا ہوا کون ہے؟

میسرہ نے کہا: قریش سے ایک مرد ہے۔

راہب نے کہا: اس درخت کے نیچے اب تک کوئی نہیں ٹھہرا ہے اور نہ ٹھہرے گا،مگر یہ کہ خدا کے پیغمبروں میں سے ہو۔

اس کے بعد پوچھا: کیا اس کی آنکھوں میں سرخی ہے؟

میسرہ نے کہا: جی ہاں،اس کی آنکھیں ہمیشہ اسی حالت میں ہوتی ہیں۔

راہب نے کہا: یہ وہی ہے اور وہ خدا کے پیغمبروں میں سے آخری پیغمبر ہے، کاش میں اس دن کو دیکھتا،جس دن وہ دعوت پر مامور ہوں گے۔

حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخری پیغمبر ہیں،جنھیں خدائے متعال نے لوگوں کی ہدایت کے لئے دنیا میں بھیجا ہے۔

چودہ سو سال پہلے، عالم بشریت ایک ایسی حالت سے گزر رہی تھی کہ جب دین اور توحید کا صرف نام باقی تھا۔لوگ یکتا پرستی اور خدا شناسی سے بالکل دور ہو چکے تھے۔معاشرے سے

انسانیت کے آداب اور عدالت ختم ہوچکی تھی۔ جزیزہ نمائے عرب، میں خانہ خدا اور دین ابراہیم کا مرکز ہونے کے باوجود، کعبہ شریف بت خانہ میں اور دین ابراہیم بت پرستی میں تبدیل ہو چکا تھا۔

عربوں کی زندگی، قبیلوں پر مشتمل تھی، یہاں تک کہ چند شہر جو حجاز اور یمن وغیرہ میں تھے، اسی ترتیب سے چلائے جاتے تھے۔ دنیائے عرب بدترین حالات سے گزر رہی تھی تہذیب و تمدن کے بجائے ان میں بے حیائی، عیاشی، شراب نوشی اور جوا کھیلنا رائج تھا۔ لڑکیوں کو زندہ دفن کیا جاتا تھا۔ لوگوں کی زندگی اکثر چوری، ڈاکہ زنی، قتل اور مال مویشوں کو لوٹ کر چلائی جاتی تھی۔ ظلم و ستم اور خونریزی کو سب سے بڑا فخر سمجھا جاتا تھا۔

خدائے متعال نے ایسے ماحول میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دنیا کی اصلاح اور رہبری کے لئے مبعوث فرمایا اور قرآن مجید کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ پر نازل کیا۔ جس میں حق شناسی کے معارف، انصاف کے نفاذ کے طریقے اور مفید نصیحتیں موجود ہیں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ کو مامور فرمایا تا کہ آسمانی سند سے لوگوں کو انسانیت اور حق پیروی کرنے کی دعوت دیں۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعثت سے پہلے بت پرستی کے ماحول میں زندگی بسر کرنے کے باوجود کبھی بتوں کی تعظیم میں سر تسلیم خم نہیں کیا اور ہمیشہ خدائے یکتا کی پرستش کرتے رہے، کبھی مکہ کے نزدیک واقع غار حرا میں جاتے تھے اور لوگوں کے شور و غوغا سے دور اپنے پروردگار سے مناجات کرتے تھے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی عمر شریف کے چالیس سال گزارنے کے بعد پروردگار عالم کی طرف سے مقام

رسالت وپیغمبری پر مبعوث ہوئے تو قرآن مجید کا پہلا سورہ (قرء باسم ربّک) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ پر نازل ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ لوگوں کی دعوت وتبلیغ پر مامور ہوئے۔ابتدائی مرحلہ میں جو ماموریت ذمہ داری آپ صلی اللہ علیہ وآلہ پر تھی وہ یہ تھی کہ دعوت کو مخفی طور پر شروع کریں۔

سب سے پہلے جو شخص آپ صلی اللہ علیہ وآلہ پر ایمان لایا وہ حضرت علی بن ابیطالب علیہ السلام تھے، وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کے گھر میں زندگی بسر کرتے تھے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود ان کی تربیت فرماتے تھے، حضرت علی کے بعد حضرت خدیجہ کبریٰ سلام اللہ علیہا نے اسلام قبول کیا۔ایک مدت تک یہ دونوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ کے ساتھ نماز پڑھتے رہے جبکہ اس وقت دوسرے لوگ شرک وکفر میں زندگی بسر کررہے تھے، کچھ دنوں کے بعد تھوڑے سے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ پر ایمان لائے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تین سال کے بعد خدا کی طرف سے حکم ہوا کہ اعلانیہ طور پر دعوت دیں اور اپنے رشتہ داروں سے اس کا آغاز کریں۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ نے اس حکم کے مطابق اپنے تمام رشتہ داروں کو جمع کیا اور ان کے سامنے اپنی رسالت کا اعلان کیا اور یہ بشارت دی کہ جو بھی ان میں سب سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کی دعوت کو قبول کرے گا وہی آپ کا جانشین ہوگا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ نے اس اعلان کو تین بار دوہرایا لیکن ان میں سے کسی نے قبول نہیں کیا، بلکہ ہر بار صرف حضرت علی علیہ السلام اٹھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اپیل کو قبول کیا۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی حوصلہ افزائی

فرمائی ۔ اور ان کو اپنا جانشین بنانے کا وعدہ کیا۔آخر میں ان لوگوں نے کھڑے ہو کر ہنسی اڑاتے ہوئے حضرت ابو طالب سے مخاطب ہو کر کہا : اس کے بعد تمہیں اپنے فرزند کی اطاعت کرنی چاہیئے پھر وہ لوگ چلے گئے ۔

اسکے بعد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعلانیہ طور پر عام دعوت کا آغاز کیا،لیکن لوگوں سے شدید،سخت،عجیب اور نا قابل برداشت مقابلہ کرنا پڑا۔مکہ کے لوگ اپنے وحشیانہ مزاج اور اپنی بت پرستی کی عادت کی وجہ سے دشمنی اور ضد پر اتر آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ اور آپ کے پیروؤں کو جسمانی اذیت پہنچانے،مضحکہ اور توہین کرنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھتے تھے اور ہر روز اپنی بیوقوفی اور سختی میں اضافہ کرتے تھے۔

جتنا لوگوں کی طرف سے سختی اور دباؤ بڑھتا جا رہا تھا،اتنا ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ بھی اپنی دعوت میں صبر واستقامت،اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے اور اسلام کے پیروؤں میں تدریجاً اضافہ ہوتا رہالہذا کفار نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لالچ دینا شروع کی کہ انہیں کافی مال ودولت دیں گے یا انھیں حاکم کے طور پر منتخب کریں گے تا کہ وہ اپنی دعوت سے دست بردار ہو جائیں یا صرف اپنے خدا کی طرف دعوت دیں اور ان کے خداؤں کو نہ چھیڑیں۔لیکن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی تجویز کو ٹھکرا دیا اور اس خدائی فریضہ کو انجام دینے اور دعوت کو جاری رکھنے کے اپنے مستحکم عزم وارادے کا اعلان کیا۔

کفار جب طمع ولالچ کے راستے سے ناامید ہو گئے تو انہوں نے دوبارہ اپنے دباؤ میں اضافہ

کیا اور مسلمانوں کو سخت جسمانی اذیتین تکلیفیں پہنچانے لگے اور کبھی ان میں سے کچھ کو قتل کر تے تھے تا کہ انھیں اسلام سے روک سکیں ۔کفار نے قبیلہء بنی ہاشم کے سردار حضرت ابو طالب کے لحاظ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کرنے سے اجتناب کیا ،لیکن یہ لحاظ دوسری اذیتوں اور تکلیفوں کو روک نہ سکا۔

ایک مدت کے بعد مسلمانوں کا عرصہء حیات اور تنگ ہو گیا اور ظلم وستم اپنی انتہا کو پہنچ گیا حالت یہ ہوگئی تھی کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دیدی تا کہ کچھ دنوں تک آرام کی سانس لے لیں ۔ایک جماعت نے حضرت علی کے بھائی حضرت جعفر بن ابیطالب کی سرکردگی میں اپنے اہل وعیال کے ہمراہ حبشہ کی طرف ہجرت کی (جعفر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ کے منتخب صحابیوں میں سے تھے)۔

کفار مکہ جب مسلمانوں کی ہجرت سے آگاہ ہوئے تو انہوں نے اپنے دو تجربہ کار افراد کو کافی مقدار میں تحفہ وتحائف کے ساتھ حبشہ کے بادشاہ کے پاس بھیجا ،اورانہوں نے بادشاہ سے مکہ کے مہاجرین کو واپس بھیجنے کا تقاضا کیا ،لیکن جعفر بن ابیطالب نے اپنے بیانات سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سراپا نورانی شخصیت اور اسلام کے بلند اصولوں کی حبشہ کے بادشاہ ،مسیحی پادریوں اور ملک کے حکام کے سامنے تشریح کی اور سورۂ مریم کی چند آیتوں کی تلاوت فرمائی۔

حضرت جعفر بن ابیطالب کا حق پر مبنی یہ بیان ایسا دلچسپ وموثر تھا کہ بادشاہ اور مجلس میں

موجود تمام لوگوں نے آنسو بہائے۔نتیجہ میں بادشاہ نے کفار مکہ کے تقاضا کو مسترد کیا اور ان کے بھیجے ہوئے تحفوں کو واپس کر دیا اور حکم دیا کہ مسلمان مہاجرین کے آرام وآسائش کے تمام امکانات فراہم کئے جائیں۔

کفار مکہ نے اس روئداد کے بعد آپس میں معاہدہ کیا کہ بنی ہاشم، جو پیغمبر اسلام کے رشتہ دار تھے ،اور ان کے حامیوں کے ساتھ قطع تعلق کر کے مکمل طور پر سوشل بائیکاٹ کریں، اس سلسلہ میں انہوں نے ایک عہد نامہ لکھا اور عام لوگوں سے دستخط لے کر اسے کعبہ میں رکھا۔

بنی ہاشم، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ مکہ سے باہر جانے پر مجبور ہوئے اور شعب ابوطالب نامی کے ایک درہ میں پناہ لی اور انتہائی سختی اور بھوک میں زندگی بسر کرتے تھے۔

اس مدت کے دوران کسی نے شعب ابوطالب سے باہر آنے کی جرائت تک نہیں کی، دن میں شدید گرمی اور رات کو عورتوں اور بچوں کی فریادوں سے دست وگریبان تھے۔

کفار تین سال کے بعد عہد نامہ کے محو ہونے اور بہت سے قبائل کی طرف سے ملامتوں کے نتیجہ میں اپنے معاہدہ سے دست بردار ہوئے اور بنی ہاشم کا محاصرہ ختم ہوا ،لیکن انہی دنوں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تنہا حامی حضرت ابوطالب اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ کی شریک حیات حضرت خدیجہ کبری کا انتقال ہو گیا۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے اور مشکل ہو گئی۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ میں یہ طاقت نہیں رہی کہ لوگوں کے درمیان جائیں یا خود کو کسی کے سامنے ظاہر کریں یا کسی خاص جگہ پر رہیں۔یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کی جان کی کوئی حفاظت نہیں تھی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طائف کی طرف سفر

جس سال پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور بنی ہاشم شعب ابو طالب کے محاصرہ سے باہر آئے ،وہ بعثت کا تیرھواں سال تھا۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان ہی دنوں شہر طائف کی طرف سفر کیا۔(طائف مکہ سے تقریبا سو کلو میٹر کی دوری پر ایک شہر ہے) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ صلی اللہ علیہ وآلہ نے طائف کے باشندوں کو اسلام کی دعوت دی ،لیکن اس شہر کے جاہل ہر طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ پر حملہ آور ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ و آلہ کو برا بھلا کہا ،سنگسار کیا اور آخر کار آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ کو شہر سے باہر نکال دیا گیا

۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم طائف سے مکہ لوٹے اور کچھ مدت تک مکہ میں رہے ،چونکہ وہاں پر جان کی کوئی حفاظت نہیں تھی ،اس لئے لوگوں کے درمیان نہیں آتے تھے۔کفار مکہ کے سردار اور بزرگ شمع رسالت کو گل کرنے کی خاطر مناسب فرصت کو دیکھتے ہوئے ،دار الندوہ۔جو مجلس شوری کے مانند تھا۔میں جمع ہوئے اور ایک مخفیانہ مٹینگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کرنے کا آخری منصوبہ بنایا۔

مذکورہ منصوبہ یہ تھا کہ قبائل عرب کے ہر قبیلہ سے ایک شخص کو چن لیا جائے اور تمام منتخب افراد ایک ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر پر حملہ کر کے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کو قتل

کرڈالیں۔اس منصوبہ میں تمام قبائل کوشریک کرنے کا مقصود یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ کا قبیلہ بنی ہاشم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کے خون کا بدلہ لینے کے لئے قیام نہ کرسکئے اورقتل کا منصوبہ بنانے والوں سے نہ لڑ سکے۔اوراسی طرح بنی ہاشم میں سے ایک آدمی کوشریک کرکے قبیلۂ بنی ہاشم کی زبان مکمل طور پر بند کردی۔

اس فیصلے کے مطابق ،مختلف قبائل کے تقریبا چالیس افراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ کے قتل کے لئے منتخب ہوئے ،انہوں نے رات کے اندھیرے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ کے گھر کا محاصرہ کیا ،حملہ آورسحر کے وقت گھر میں داخل ہوئے تاکہ منصوبہ کوعملی جامہ پہنائیں،لیکن ارادۂ الٰہی ان کے ارادہ سے بلند ہے، کہ جس سے ان کے منصوبہ پر پانی پھر گیا ۔خدائے متعال نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی کئی اور کفار کے منصودبہ سے آگاہ فرمایااور حکم فرمایا کہ راتوں رات مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کریں۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واقعہ کی روداد سے حضرت علی علیہ السلام کوآگاہ فرمایااور حکم دیا کہ رات کوآپ صلی اللہ علیہ وآلہ کے بستر پرسوجائیں اوران سے کچھ وصیتیں کیں اور رات کے اندھیرے میں گھر سے باہر نکلے،راستے میں حضرت ابوبکرکودیکھا،انھیں بھی اپنے ساتھ مدینہ لے کر گئے۔مدینہ کے کچھ بزرگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ کی ہجرت سے پہلے مکہ آکرآپ صلی اللہ علیہ وآلہ سے ملاقات کی اورآپ پر ایمان لائے تھے اورضمناً ایک عہدنامہ لکھا تھا کہ اگرآنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ تشریف لائیں تو وہ ان کی حمایت میں ایسے ہی دفاع کریں گے جیساوہ اپنی جان وعزت کا دفاع کرتے ہیں۔

مدینہ کے یہودیوں کی بشارت

یہودیوں کے بہت سے قبیلوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ کے اوصاف اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کی جگہ کے بارے میں اپنی کتابوں میں پڑھا تھا اور اپنے وطن کو ترک کر کے حجاز آ کر مدینہ اور اس کے اطراف میں پڑاؤ ڈالا تھا اور نبی امی کے ظہور کا انتظار کر رہے تھے۔ چونکہ وہ لوگ دولت مند تھے، اس لئے اعراب کبھی کبھی ان پر حملہ کر کے ان کے مال و دولت کو لوٹ لیتے تھے۔

یہودی ہمیشہ مظلومیت کے عالم میں ان سے مخاطب ہو کر کہتے تھے: ہم تم لوگوں کے ظلم و ستم پر یہاں تک صبر کریں گے کہ نبی امی مکہ سے ہجرت کر کے اس علاقہ میں آ جائیں، اس دن ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ پر ایمان لا کر تم لوگوں سے انتقام لیں گے۔

اہل مدینہ کے فوراً ایمان لانے کے اہم عوامل میں سے ایک ان ہی بشارتوں کا ان کے ذہنوں پر اثر تھا، آخر کار وہ لوگ ایمان لے آئے۔ لیکن یہودیوں نے قومی تعصب کی بنا پر ایمان لانے سے گریز کیا۔

نبی کی بشارتوں کی طرف قرآن مجید کا اشارہ

خدائے متعال اپنے کلام پاک میں کئی جگہوں پر ان بشارتوں کی طرف اشارہ فرماتا، بالخصوص اہل کتاب کے ایک گروہ کے ایمان کے بارے میں فرماتا ہے۔

(الّذین یتّبعون الرّسول النّبی الامّی الّذی یجدونه مکتوباً عندھم فی التّوریة والانجیل یامرھم بالمعروف و ینھٰھم عن المنکر و یحلّ لھم الطّیبٰت ویحرّم علیھم الخبٰئث ویضع عنھم اصرھم و الاغلل الّتی کانت علیھم۔۔۔)

(اعراف۱۵۷)

جولوگ کہ رسول نبی امی کا اتباع کرتے ہو جس کا ذکر اپنے پاس توریت اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں کہ وہ نیکیوں کا حکم دیتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے اور پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دیتا ہے اور خبیث چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے اور ان پر سے احکام کے سنگین بوجھ اور قید و بند کو اٹھا دیتا ہے...

مزید فرماتا ہے:

(ولمّا جاء ھم کتب من عند الله مصدّق لما معھم و کانوا من قبل یستفتحون...) (بقرہ۹)

اور جب ان کے پاس خدا کی طرف سے کتاب آئی ہے جو ان کی توریت وغیرہ کی تصدیق بھی کرنے والی ہے اور اسکے پہلے وہ دشمنوں کے مقابلہ میں اسی کے ذریعہ طلب فتح بھی کرتے تھے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مدینہ میں ورود

اسلام کی ترقی کی زمین شہر یثرب جس کا بعد میں مدینہ نام رکھا گیا۔ میں ہموار ہوی اور اس کا سبب یہ تھا کہ اہل مدینہ داخلی جنگ۔ جو برسوں سے اوس وخزرج نامی دو قبیلوں کے درمیان جاری تھی۔ سے تنگ آچکے تھے، آخر کار وہ اس فکر میں تھے کہ اپنے لئے ایک بادشاہ کا انتخاب کر کے اس قتل وغارت کو ختم کریں۔

انہوں نے اس کام کے لئے، اپنے چند معروف افراد کو مکہ بھیجا تا کہ اس سلسلہ میں مکہ کے سرداروں سے گفتگو کریں۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب مکہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دعوت کو اعلانیہ طور پر شروع کیا تھا۔

مدینہ کی معروف شخصیتیں جب مکہ پہنچ گئیں اور انہوں نے اپنے مقصد کو قریش کے سرداروں کے سامنے پیش کیا، تو قریش کے سرداروں نے اس عذر و بہانہ سے ان کے ساتھ صلاح ومشورہ کرنے سے پہلو تہی کی کہ ایک مدت سے اس شہر میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے اور ہمارے مقدس خداؤں کو برا بھلا کہا ہے، اور ہمارے جوانوں کو گمراہ کیا ہے اور ہمیں فکر مند کیا ہے۔

اس بات کو سن کر اہل مدینہ ہل کر رہ گئے، کیونکہ انہوں نے مدینہ میں یہودیوں سے بارہا یہ پیشگوئی سنی تھی کہ مکہ میں نبی امی ظہور کریں گے، لہذا ان کے دماغ میں یہ خیال پیدا ہوا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جا کر انھیں دیکھیں اور ان کی دعوت کی کیفیت سے آگاہ ہو جائیں۔ جب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ کی خدمت میں پہنچے اور آپ صلی اللہ

علیہ وآلہ کے بیانات اور قرآن مجید کی آیات کو سنا تو وہ ایمان لے آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ سے وعدہ کیا کہ اگلے سال مدینہ کے کچھ لوگوں کے ہمراہ آکر اسلام کی ترقی کے اسباب فراہم کریں گے۔

دوسرے سال مدینہ کے سرداروں کی ایک جماعت مکہ آئی، رات کے وقت شہر سے باہر تنہائی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کی بیعت کی اور مدینہ میں دین اسلام کو رائج کرنے کا عہد و پیمان کیا اور کہا کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ تشریف لائیں تو وہ دشمنوں سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کی اس طرح حفاظت ودفاع کریں گے جیسا وہ اپنے خاندان کا دفاع کرتے ہیں اس کے بعد یہ لوگ مدینہ لوٹے ،اہل مدینہ میں سے اکثر لوگوں نے اسلام قبول کیا اور اس طرح شہر مدینہ اسلام کا پہلا شہر بن گیا۔لہذا جب انہوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف لانے کی خبر سنی تو وہ بہت خوشحال ہوئے اور انتہائی بے تابی کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ کے استقبال کے لئے بڑھے اور آپ کا شایان شان استقبال کیا اور انتہائی خلوص نیت سے اپنی جان و مال کو اسلام کی ترقی کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کی خدمت میں پیش کیا اسی لئے ان کا نام انصار رکھا گیا۔خدائے متعال اپنے کلام پاک میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت کے واقعہ اور انصار کی خدمات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کی قدردانی کرتا ہے:

(والذّین تبوء والدّ اروالایمٰن من قبلھم یحبّون من ھاجرلیھم ولا یجدون فی صدورھم حاجۃً ممّا اوتو ویؤثرون علی انفسھم ولوکان بھم خصاصۃ۔۔۔) (حشر۹)

اور جن لوگوں نے دار الہجرت اور ایمان کو ان سے پہلے اختیار کیا تھا وہ ہجرت کرنے والوں کو دوست رکھتے ہیں اور جو کچھ انھیں دیا گیا ہے اپنے دلوں میں اس کی طرف سے کوئی ضرورت نہیں محسوس کرتے ہیں اور اپنے نفس پر دوسروں کو مقدم کرتے ہیں چاہے انھیں کتنی ہی ضرورت کیوں نہ ہو...

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جنگوں کا ایک مختصر جائزہ

۱۔جنگ بدر

آخر کار ۲ ھ میں مسلمانوں اور کفار مکہ کے درمیان پہلی جنگ سرزمین بدر میں ہوئی۔اس جنگ میں کفار کے سپاہیوں کی تعداد تقریباً ایک ہزار تھی جو جنگی ساز وسامان اور اسلحہ سے مکمل طور پر لیس تھے اور مسلمانوں کے پاس ان کی نسبت ایک تہائی افراد تھے جو اچھی طرح سے مسلح بھی نہیں تھے۔لیکن خدائے متعال کی عنایتوں سے اس جنگ میں مسلمانوں کو شاندار فتح حاصل ہوئی اور کفار کو بری طرح شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

اس جنگ میں کفار کے ستر افراد مارے گئے،ان میں سے تقریباً نصف حضرت علی علیہ السلام کی تلوار سے قتل ہوئے۔اس کے علاوہ ان کے ستر آدمی اسیر کر لئے گئے اور باقی افراد تمام جنگی ساز وسامان چھوڑ کر بھاگ گئے۔

۲۔جنگ احد

۳ ہجری میں کفار مکہ نے ابوسفیان کی سرکردگی میں تین ہزار افراد کے ساتھ مدینہ پر حملہ کیا اور احد کے بیابان میں ان کا مسلمانوں کے ساتھ آمنا سامنا ہوا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ نے اس جنگ میں سات سو مسلمانوں کے ہمراہ کفار کے سامنے صف آرائی کی۔ جنگ کی ابتداء میں مسلمانوں کا پلہ بھاری تھا، لیکن کئی گھنٹوں کے بعد بعض مسلمانوں کی کوتاہی کی وجہ سے لشکر اسلام کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور کفار نے ہر طرف سے مسلمانوں پر تلواروں سے وار کیا۔

اس جنگ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ تقریبا ستر اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ، جن میں اکثر انصار تھے، کے ساتھ شہید ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیشانی مبارک زخمی ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کے سامنے کے دانتوں میں سے ایک دانت ٹوٹ گیا۔ایک کافر نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کے شانہ مبارک پر ایک ضرب لگا کر آواز دی: میں نے محمد کو قتل کر دیا اس کے نتیجہ میں لشکر اسلام پراگندہ ہوا۔

صرف حضرت علی علیہ السلام چند افراد کے ہمراہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اردگرد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کی حفاظت کرتے ہوئے ثابت قدم رہے اور حضرت علی علیہ السلام کے علاوہ سب شہید ہوئے حضرت علی علیہ السلام نے آخر تک مقابلہ کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دفاع کیا۔

آخری وقت ،اسلام کے فراری فوجی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گرد دوبارہ جمع ہوئے ،لیکن دشمن کے لشکر نے اس قدر کامیابی کوغنیمت سمجھ کر جنگ سے ہاتھ کھینچ لیا اور مکہ روانہ ہوے۔

لشکر کفار چند فرسخ طے کرنے کے بعد اس بات پر غور کرنے کے بعد سخت پشیمان ہوئے کہ انہوں نے جنگ کو آخری فتح تک کیوں جاری نہ رکھا تا کہ مسلمانوں کی عورتوں اور بچوں کو اسیر کر کے ان کے اموال کو لوٹ لیتے ۔اس لئے مدینہ پر دوبارہ حملہ کرنے کے لئے آپس میں مشورہ کررہے تھے۔لیکن انھیں یہ خبر ملی کہ لشکر اسلام جنگ کو جاری رکھنے کے لئے ان کے پیچھے آرہا ہے۔وہ اس خبر کوسن کر مرعوب ہوئے اور پھر سے مدینہ لوٹنے کا ارادہ ترک کر کے تیزی کے ساتھ مکہ کی طرف بڑھ گئے۔

حقیقت بھی یہی تھی ، کیوں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدا کے حکم سے مصیبت زدہ لوگوں کا ایک مسلح لشکر تیار کر کے حضرت علی علیہ السلام کی سر پرستی میں ان کے پیچھے روانہ کیا تھا۔

اس جنگ میں اگر چہ مسلمانوں کو زبردست نقصان اٹھانا پڑا لیکن حقیقت میں یہ اسلام کے نفع میں ختم ہوئی خصوصاً اس لحاظ سے کہ دونوں طرف نے جب جنگ بندی کے معاہدہ پر اتفاق کیا تو اسی وقت طے پایا تھا کہ اگلے سال اسی وقت بدر میں پھر سے جنگ لڑیں گے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اصحاب کے ایک گروہ کے ساتھ وعدہ کے مطابق وقت پر بدر میں حاضر ہو گئے،لیکن کفار وہاں نہ پہنچے۔

اس جنگ کے بعد مسلمانوں نے اپنے حالات کو بہتر بنایا اور جزیرہ نمائے عرب میں مکہ اور طائف کے علاوہ تمام علاقوں میں پیش قدمی کی۔

۳۔جنگ خندق

تیسری جنگ جو عرب کفار نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ کے ساتھ لڑی، اور جو اہل مکہ کی رہبری میں آخری اور ایک زبردست جنگ تھی، اسے جنگ خندق یا جنگ احزاب کہتے ہیں۔

جنگ احد کے بعد مکہ کے سردار ابوسفیان کی سرکردگی میں اس فکر میں تھے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر آخری اور کاری ضرب لگا کر نور اسلام کو ہمیشہ کے لئے بجھا دیں۔اس کام کے لئے عرب قبائل کو ابھارا اور اپنے تعاون اور مدد کے لئے دعوت دی۔طوائف کے یہودی بھی اسلام کے ساتھ جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرنے کے باوجود چوری چھپے اس آگ کو ہوا دے رہے تھے اور آخر کار اپنے عہد و پیمان کو توڑ کر کفار کے ساتھ تعاون کرنے کا کھل کر معاہدہ کیا۔

جس کے نتیجہ میں ۵ ھ میں قریش، عربوں کے مختلف قبائل اور طوائف کے یہودیوں پر مشتمل ایک بڑا اور سنگین لشکر تمام جنگی ساز وسامان سے لیس ہو کر مدینہ پر حملہ آور ہوا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہلے ہی دشمن کے اس منصوبے سے آگاہ ہو چکے تھے۔اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ نے اپنے اصحاب سے مشورہ کیا۔ایک طویل گفتگو اور صلاح ومشورہ

کے بعد، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک معزز صحابی سلمان فارسی کی تجویز پر شہر مدینہ کے اردگرد ایک خندق کھودی گئی اور لشکر اسلام نے شہر کے اندر پناہ لی۔ دشمن کی فوجیں جب مدینہ پہنچیں تو انھیں مدینہ کے اندر داخل ہونے کا راستہ نہیں ملا، مجبور ہو کر انہوں نے شہر مدینہ کو اپنے محاصرہ میں لے لیا اور اسی صورت میں جنگ شروع کی ۔ جنگ اور محاصرہ کچھ طولانی ہو گیا۔ اسی جنگ میں عرب کا نامور شجاع اور شہسوار عمرو بن عبدود، حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھوں قتل ہوا ۔آخر کار طوفان ،سردی، محاصرہ کے طولانی ہونے ،عربوں کی خستگی اور یہودواعراب کے درمیان اختلاف کے نتیجہ میں محاصرہ ختم ہوا اور کفار کا لشکر مدینہ سے چلا گیا

۔

٤۔جنگ خیبر

جنگ خندق کے بعد، جس کے اصلی محرک یہودی تھے، جنہوں نے کفار عرب کا تعاون کر کے اعلانیہ طور پر اسلام کے ساتھ اپنے معاہدہ کو توڑ دیا تھا، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ نے خدا کے حکم سے مدینہ میں موجود یہودی کے قبائل کی گوشمالی اور تنبیہ کرنے کے لئے ان کے ساتھ چند جنگیں لڑیں اور یہ سب جنگیں مسلمانوں کی فتحیابی پر ختم ہوئیں ۔ان میں سب سے اہم جنگ خیبر تھی ۔خیبر کے یہودیوں کے قبضہ میں چند مستحکم اور مضبوط قلعے تھے اور انکے پاس جنگجوؤں کی ایک بڑی تعداد تھی ، جو جنگی ساز وسامان سے لیس تھے۔

اس جنگ میں حضرت علی علیہ السلام نے یہودیوں کے نامور پہلوان مرحب کو قتل کر کے

یہودیوں کے لشکر کو تہس نہس کر دیا اور اس کے بعد قلعہ پر حملہ کیا اور قلعہ کے صدر دروازے کو اکھاڑ دیا اور اسطرح اسلام کا لشکر قلعہ کے اندر داخل ہوا اور فتح وظفر کے پرچم کو قلعہ پر لہرا دیا ۔اسی جنگ میں، جو ۵ ھ میں ختم ہوئی حجاز کے یہودیوں کا خاتمہ ہوا۔

بادشاہوں اور سلاطین کو دعوت اسلام

٦ ھمیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کئی بادشاہوں ،سلاطین اور فرمانرواؤں، جیسے: شاہ ایران،قیصر روم،سلطان مصر اور حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے نام چند خطوط تحریر فرمائے اور انھیں اسلام کی دعوت دی ۔نصرانیوں اور مجوسیوں کے ایک گروہ نے جزیہ دے کر امن سے رہنے کا وعدہ کیا اور اسطرح اسلام کے ذمہ میں آ گئے ۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ نے کفار مکہ سے جنگ نہ کرنے کا ایک معاہدہ کیا۔اس معاہدہ کے جملہ شرائط میں یہ شرط بھی تھی کہ مکہ میں موجود مسلمانوں کو کسی قسم کی اذیت نہ پہنچائی جائے اور اسلام کے دشمنوں کی مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں مدد نہ کی جائے۔

لیکن کفار مکہ نے کچھ مدت کے بعد اس معاہدہ کو توڑ دیا،جس کے نتیجہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ کو فتح کرنے کا فیصلہ کیا اور ٦ ھ میں دس ہزار کے ایک لشکر کے ساتھ مکہ پر حملہ کیا۔مکہ کسی جنگ،خونریزی اور مزاحمت کے بغیر فتح کیا اور خانہ کعبہ کو بتوں سے صاف کیا

۔

عام معافی کا اعلان فرمایا۔مکہ کے سرداروں کو۔جنھوں نے بیس سال کے عرصہ میں آپ صلی

اللہ علیہ وآلہ سے کافی دشمنی کی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کے اور آپ کے اصحاب کے ساتھ ناروا سلوک کیا تھا۔ اپنے پاس بلایا اور کسی قسم کی شدت، برے سلوک اور سختی کے بغیر نہایت مہربانی اور لطف و کرم سے انھیں معاف فرمایا۔

۵۔جنگ حنین

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ کو فتح کرنے کے بعد، اس کے اطراف منجملہ شہر طائف کو فتح کرنے کے لئے اقدام کیا اور اس سلسلہ میں عربوں سے متعدد جنگیں لڑیں کہ ان میں سے ایک جنگ حنین ہے۔

جنگ حنین، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اہم جنگوں میں سے ہے۔ یہ جنگ فتح مکہ کے کچھ ہی دنوں بعد حنین، میں قبیلہ ھوازن سے ہوی۔ لشکر اسلام نے دو ہزار سپاہوں سے ھوازن کے کئی ہزار سواروں کا مقابلہ کیا اور ان کے درمیان ایک گھمسان کی جنگ ہوی۔

ھوازن، نے جنگ کے آغاز میں مسلمانوں کو بری طرح شکست دیدی، یہاں تک کہ حضرت علی علیہ السلام، کہ جن کے ہاتھ میں اسلام کا پرچم تھا، جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ کے آگے آگے لڑ رہے تھے اور چند گنے چنے افراد کے علاوہ سب بھاگ گئے۔ لیکن کچھ دیر کے بعد ہی پہلے انصار اور پھر دوسرے مسلمان دوبارہ میدان کارزار کی طرف واپس لوٹے اور ایک شدید اور سخت جنگ لڑی اور دشمن کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔

اس جنگ میں دشمن کے پانچ ہزار سپاہی لشکر اسلام کے ہاتھوں اسیر ہوئے، لیکن پیغمبر اسلام

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پر مسلمانوں نے تمام اسیروں کو آزاد کر دیا، صرف چند افراد ناراض تھے کہ آنحضرت نے ان کے حصے میں آئے افراد کو پیسے دیکر خرید لیا اور پھر انہیں آزاد کر دیا۔

٦۔جنگ تبوک

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ۹ ہجری میں قیصر روم سے جنگ کرنے کی غرض سے تبوک پر لشکر کشی کی (تبوک شام اور حجاز کی سرحد پر ایک جگہ ہے) کیونکہ افواج پھیلی تھی کہ قیصر روم نے اس جگہ پر رومیوں اور اعراب کے ایک لشکر کو تشکیل دیا ہے۔ جنگ موتہ بھی اس کے بعد رومیوں کے ساتھ وہیں پر لڑی گئی جس کے نتیجہ میں جعفر بن ابیطالب، زید بن حارثہ اور عبداللہ بن رواحہ جیسے اسلامی فوج کے سردار شہید ہوئے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ تبوک پر حملہ کیا لیکن اسلامی لشکر کے پہنچنے پر وہاں موجود افراد بھاگ گئے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تین دن تبوک میں ٹھہرے۔اس کے اطراف کی پاک سازی کرنے کے بعد واپس مدینہ لوٹے۔

اسلام کی دوسری جنگیں

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مذکورہ جنگوں کے علاوہ مدینہ منورہ میں اپنے دس سالہ قیام کے دوران تقریباً اَسّی چھوٹی بڑی جنگیں لڑی ہیں، جن میں سے ایک چوتھائی جنگوں میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ نے بذات خود شرکت فرمائی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ نے جن جنگوں میں شرکت فرمائی، دوسرے کمانڈروں کے بر خلاف کہ وہ پناہ گاہ میں بیٹھ کر فرمان جاری کرتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ بذات خود سپاہیوں کے شانہ بہ شانہ لڑتے تھے، لیکن کسی کو ذاتی طور پر قتل کرنے کا آپ صلی اللہ علیہ و آلہ کے لئے کبھی اتفاق پیش نہیں آیا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معنوی شخصیت کا ایک جائزہ

مستند تاریخی اسناد کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک ایسے ماحول میں پرورش پائی تھی جو جہالت، فساد اور خلاقی برائیوں کے لحاظ سے بدترین ماحول تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ نے ایک ایسے ہی ماحول میں کسی تعلیم وتربیت کے بغیر اپنے بچپن اور جوانی کے ایام گزارے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اگرچہ ہرگز بت پرستی نہیں کی اور خلاف انسانیت کاموں

میں آلودہ نہیں ہوئے ،لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ ایسے لوگوں میں زندگی گزار رہے تھے کہ کسی بھی صورت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کی زندگی سے اس قسم کے روشن مستقبل کا اشارہ تک نہیں ملتا تھا، سچ یہ ہے کہ ایک غریب ونادار یتیم اور کسی سے تعلیم وتربیت حاصل نہ کرنے والے شخص سے یہ سب برکتیں قابل یقین نہیں تھیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی حالت میں ایک زمانہ گزارا، یہاں تک کہ انہی راتوں میں سے ایک رات کو جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ اپنے آرام ضمیر اور خالی ذہن کے ساتھ عبادت میں مشغول تھے،اچانک اپنے آپ کو ایک دوسری شخصیت میں پایا۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کی پوشیدہ باطنی شخصیت ایک آسمانی شخصیت میں تبدیل ہوگئی،انسانی معاشرے کے ہزاروں سال پہلے کہ افکار کو خرافات سمجھا اور دنیا والوں کی روش اور دین کو اپنی حقیقت پسندانہ نگاہوں سے ظلم وستم کے روپ میں دیکھا۔

دنیا کے ماضی اور مستقبل کو آپس میں جوڑ دیا،سعادت بشری کی راہ کی تشخیص کردی،آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھ اور کان نے حق وحقیقت کے علاوہ نہ کچھ دیکھا اور نہ کچھ سنا،آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کی زبان کلام خدا سے پیغام آسمانی اور حکمت وموعظہ کے لئے کھل گئی، اندرونی ضمیر جو تجارت،لین دین اور روزہ مرہ کی مصلحتوں میں سرگرم تھا،وہ دل وجان سے دنیا اور دنیا والوں کی اصلاح اور بشر کی ہزاروں سال کی گمراہی اور ظلم وستم کو ختم کرنے پر اتر آیا اور حق وحقیقت کو زندہ کرنے کے لئے تن تنہا قیام کیا اور دنیا کی وحشتناک متحد مخالف طاقتوں کی کوئی پروانہ کی معارف الٰہیہ کو بیان کیا اور کائنات کے تمام حقائق کا سرچشمہ خالق کائنات

کی وحدانیت کو سمجھا۔

انسان کے اعلیٰ اخلاق کی بہترین تشریح فرمائی اوران کے روابط کو کشف اورواضح کیا، جو بیان فرماتے تھے خود دوسروں سے پہلے اس کے قائل ہوتے تھے اور جس چیز کی ترغیب فرماتے تھے، پہلے خود اس پر عمل کرتے تھے۔

شریعت اوراحکام، جوعبادتوں اور پرستشوں کے ایک مجموعہ پر مشتمل ہیں، وہ خدائے یکتا کی عظمت وکبریائی کے سامنے بندگی کو ایک اچھے انداز میں پیش کرتے ہیں۔اس کے علاوہ عدلیہ اورتعزیرات سے متعلق دوسرے قوانین بھی لائے، کہ جو انسانی معاشرے کے تمام ضروری مسائل کا اطمینان بخش جواب دیتے ہیں، وہ ایسے قوانین ہیں جو آپس میں مکمل طور پر ایک دوسرے سے مرتبط ہیں اور توحید، انسانی احترام وعالی اخلاق کی بنیاد پر استوار و پائدار ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لائی ہوئی عبادات ومعاملات پر مشتمل قوانین کا مجموعہ، اس قدر وسیع اور جامع ہے کہ عالم بشریت میں انفرادی واجتماعی زندگی کے تمام مسائل موجود ہیں اور زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ساتھ پیش آنے والی گوناگوں ضرورتوں کی تحقیق کرکے تشخیص کا حکم دیتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے دین کے قوانین کو عالمی اورابدی جانتے ہیں، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کا اعتقاد ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کا دین تمام انسانی معاشروں کی دنیوی واخروی ضرورتوں کو ہر زمانے میں پورا کرسکتا ہے، اورلوگوں کو اپنی سعادت کے لئے

اسی روش کو اختیار کرنا چاہئے۔
البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بات کو عبث اور مطالعہ کے بغیر نہیں فرمایا ہے بلکہ خلقت کی تحقیق اور عالم انسانیت کے مستقبل کی پیشینگوئی کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جائے کہ:

اولاً: اپنے قوانین اور انسان کی جسمی اور روحی خلقت کے درمیان مکمل توافق وہم آھنگی کو واضح کر دیا۔

ثانیا: مستقبل میں رونما ہونے والی تبدیلیوں اور مسلمانوں کے معاشرے کو پہنچنے والے نقصانات کو مکمل طور پر مدنظر رکھنے کے بعد اپنے دین کے احکام کے ابدی ہونے کا حکم فرمایا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جو پیشنگوئیاں قطعی دلیلوں کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہیں، ان کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وآلہ نے اپنی رحلت تک کے عمومی حالات کی تشریح فرمائی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان معارف کے اصولوں اور شرائط کو پراکندہ طور پر قرآن مجید میں لوگوں کے لئے تلاوت فرمائی ہیں کہ اس کی حیرت انگیز فصاحت وبلاغت نے عرب دنیا کے فصاحت وبلاغت کے اساتذہ اور ماہروں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا اور دنیا کے دانشمندوں کے افکار کو متحیر کر کے رکھ دیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان تمام کارناموں کو ۲۳ سال کے عرصہ میں انجام دیا

ہے کہ جن میں سے ۱۳ سال جسمانی اذیت ، اور کفار مکہ کی نا قابل برداشت مزاحمتوں میں گزارے اور باقی دس سال بھی جنگ ،لشکر کشی ، کھلم کھلا دشمنوں کے ساتھ بیرونی مقابلہ اور منافقین اور روڑے اٹکانے والوں کے ساتھ اندرونی مقابلہ اور مسلمانوں کے امور کی باگ ڈور سنبھالنے میں اوران کے عقائد و اخلاق و اعمال اور ہزاروں دوسری مشکلات کی اصلاح کرنے میں گزارے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ پورا راستہ ایک ایسے غیر متزلزل ارادہ سے طے کیا، جو حق کی پیروی اور اسے زندہ کرنے کے لئے تھا۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کی حقیقت پسندانہ نظر صرف حق پر ہوتی تھی اور خلاف حق کو کوئی اہمیت نہیں دیتی تھی۔اگر کسی چیز کو اپنے منافع کے یا میلانات اور اپنے عمومی جذبات کے موافق پاتے تھے تو ان میں سے جس کو حق جانتے اسے قبول فرماتے اور اسے مسترد نہیں کرتے تھے اور جس کو باطل سمجھتے تھے اسے مسترد کر دیتے اور ہرگز قبول نہیں کرتے تھے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غیر معمولی معنوی شخصیت

اگر ہم انصاف سے مذکورہ مطالب پر تھوڑا سا غور وخوص کریں گے،تو کسی شک وشبہہ کے بغیر یہ قبول کرنے پر مجبور ہوجائیں گے کہ ان حالات اور ماحول میں ایسی شخصیت کا پیدا ہونا معجزہ اور خدائے متعال کی خاص تائید کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

اس لحاظ سے، خدائے متعال اپنے کلام پاک میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے امی ہونے، یتیمی اور سابقہ مفلسی کے بارے میں یاد دہانی کراتا ہے، اوران کوعطا کی گئی شخصیت کوایک آسمانی معجزہ شمار کرتا ہے اوراسی سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کی دعوت کی حقانیت کا استدلال کرتا ہے، چنانچہ فرماتا ہے:

(الم یجدك یتیما فآوی ٭و وجدك ضالّا فهدیٰ ٭ و وجدك عائلاً فاغنی)

(ضحی ۸۶)

کیا اس نے تم کو یتیم پا کر پناہ نہیں دی ہے؟ اور کیا تم کوگم گشتہ پا کر منزل تک نہیں پہنچایا ہے؟ اورتم کوتنگ دست پا کرغنی نہیں بنایا ہے؟

(وما کنت تتلوا من قبله من کتاب ولا تخطّه بیمینك ...)

(عنکبوت ٤٨)

اوراے پیغمبر! آپ اس قرآن سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے کچھ لکھتے تھے...

(وان کنتم فی ریب ممّا نزّلنا علی عبدنا فاتوبسورةٍ من مثله...) (بقرہ ۲۳)

اگرتمھیں اس کلام کے بارے میں کوئی شک ہے جسے ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے تواس کا جیسا ایک ہی سورہ لے آؤ...

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت

تنہا اصل جس پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدا کے حکم سے اپنے دین کی بنیاد رکھی اور اسے دنیا والوں کے لئے سعادت کا سبب قرار دیا، وہ توحید کی اصل ہے۔

توحید کی اصل کے مطابق، جو خالق کائنات پرستش کا سزاوار ہے وہ خدائے یکتا ہے، اور خدائے متعال کے علاوہ کسی اور کے لئے سر تعظیم خم نہیں کیا جا سکتا۔

اس بنا پر، انسانی معاشرہ میں جو روش عام ہونی چاہئے، وہ یہ ہے کہ سب آپس میں متحد اور بھائی بھائی ہوں اور کوئی اپنے لئے خدا کے سوا کسی کو بلا قید و شرط حاکم مطلق قرار نہ دے، چنانچہ خدائے متعال فرماتا ہے:

(قل یااھل الکتاب تعالوا الی کلمةٍ سواء بیننا و بینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرك به شیئا ولا یتّخذ بعضنا بعضا ارباباً من دون اللہ...) (آل عمران ۶۴)

اے پیغمبر! آپ کہہ دیں کہ اہل کتاب! آؤ ایک منصفانہ کلمہ پر اتفاق کرلیں کہ خدا کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کریں، کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں آپس میں ایک دوسرے کو خدائی کا درجہ نہ دیں...

اس آسمانی حکم کے مطابق، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی سیرت میں سبھی کو برابر و برادر قرار دیتے تھے اور احکام و حدود الٰہی کے نفاذ میں ہرگز امتیازی سلوک اور استثنا کے قائل نہیں تھے، اس طرح اپنے اور پرائے، طاقت ور اور کمزور، امیر و غریب اور مرد اور عورت میں فرق

نہیں کرتے تھے اور ہر ایک کے حق کو دین کے احکام وقوانین کے مطابق اس تک پہنچاتے تھے۔

کسی کو کسی دوسرے پر حکم فرمائی اور فرمانروائی اور زبردستی کرنے کا حق نہیں تھا۔لوگ قانون کے حدود کے اندر زیادہ سے زیادہ آزادی رکھتے تھے۔(البتہ قانون کے مقابلہ میں آزادی نہ صرف اسلام میں بلکہ دنیا کے اجتماعی قوانین میں بھی کوئی معنی نہیں رکھتی ہے)

آزادی اور اجتماعی عدالت کی اسی روش کے بارے میں خدائے متعال اپنے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعارف کراتے ہوئے فرماتا ہے:

(الّذین یتّبعون الرّسول النبیّ الامیّ الذی یجدونه مکتوباً عندھم فی التوریٰة والانجیل یامرھم بالمعروف وینھٰھم عن المنکر و یحلّ لھم الطیبت ویحرّم علیھم الخبٰئث ویضع عنھم اصرھم والاغلل الّتی کانت علیھم فالّذین امنوا به وعزّروہ ونصروہ واتّبعوا النّور الّذی انزل معه اولئك ھم المفلحون۔قل یا ایّھا النّاس انّی رسول الله الیکم جمیعا...)

(اعراف۱۵۷،۱۵۸)

جو لوگ رسول نبی امی کا اتباع کرتے ہیں کہ،جس کا ذکر اپنے پاس توریت اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں کہ وہ نیکیوں کا حکم دیتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے اور پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دیتا ہے اور خبیث چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے اور ان پر سے احکام کے سنگین بوجھ اور قید وبند کو اٹھا دیتا ہے،پس جو لوگ اس پر ایمان لائے،اس کا احترام کیا،اس کی امداد کی اور اس نور کا اتباع کیا جو اس کے ساتھ نازل ہوا ہے وہی درحقیقت فلاح یافتہ اور کامیاب ہے۔

پیغمبر! کہد وا ے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول اور نمائندہ ہوں...

یہاں پر معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی زندگی میں اپنے لئے کسی قسم کا امتیاز نہیں برتتے تھے اور ہرگز وہ شخص جو پہلے سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کو نہیں جانتا تھا، اس میں اور دوسروں میں امتیاز نہیں برتا جاتا تھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ اپنے گھر کا کام خود انجام دیتے تھے، ہر ایک کو ذاتی طور پر شرف یابی بخشتے تھے، حاجتمندوں کی باتوں کو خود سنتے تھے، تخت اور صدر محفل کی جگہ پر نہیں بیٹھتے تھے ۔راستہ چلتے وقت جاہ وحشم اور سرکاری تکلفات سے نہیں چلتے تھے۔

اگر کوئی مال آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کے ہاتھ میں آتا تو اپنے ضروری مخارج کے علاوہ باقی مال کو فقرا میں تقسیم کرتے تھے اور کبھی اپنی ضرورت کی اشیاء کو بھی حاجتمندوں میں تقسیم کر کے خود بھوکے رہتے تھے اور ہمیشہ فقیرانہ زندگی گزارتے تھے اور فقراء کے ساتھ ہم نشیں ہوتے تھے، لوگوں کے حقوق کی دادرسی میں کبھی غفلت اور لا پروائی نہیں کرتے تھے، لیکن اپنے ذاتی حقوق میں زیادہ تر عفو وبخشش سے کام لیتے تھے۔

جب فتح مکہ کے بعد قریش کے سرداروں کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کی خدمت میں حاضر کیا گیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ نے کسی قسم کی تندی اور سختی کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ سبھی کو عفو کیا، جبکہ ہجرت سے پہلے انہوں نے مستقل آپ صلی اللہ علیہ وآلہ پر ظلم کئے تھے اور ہجرت کے بعد بھی فتنے برپا کر کے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کے ساتھ خونین جنگیں لڑی تھیں ۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کے اہل بیت پر خدا کا درود وسلام ہو۔

بخوبی جان لینا چاہئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دین اورتوحید کے نشر کے علاوہ کوئی مقصد نہیں رکھتے تھے ،اوراچھے اخلاق ،خندہ پیشانی اور واضح ترین استدلال وبرہان سے لوگوں کوتوحید کی دعوت دیتے تھےاوراپنے اصحاب کوبھی اسی روش پرعمل کرنے کی نصیحت فر ماتے تھے، چنانچہ خدائے متعال آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کواس طرح حکم فرماتا ہے:

(قل ھذہ سبیلی ادعوا الی اللہ علی بصیرۃ انا و من اتّبعنی۔۔۔) (یوسف۱۰۸)

آپ کہہ دیجئے کہ یہ میراراستہ ہے کہ میں بصیرت کے ساتھ خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں اور میرے ساتھ میرااتباع کرنے والابھی ہے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس امر کی طرف انتہائی توجہ رکھتے تھے کہ اسلامی معاشرہ میں ہرفرد(اگرچہ غیر مسلمان اوراسلام کے ذمہ دار میں ہو)اپنا حق حاصل کرےاورالٰہی قوانین کے نفاذ میں کسی قسم کا استثنا پیدا ہونے نہ پائے اورحق وعدل کے سامنے سب مساوی ہوں ،کوئی کسی پر(تقوی کے علاوہ)کسی قسم کا امتیاز نہ جتلائے اور مال ودولت یاحسب ونسب اور عام قدرت کے بل بوتے پرکسی پرترجیح حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے،فخر نہ جتائے اور معاشرے کے مالدارلوگ کمزوروں اورمحتاجوں پرزبردستی نہ کریں اوراپنے ماتحتوں پرظلم نہ کریں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خودبھی فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے،اوراٹھنے، بیٹھنےاورراستہ چلنے میں ہرگز تکلفات سے کام نہیں لیتے تھے۔اپنے گھریلو کام بھی انجام دیتے تھے،آپ

صلی اللہ علیہ وآلہ کے پاس محافظ ونگہبان نہیں تھے۔لوگوں کے درمیان عام شخص جیسے لگتے تھے، جب لوگوں کے ہمراہ چلتے تھے تو کبھی آگے نہیں بڑھتے تھے، جب کسی محفل میں داخل ہوتے تو نزدیک ترین خالی جگہ پر بیٹھ جاتے، اصحاب کو نصیحت فرماتے تھے کہ دائرے کی صورت میں بیٹھیں تاکہ محفل صدر نشین کی حالت پیدا نہ کرے، جس کو دیکھتے، چاہے عورت ہو یا بچہ سب کو سلام کرتے تھے۔ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کا ایک صحابی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کے سامنے خاک پر گر کر سجدہ کرنا چاہتا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ نے فرمایا: کیا کر رہے ہو؟ یہ قیصر وکسری کی روش ہے اور میری شان پیغمبری اور بندگی ہے، آپ صلی اللہ علیہ و آلہ نے اپنے صحابیوں کو نصیحت فرماتے تھے کہ حاجتمندوں کی حاجتوں اور کمزوروں کی شکا یتوں کو مجھ تک ضرور پہنچائیں اور اس سلسلہ میں کوتاہی نہ کریں۔کہا جاتا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو آخری نصیحت لوگوں کو کی وہ غلاموں اور عورتوں کے بارے میں تھی۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کے بارے میں چند نکات

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے نیک اخلاق میں دوست ودشمن میں معروف ومشہور تھے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کے حسن اخلاق کا یہ عالم تھا کہ، ظالم دشمنوں اور نادان دوستوں کی بداخلاقی اور آزار و بے ادبی وجسمانی اذیتوں کے باوجود آپ کی تیوری پر بل نہ آتے تھے اور ناراضگی کا اظہار نہیں کرتے تھے۔سلام کرنے میں عورتوں بچوں اور ماتحتوں پر سبقت

کرتے تھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کو خدا کی طرف سے دین کی تبلیغ اور لوگوں کی رہبری کرنے کی ذمہ داری ملی، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ نے فریضہ کی انجام دہی میں ایک لمحہ بھی کوتاہی نہیں کی اور اپنی انتھک کوششوں کی بنا پر کبھی آرام سے نہیں بیٹھے۔ ہجرت سے تیرہ سال پہلے مکہ میں، مشرکین عرب کی طرف سے ناقابل برداشت مشکلات اور اذیتوں کے باوجود عبادت و دین خدا کی تبلیغ میں مسلسل مشغول رہتے تھے۔ ہجرت کے بعد دس سال کے دوران بھی دین کے دشمنوں کی طرف سے روز بروز مشکلات اور یہودیوں اور مسلمان نما منافقوں کی طرف سے روڑے اٹکائے جاتے رہے۔

معارف دین اور قوانین اسلام کو حیرت انگیز وسعت کے ساتھ لوگوں تک پہنچایا دشمنان اسلام سے ۸۰ سے زیادہ جنگیں لڑیں۔

اس کے علاوہ اسلامی معاشرے کی باگ ڈور۔ جو ان دنوں تمام جزیرۂ نما عرب پر پھیلا ہوا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کے ہاتھوں میں تھی، یہاں تک کہ لوگوں کی چھوٹی سے چھوٹی شکایتوں اور ضرورتوں کو بھی کسی رکاوٹ کے بغیر خود برطرف فرماتے تھے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شجاعت اور شہامت کے بارے میں اتنا ہی کافی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ نے اس وقت تن تنہا حق کی دعوت کا پرچم بلند کیا، جبکہ دنیا بھر میں ظلم وزبردستی اور حق کشی کے علاوہ حکومت نہیں کی جاسکتی تھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ نے وقت کے ظالموں سے بے انتہا جسمانی اذیتیں اور تکلفیں اٹھائیں، لیکن یہ سب چیزیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کے عزم وارادے میں سستی اور کمزوری پیدا نہ کرسکیں اور آپ نے کسی جنگ میں

پیٹھ نہیں دکھائی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہایت پاکیزہ نفس کے مالک تھے، فقیرانہ لباس پہنتے تھے اور سادہ زندگی گزارتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کے اور نوکروں وغلاموں کے درمیاں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کے پاس کافی مال ومنال آتا تھا لیکن اسے مسلمان فقراء میں تقسیم کرتے تھے، تھوڑی مقدار میں اپنی اور اپنے اہل وعیال کی زندگی کے لئے لیتے تھے۔ بعض اوقات کئی دنوں تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کے گھر سے دھواں نہیں اٹھتا تھا اور پکا ہوا کھانا نصیب نہیں ہوتا تھا۔ زندگی میں صفائی خاص کر عطر کو بہت پسند فرماتے تھے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی اپنی حالت نہیں بدلی، جو تواضع وفروتنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کی ابتدائی زندگی میں تھی وہی آخر تک رہی اور اس گراں قدر حیثیت کے مالک ہونے کے باوجود، ہرگز اپنے لئے ایسے امتیاز کے قائل نہ ہوئے جس سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کی اجتماعی قدر ومنزلت دکھائی دیتی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کبھی تخت پر نہیں بیٹھے، محفل کی صدر نشین کو کبھی اپنے لئے مخصوص نہ کیا، راستہ چلتے وقت کبھی دوسروں سے آگے نہیں بڑھے اور کبھی حکمراں اور فرمانروا کا قیافیہ اختیار نہیں کیا۔ جب اپنے اصحاب کے ساتھ کسی عام محفل میں تشریف فرما ہوتے تھے، تو اگر کوئی اجنبی شخص آپ صلی اللہ علیہ وآلہ سے ملاقات کے لئے آجاتا تھا تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کو نہیں پہچان پاتا تھا اور وہاں پر موجود لوگوں سے مخاطب ہو کر کہتا تھا: آپ میں کون شخص پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ ہے؟ پھر لوگ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعارف کراتے تھے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی پوری زندگی میں کسی کو گالی نہیں دی اور کبھی بیہودہ کلام نہیں کیا، کبھی قہقہہ لگا کر نہیں ہنسے اور، کوئی ہلکا اور بے فائدہ کام انجام نہ دیا۔ غور وخوض کو پسند فرماتے تھے، ہر دردمند کی بات اور ہر ایک کا اعتراض سنتے تھے، پھر جواب دیتے تھے، کبھی کسی کی بات نہیں کاٹتے تھے، آزاد تفکر میں رکاوٹ نہیں بنتے تھے، لیکن اشتباہ کرنے والے کو اشتباہ کو واضح کر کے اس کے اندورونی زخم پر مرہم لگاتے تھے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مہربان اور انتہائی نرم دل تھے، ہر مصیبت زدہ کی مصیبت کو دیکھ کر رنجیدہ ہوتے تھے، لیکن بدکاروں اور مجرموں کو سزا دینے میں نرمی نہیں کرتے تھے اور سزا کو جاری کرتے وقت اپنے اور پرایے اور بیگانہ وآشنا میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔

ایک انصاری کے گھر میں چوری ہوئی تھی، اس سلسلہ میں ایک یہودی اور ایک مسلمان ملزم ٹھہرائے گئے۔ انصار کی ایک بڑی جماعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ کے پاس آئی اور دباؤ ڈالا کہ مسلمانوں خاص کر انصار کی آبرو بچانے کے لئے، صرف یہودی کو سزا دی جائے۔ کیونکہ انصار کے ساتھ یہودیوں کی کھلم کھلا دشمنی تھی۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ نے حق کو ان کی مرضی کے برخلاف ثابت کیا، یہودی کی آشکارا طور پر حمایت کی اور مسلمان کو سزا سنادی۔

جنگ بدر کی پکڑ دھکڑ کے دوران مسلمانوں کی صفوں کو منظم کرتے ہوئے جب آنحضرت ایک سپاہی کے پاس پہنچے جو تھوڑا سا آگے تھا، تو آپ نے اپنے عصا سے اس سپاہی کے پیٹ پر رکھ کر تھوڑا سا ڈھکیلا تا کہ ا پیچھے ہٹے اور صف سیدھی ہو جائے۔ سپاہی نے کہا: یارسول اللہ! خدا

کی قسم میرے پیٹ میں درد ہونے لگا۔میں آپ صلی اللہ علیہ و آلہ سے قصاص لوں گا۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ نے اپنے عصا کواس کے ہاتھ میں دیدیا،اوراپنے شکم سے لباس ہٹادیااورفرمایا آؤ قصاص لےلو۔سپاہی نے بڑھ کرآنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ کے شکم مبارک کو چوما اور کہا: میں جانتا ہوں کہ آج قتل کیا جاؤں گا،میں اس طرح آپ صلی اللہ علیہ و آلہ کے بدن مقدس کا بوسہ لینا چاہتا تھا(۱) اسکے بعداس سپاہی نے دشمن پرحملہ کیااورتلوار چلائی یہاں تک کہ شہید ہوگیا۔

....

۱۔طبری،تاریخ،ج۲،ص۱۴۹

مسلمانوں کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیت

عالم بشریت،کائنات کے دوسرے ان تمام اجزاء کے مانند تغیر وتبدل کی حالت میں ہے کہ جس کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں۔اورلوگوں کی بناوٹ میں جواختلاف پایا جاتا ہےاس کی وجہ سے انسان میں مختلف سلیقے وجود میں آئے ہیں کہ جن کے نتیجہ میں لوگ،فہم وادراک کی تیزی وکندی،حفظ اورافکار کی فراموشی میں مختلف ہیں۔

اس لحاظ سے،عقائداوراسی طرح رسومات اورایک معاشرہ میں جاری قوانین کی ایک پائدار بنیاد کی حفاظت کے لئے اگر باایمان وقابل اعتماد نگہبان ومحافظ نہ ہوں،تو وہ تھوڑی ہی مدت

کے بعد تغیر وتبدل اور انحراف کا شکار ہو کر نابود ہو جائیں گے۔مشاہدہ اور تجربہ ہمارے لئے اس مسئلہ کو واضح ترین صورت میں ثابت کرتا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے عالمی اور ابدی دین کو درپیش خطرے سے بچانے کے لئے پائدار و محکم سند اور باصلاحیت محافظ کے طور پر کتاب خدا اور اپنے اہل بیت علیہم السلام کو لوگوں کے کے سامنے پیش کیا. چنانچہ شیعہ اور سنی راویوں نے تواتر کے ساتھ نقل کیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بارہا فرمایا: میں اپنے بعد،

خدا کی کتاب اور اہل بیت کو تم لوگوں میں چھوڑ رہا ہوں، یہ دونوں کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے، جب تک تم لوگ ان سے متمسک رہو گے، گمراہ نہیں ہو گے۔(۱)

پیغمبراسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت اور جانشینی کا مسئلہ

وہ آخری شہر، جس کا فتح ہونا اسلام کے جزیرۂ نما عرب پر تسلط جمانے کا سبب بنا، شہر مکہ تھا، کہ جہاں پر حرم خدا اور کعبہ ہے۔ یہ شہر ۸ ھ میں اسلامی لشکر کے ہاتھوں فتح ہوا اور اس کے فوراً ہی بعد شہر طائف بھی فتح ہوا۔

۱۰ ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فریضہ حج انجام دینے کے لئے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔ حج کے اعمال اور لوگوں تک ضروری تعلیمات پہنچانے کے بعد مدینہ روانہ ہوئے۔ راستہ میں غدیر خم نامی ایک جگہ پر قافلہ کو آگے بڑھنے سے روکنے کا حکم فرمایا اور مختلف

علاقوں سے آئے ہوئے ایک لاکھ بیس ہزار حاجیوں کے درمیان حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھ کو پکڑ کر بلند کیا اور تمام لوگوں میں حضرت علی کی ولایت اور جانشینی کا اعلان فرمایا۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس اقدام سے اسلامی معاشرہ میں والی کا مسئلہ۔ کہ جو اسلامی معاشرہ میں مسلمانوں کے امور پر ولایت رکھتا ہے اور کتاب وسنت اور دینی

....

۱۔(انی تارك فیكم الثقلین ! كتاب الله وعترتی اهل بیتی !ما ان تمسكتم بهمالن تضلوابعدی ابداوانهمالن یفترقا حتی یرداعلی الحوض...) (غایة المرام،ص۲۱۲الغدیر،ج۱،ص۵۵)

معارف اور قوانین کی حفاظت کرتا ہے۔ حل ہوا اور آیۂ شریفہ:

(یا ایّها الرّسول بلّغ ما انزل الیك من ربّك وان لم تفعل فما بلّغت رسالته...) (مائده۶۷) کا حکم نافذ ہوا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ لوٹے، ستّر دن کے بعد، تقریباً ۲۸ ماہ صفر ۱۱ھ کو رحلت فرمائی۔

قرآن مجید، نبوت کی سند

سب سے بڑی دلیل کہ جس کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ نے سند نبوت کے طور پر پیش کیا ہے نیز معارف اسلام یعنی اصول وفروع کے لئے ماخذ ومصدر ہے کہ جس پر سب سے زیادہ اعتماد کیا جاتا ہے وہ کتاب آسمانی یعنی قرآن مجید ہے۔

قرآن مجید، خدائے متعال کے کلام اور خطاب کا ایک مجموعہ ہے، جو مقام کبریائی کی عزت وعظمت کے مصدر سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا اور اس کے ذریعہ راہ سعادت کی نشاندہی کی گئی۔

قرآن مجید عالم بشریت کو ایسے علمی وعملی احکام وقوانین کی نشاندہی کرتا ہے کہ جن پر عمل کر کے انسان دنیا وآخرت کی سعادت حاصل کرسکتا ہے۔

قرآن مجید پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا معجزہ، حجت اور ایک ایسی سند وثبوت ہے جو دشمن کو ہر جہت سے عاجز اور کمزور بنا دیتا ہے اور ہر قسم کے عذر، اعتراض، نزاع اور لڑائی جھگڑے کے راستہ کو اس کے لئے بند کر دیتا ہے اور اپنے مقاصد کو واضح ترین صورت میں ثابت کرتا ہے۔

قرآن مجید اپنے مقاصد میں لوگوں کو آنکھیں بند کر کے تقلید کرنے کی دعوت دینے کے بجائے اس کے ساتھ عام اور خداداد منطق کی زبان میں بات کرتا ہے اور کچھ معلومات کی یاد دہانی کرتا ہے، جنھیں انسان خواہ نخواہ اپنی فطرت سے درک کرتا ہے، اور یاد دہانی کراتا ہے کہ

انسان کبھی ان کو قبول کرنے اور اعتراف کرنے سے پہلو تہی نہیں کرسکتا ہے۔خدائے متعال فرماتا ہے:

(نّہ لقول فصل ٭ وما ھو بالھزل) (طارق۱۳،۱۴)

بیشک یہ قول فیصل ہے اور مذاق نہیں ہے۔

قرآن مجید ایک مطلب کو بیان کرتا ہے ،جہاں تک اس کی دلالت کی شعاعیں پھیلتی ہیں، ہمیشہ اور سبھی کے لئے زندہ و پایندہ ہے، نہ لوگوں کی معمولی باتوں کے مانند بعض جہات سے فہم وتفکر کے ذریعہ اس پر احاطہ کیا جاسکتا ہے اور بعض لحاظ سے غفلت اور لاپروائی کا اس میں امکان ہو، بلکہ یہ ایسے خدائے متعال کا کلام ہے جو ہر ظاہر و باطن اور مصلحت ومفسدہ سے آگاہ ہے۔

اس لحاظ سے ہر مسلمان پر لازم ہے کہ اپنی حقیقت پسندانہ آنکھوں کو کھول دے اور ہمیشہ ان دو آیۂ شریفہ کو مدنظر رکھے ،خدا کے کلام کو زندہ اور پائندہ جانے ۔اور جو دوسروں نے سمجھ کر بیان کیا ہے ،اس پر اکتفانہ کرے ،آزاد فکر کے راستے کو اپنے اوپر بند نہ کرے، کیونکہ یہ انسانیت کا تنہا خصوصی سرمایہ ہے اور قرآن مجید اس پر عمل کرنے کی بہت تاکید کرتا ہے ۔قرآن مجید ہمیشہ اور سبھی کے لئے قول فیصل اور ایک زندہ حجت ہے اور یہ کتاب کسی خاص گروہ کے فہم تک محدود ومنحصر نہیں ہوسکتی ہے،خدائے متعال فرماتا ہے:

(...ولا یکونوا کالّذ ین اوتوا الکتٰب من قبل فطال علیھم الامد فقست قلوبھم ...) (حدید۱۶)

اور وہ (مسلمان) ان اہل کتاب کی طرح نہ ہو جائیں ،جنھیں کتاب دی گئی تو ایک عرصہ گزرنے کے بعد ان کے دل سخت ہو گئے

قرآن مجید لوگوں سے چاہتا ہے کہ وہ اپنی فطرت کی طرف پلٹیں ،حق کو قبول کریں ،یعنی پہلے اپنے آپ کو بلا قید وشرط حق کو قبول کرنے پر آمادہ کریں اور جب دیکھیں کہ یہ حق ہے اور ان کی دنیوی واخروی سعادت ومنافع اسی میں ہے ،تو شیطانی وسوسوں اور ہوا وہوس کی آواز کی طرف کان دھرے بغیر اسے قبول کریں۔

اس کے بعد ،اسلامی معارف کو اپنے زندہ شعور کے سپرد کریں ،اگر دیکھیں کہ یہ حق ہے اور انھیں قبول کر کے ان پر عمل کرنے میں ان کے لئے حقیقی مصلحت وآسودگی ہے تو ان کے سامنے تسلیم ہو جائیں اور البتہ اس صورت میں انسانی معاشرے میں عام ہونے والی زندگی کی روش اور دین ،ایسے ضوابط اور احکام ہوں گے جنھیں انسان اپنے فطری میلانات کے تحت چاہتا ہے۔

آخر ایک یکساں روش ہوگی جس کے تمام اجزاء ومواد انسان کی خصوصی بناوٹ سے مکمل ہم آہنگ ہوں گے اور تضاد وتناقض سے مکمل طور پر دور ہوں گے ،نہ ایک ایسی متضاد روش جو کہیں پر معنویات سے وجود میں آتی ہو اور کہیں پر مادیات سے اور کہیں عقل سلیم کے موافق ہو اور بعض مواقع پر ہوا ہوس کے تابع ہو۔خدائے متعال قرآن مجید کی توصیف میں فرماتا ہے:

(...یہدی الی الحق والی طریق مستقیم) (احقاف۳۰)

(یہ کتاب) حق وانصاف اور سیدھے راستہ کی طرف ہدایت کرنے والی ہے

نیز فرماتا ہے:

(انّ ھذا القرآن یھدی للّتی ھی اقوم ...) (اسراء۹)

بیشک یہ قرآن اس راستہ کی طرف ہدایت کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے...

ایک دوسری آیت میں اسلام کی اس توانائی کے سبب کو اسلام کے انسان کی خلقت کے مطابق ہونے کو بتاتا ہے کیونکہ بالکل واضح ہے کہ جو روش وراستہ انسان کی فطری خواہشوں اور حقیقی ضرورتوں کو پورا کرے، وہ انسان کو بہترین صورت میں کامیاب وخوش بخت بنا سکتا ہے:

(فاقم وجھك للدّین حنیفا فطرت اللہ الّتی فطر النّاس علیھا لا تبدیل لخلق اللہ ذلك الدّین القیّم ...) (روم ۳۰)

آپ اپنے رخ کو دین کی طرف رکھیں اور باطل سے کنارہ کش رہیں کہ یہ دین وہ فطرت الٰہی ہے جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا اور خلقت الٰہی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی ہے۔ یقینا یہی سیدھا اور مستحکم دین ہے

نیز فرماتا ہے:

(... کتٰب انزلنه الیك لتخرج النّاس من الظّلمات الی النّور ...) (ابراھیم ۱)

یہ کتاب ہے جسے ہم نے آپ کی طرف نازل کیا ہے تا کہ آپ لوگوں کو حکم خدا سے تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آئے...

قرآن مجید، لوگوں کو ایک ایسے راستہ کی طرف دعوت دیتا ہے کہ جو خود بھی روشن ہو اور منزل

مقصودکو بھی واضح طور پر دکھائے ،یہ راستہ قطعا وہی راستہ ہوگا جو انسان کی فطری خواہشات، جواسکی واقعی ضرورتیں ہیں ..کو پورا کر سکے اور عقل سلیم کی نظر سے موافق ہونا چاہئے اور یہ وہی دین فطرت ہے جسے اسلام کہتے ہیں۔

لیکن جس روش کی بنیاد معاشرہ کی ہواوہوس اور شہوانی خواہشات کے لئے یا معاشرے کے بااثر افراد کے ذریعہ رکھی گئی ہو،اسی طرح جو روش اسلاف کی اندھی تقلید پر بنی ہو،اسی طرح جو راہ وروش ایک پسماندہ اور ناتواں ملت نے ایک توانا اور قدرتمند ملت سے حاصل کر کے عقل ومنطق سے اس کی تحقیق کئے بغیر جو کچھ اس سے حاصل کیا ہے،اسے آنکھیں بند کر کے قبول کر کے خود کو اسکے مشابہ بنائے ،ایسی روشیں تاریکی میں ڈوبنے کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور حقیقت میں یہ ایک ایسے راستہ پر چلنے کے مترادف ہے کہ جہاں منزل مقصود تک پہنچنے کی کوئی ضمانت نہیں ہے، چنانچہ خدائے متعال فرماتا ہے:

(او من کان میّتا فاحیینه وجعلنا له نوراً یمشی به فی النّاس کمن مثله فی الظّلمات لیس بخارج منها...) (انعام۱۲۲)

کیا جو شخص مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندہ کیا اور اس کے لئے ایک نور قرار دیا جس کے سہارے وہ لوگوں کے درمیان چلتا ہے اسکی مثال اسکی جیسی ہوسکتی ہے جو تاریکیوں میں ہواور ان سے نکل بھی نہیں سکتا ہو...

قرآن مجید کی اہمیت

قرآن مجید ایک آسمانی کتاب ہے جو عالمی وابدی دین اسلام کی پشت پناہ ہے۔اس میں معارف اسلامی کے کلیات دلکش انداز میں بیان ہوئے ہیں،اس لحاظ سے اس کی قدر و قیمت دین خدا کی قدر و قیمت کے مساوی ہے،وہ دین جس سے انسان کی حقیقی سعادت وخوشبختی وابستہ ہے،وہ ہر چیز سے زیادہ قیمتی،اہم اور بلند ہے بلکہ قدر و قیمت میں کوئی چیز اس سے قابل موازنہ نہیں ہے۔اسکے علاوہ قرآن مجید خدائے متعال کا کلام اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لافانی معجزہ ہے۔

قرآن مجید کا معجزہ

یقیناعربی زبان،ایک قوی اور وسیع زبان ہے،جو انسان کے باطنی مقاصد کو واضح ترین اور دقیق ترین صورت میں بیان کرسکتی ہے اور یہ اس خصوصیت میں مکمل ترین زبانوں میں سے ایک ہے۔

تاریخ سے ثابت ہو چکا ہے کہ عصر جاہلیت (قبل از اسلام) کے اعراب اکثر خانہ بدوش اور تہذیب وتمدن سے بے بہرہ اور زندگی کے بیشتر حقوق سے بالکل محروم تھے۔لیکن وہ قدرت بیان اور کلام کی فصاحت وبلاغت میں ایک بلند مقام رکھتے تھے،چنانچہ تاریخ کے صفحات میں ان کا حریف پیدا نہیں کیا جا سکتا۔

ادبیات عرب کے میدان میں، فصیح کلام کی بہت قدر و قیمت تھی اور ادیبانہ اور فصیح کلام کا کافی احترام کیا جاتا تھا. اعراب جس طرح بتوں اور اپنے خداؤں کو خانہ کعبہ میں نصب کرتے تھے ،اسی طرح صف اول کے ادیبوں اور شعراء کے دلکش اشعار کو بھی کعبہ کی دیوار پر لٹکاتے تھے ۔اس کے باوجود کہ وہ ایک وسیع زبان کو ان تمام علامتوں اور دقیق قواعد وضوابط اور کم ترین غلطی اور اشتباہ سے استعمال کرتے تھے اور کلام کی فصاحت و بلاغت میں کمال دکھاتے تھے ،جب ابتدائی ایام میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن مجید کی چند آیتیں نازل ہوئیں، تو اعراب اور اس قوم کے ادیبوں اور سخنوروں میں ہلچل مچ گئی اور قرآن مجید کا دلکش اور پرُ معنی بیان کا دلوں پر ایسا اثر ہوا کہ دل والوں کو اپنا فریفتہ بنا کر رکھدیا اور وہ ہر فصیح کلام کو بھول گئے اور نامور شعراء جو اپنے اشعار کعبہ کی دیوار پر لٹکائے تھے، انہیں اتار دیا۔

یہ خدائی کلام، اپنی ابدی زیبائی و دلکشی سے ہر دل کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا اور اپنی شیرین بیانی سے شیرین زبانوں پر تالا لگا دیتا تھا۔لیکن دوسری جانب مشرکوں اور بت پرستوں کے لئے انتہائی تلخ و ناگوار تھا، کیونکہ خدا کا کلام اپنے موثر بیان اور قطعی حجت سے دین توحید کو برہان واستدلال بخشتا تھا اور شرک و بت پرست کی روش کی سرزنش کرتا تھا۔جن بتوں کو لوگ خدا کہتے تھے ان کے سامنے نیازمندی کا ہاتھ پھیلاتے تھے، ان کی بارگاہ میں قربانیاں پیش کرتے تھے اور ان کی پوجا کرتے تھے، قرآن ان کی مذمت کرتا اور انھیں پتھر اور لکڑی کے بے جان و بے فائدہ مجسمے سے تعبیر کرتا تھا، وحشی اعراب جنہوں نے غرور وتکبر میں غرق ہو کر اپنی زندگی کی بنیاد خونخواری اور ڈاکہ زنی پر ڈالی تھی ...کو حق پرستی کے دین اور عدالت

وانسانیت کے احترام کی طرف دعوت دیتا تھا، یہی وجہ تھی کہ اعراب جنگ ولڑائی کے راستہ سے سامنے آگئے اوراس شمع ہدایت کو خاموش کرنے کے لئے ہر ممکنہ کوشش کرتے رہے لیکن اپنی بے جا کوششوں میں ناامیدی ونا کامی کے علاوہ کچھ نہیں پایا۔اوائل بعثت میں پیغمبرا کرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ولید نامی ایک ادیب اورفصاحت وبلاغت کے ماہر کے پاس لے گئے ۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سورۂ حم سجدہ کی چند آیتوں کی تلاوت فرمائی ۔ولید اپنے تکبر وغرور کے باوجود بڑی سنجیدگی سے سن رہا تھا، یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ نے اس آیۂ شریفہ کی تلاوت فرمائی:

(فان اعرضوا فقل انذر تکم صٰعقة مثل صٰعقة عاد وثمود)

(فصلت ۱۳)

پھر اگر یہ اعراض کریں تو کہہ دیجئے کہ ہم نے تم کو ویسی ہی بجلی کے عذاب سے ڈرایا ہے جیسی قوم عاد وثمود پر نازل ہوئی تھی۔

جوں ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیہ شریفہ کی تلاوت کی، ولید کی حالت بگڑ گئی ،اس کا بدن کانپنے لگا،اس کے ہوش اڑ گئے،محفل درہم برہم ہوگئی،اورلوگ متفرق ہو گئے۔

اس کے بعد، کچھ لوگ ولید کے پاس آئے اوراس سے شکوہ کیا اور کہا کہ تم نے ہمیں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ کے سامنے رسوا کر کے رکھدیا!اس نے جواب میں کہا: خدا کی قسم ہرگز نہیں !تم لوگ جانتے ہو کہ میں کسی سے نہیں ڈرتا ہوں اور کوئی لالچ بھی نہیں رکھتا ہوں اورتم لوگ جانتے ہو کہ میں سخن شناس ہوں، جو باتیں میں نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ سے سنیں ان میں لوگوں کی

باتوں کی شباہت نہیں پائی جاتی، یہ دلفریب اور دلکش کلام تھا، نہ اسے شعر کہہ سکتے ہیں اور نہ نثر ، بامعنی اور عمیق کلام ہے ۔ اگر میں اس کلام کے بارے میں اپنا نظریہ پیش کرنے پر مجبور ہی ہوں تو مجھے تین دن کی مہلت دیں تاکہ میں اس پر غور کرسکوں ۔ جب تین دن گزرنے کے بعد اس کے پاس گئے تو ولید نے کہا: محمد صلی اللہ علیہ وآلہ کا کلام سحر وجادو ہے جو دلوں کو اپنا فریفتہ بنالیتا ہے۔

مشرکین ولید کی راہنمائی پر قرآن مجید کو سحر وجادو کا نام دیکر اس کو سننے سے پرہیز کرتے تھے اور لوگوں کو بھی اسے سننے سے منع کرتے تھے ،بعض اوقات جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد الحرام میں قرآن مجید کی تلاوت فرماتے تھے ،تو کفار شور مچاتے اور تالیاں بجاتے تھے تاکہ دوسرے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز سن نہ سکیں۔

اس کے باوجود کہ وہ لوگ قرآن مجید کے فصیح اور دلکش بیان کے عاشق ہوئے تھے، اکثر وبیشتر آرام سے نہیں بیٹھتے تھے اور رات کی تاریکی سے استفادہ کرکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر کی دیوار کے پیچھے جمع ہوکر قرآن مجید کی تلاوت کو سنتے تھے، پھر سرگوشی میں ایک دوسرے سے کہتے تھے :اس کلام کو مخلوق کا کلام نہیں کہا جاسکتا ہے! خدائے متعال اس مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

(نحن اعلم بما یستمعون به اذ یستمعون الیك واذ هم نجوی اذ یقول الظّلمون ان تتّبعون الا رجلا مسحوراً) (اسراء ۴۷)

ہم خوب جانتے ہیں کہ یہ لوگ آپ کی طرف کان لگا کر سنتے ہیں تو کیا سنتے ہیں اور جب یہ

باہم رازداری کی بات کرتے ہیں تو ہم اسے بھی جانتے ہیں، یہ ظالم آپس میں کہتے ہیں تم لوگ ایک جادوزدہ انسان کی پیروی کرر ہے ہو۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ،بعض اوقات کعبہ کے نزدیک لوگوں کوقرآن مجید کی تلاوت کی طرف دعوت دیتے تھے ،عرب کے سخنور جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کے نزدیک سے گزرتے تھے تو جھک کر گزرتے تھے۔تاکہ دیکھے اور پہچانے نہ جائیں ،چنانچہ خدائے متعال فرماتا ہے:

(الا انھم یثنون صدورھم لیستخفوا منہ ...) (ھود ۵)

ترجمہ کا خلاصہ: وہ اپنے آپ کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ سے چھپانے کے لئے جھک جاتے ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تہمتیں کفار ومشرکین نے نہ صرف قرآن مجید کو سحر وجادو کہا ، بلکہ وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری دعوت کو ہی جادو کہتے تھے۔جب بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ لوگوں کوراہ خدا کی دعوت دیتے تھے اور انھیں کچھ حقائق کی یاددہانی کراتے تھے یا کوئی وعظ ونصیحت فرماتے تھے تو کفار کہتے تھے: جادوکررہا ہے جبکہ تمام حالات میں ،آپ صلی اللہ علیہ وآلہ ان کے لئے ایسے مسائل کو واضح فرماتے تھے، کہ وہ خدادادفطرت اور انسانی شعور سے ان کی حقیقت کو درک کرتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ انہیں سیدھا اور واضح راستہ دکھاتے تھے کہ انسانی معاشرے کی سعادت وکامیابی کو جادونہیں کہا جاسکتا ہے۔

کیا یہ کہنا جادو ہے؟ کہ اپنے ہاتھوں سے پتھر ولکڑی کے بنائے ہوئے بتوں کی پرستش نہ کرو اور اپنے فرزندوں کو انکی قربانی نہ کرو اور خرافات کی پیروی نہ کرو اور کیا پسندیدہ اخلاق، جیسے

سچائی، صحیح، خیر خواہی، انسان دوستی، صلح وصفا، انصاف، عدالت اور انسانی حقوق کے احترام کو جادو کہا جاسکتا ہے؟ خدائے متعال اپنے کلام پاک میں اس مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

(...ولئن قلت انکم مبعوثون من بعد الموت لیقولنّ الّذین کفروا انّ هذاالّا سحر مبین) (ھود،)

ترجمہ کا خلاصہ: جب آپ کفار سے کہتے ہیں کہ: موت کے بعد دوبارہ زندہ ہوجاؤ گے تو کہتے ہیں کہ جادو کرتا ہے۔

قرآن مجید کی مشرکین کو مناظرہ کی دعوت

کفار ومشرکین کہ جن کے دلوں میں بت پرستی نے جڑ پکڑلی تھی، اسلام کی دعوت کو قبول کرنے اور حق وحقیقت کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھے. لہذا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تردید کرتے ہوئے کہتے تھے: یہ جھوٹا ہے اور جس قرآن کو خدا سے نسبت دیتا ہے، یہ اس کا اپنا کلام ہے

اس تہمت کو دور کرنے کے لئے قرآن مجید نے شدید ردعمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے عربوں کے میدان فصاحت وبلاغت کے ہراول دستے کو مقابلہ کی دعوت دیتے ہوئے ان سے چاہا کہ اگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ان لوگوں کا شک وشبہہ صحیح ہے اور وہ سچ کہتے ہیں تو قرآن مجید کے کلام کے مانند کلام لے آئیں اور اس طرح اسلام کی دعوت کے

بے بنیاد ہونے کو ثابت کریں چنانچہ خدائے متعال فرماتا ہے:

(ام یقولون تقوّله بل لا یومنون ٭ فلیأتوا بحدیث مثله ان کانوا صادقین)

(طور ۳۴۔۳۳)

یا یہ کہتے ہیں کہ نبی نے قرآن گڑھ لیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں اگر یہ اپنی باتوں میں سچے ہیں تو یہ بھی ایسا ہی کوئی کام لے آئیں۔

(ام یقولون افتریٰه قل فتوا بسورةٍ مثله وادعوا من استطعتم من دون الله ان کنتم صٰدقین) (یونس ۳۸)

کیا یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسے پیغمبر نے گڑھ لیا ہے تو کہہ دیجئے کہ تم اس کے جیسا ایک ہی سورہ لے آؤ اور خدا کے علاوہ جسے چاہو اپنی مدد کے لئے بلالو اگر تم الزام میں سچے ہو۔

کفار ومشرکین عرب، جو سخنوری کے استاد اور ملک فصاحت و بلاغت کے فرمانروا تھے، سخنوری میں اس تکبر وغرور کے باوجود اس دعوت کو قبول کرنے سے پہلو تہی کرتے ہوئے مقابلہ سے چشم پوشی کی اور کلام کے مقابلہ کو خونین مقابلہ میں تبدیل کرنے پر مجبور ہوئے یعنی ان کے لئے رسوائی اور مقابلہ کی نسبت قتل ہونا زیادہ آسان تھا۔

عرب سخنور قرآن مجید کا جواب لانے سے عاجز ہوئے، نہ صرف نزول قرآن کے زمانے میں زندگی گزارنے والے، بلکہ جو نزول قرآن کے زمانے کے بعد پیدا ہوئے وہ بھی اس کا کوئی جواب نہ لا سکے اور مقابلے کے بعد شکست کھا کر پیچھے ہٹ گئے۔ انسان کی فطرت ہمیشہ اس چیز کی طرف مائل ہوئی ہے کہ اس سے کوئی شاہکار یا ہنر ظاہر ہو جائے اور لوگوں کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرے، اگرچہ یہ کارنامہ مکہ بازی اور رسی کھینچنے کے مانند معاشرہ میں براہ

راست اثر بھی نہ رکھتا ہو، پھر بھی لوگوں کی ایک جماعت اس کی جیسی مثال یا اس سے بہتر مثال پیش کرنے اور اس کا مقابلہ کرنے کی فکر میں لگ جاتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے بھی گھات میں کچھ لوگ ہمیشہ رہے ہیں کہ اگر اس آسمانی کتاب سے مقابلہ کرنے کی فرصت مل جائے تو اس سے گریز نہ کریں گے۔

یہ لوگ مقابلہ سے عاجز آچکے تھے اور سحر و جادو کو بہانہ بنا کر یہ نہیں کہہ سکے کہ قرآن مجید جادو ہے، کیونکہ جادو ایک ایسا عمل ہے جو خاصیت کے مطابق حق کو باطل اور باطل کو حق ظاہر کرتا ہے، جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ کے روپ میں پیش کرتا ہے اور اگر قرآن مجید اپنے زیبا لحن اور فصیح نظم سے دلوں کو جذب کرتا ہے تو یہ اس کی فطری خاصیت کی زیبائی ہے اور علم جادو سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے .اگر لفظ کے ذریعہ کچھ مقاصد کی طرف دعوت دیتا ہے اور کچھ معارف کے بارے میں لوگوں کو یاد دہانی کراتا ہے کہ انسانی شعور اور خداداد فطرت سے ان کی حقیقت کو سمجھ سکیں اور لوگوں کو کچھ رفتار و کردار کا جیسے: حق شناسی، نیک نیتی، عدل و انصاف اور انسان دوستی کو قبول کرنے پر مجبور کرے تو ان کی تعریف کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔

چونکہ قرآن مجید، حقیقت کو بیان کرنے کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہے، اس لئے یہ لوگ عاجز ہو کر یہ بھی نہ کہہ سکے ہیں کہ قرآن مجید کلام بشر سے مافوق ہے اس لئے کہ زیبائی، دلکشی، بلاغت اور کشش میں بے نظیر ہے اور یہ اس کے کلام خدا ہونے کی دلیل نہیں بن سکتی ہے۔

دوسرے الفاظ میں یہ کہا جائے کہ ہر ایک صفت یا مہارت، جیسے جرئت، شجاعت، پڑھنا اور

لکھنا وغیرہ جو قابل ترقی ہے، لامحالہ تاریخ بشریت میں ان میں سے ایک غیر معمولی ذہنیت والا مقابلہ میں جیت کر اول آتا ہے، کیا حرج ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عربی بول چال کے اس مقابلہ میں کامیاب قرار پا کر فصاحت و بلاغت میں اول آئیں، اس صورت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کا کلام باوجود اس کے کہ کلام بشر ہے نا قابل مناقشہ ہوگا۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہم عصر سخن وروں نے یہ بات نہیں کہی اور نہ ہی قرآن مجید کے حریفوں میں سے کوئی شخص یہ کہہ سکا اور ثابت کر سکا، کیونکہ ہر صفت یا مہارت جو کسی غیر معمولی ہنر مند کے ذریعہ ترقی کے کمال تک پہنچتی ہے، کچھ بھی آخر کار یہ ایک ایسا امر ہے جو انسان کی قابلیت اور استعداد سے وجود میں آتا ہے اور فطرت بشر کا نتیجہ ہے، لہذا یہ کام دوسروں کے لئے ممکن ہے کہ اس غیر معمولی ذہین شخص کے نقش قدم پر چل کر ضروری سعی و کوشش کے ذریعہ اسی غیر معمولی ذہین انسان کی طرح ایک کارنامہ انجام دیں اگرچہ کسی بھی جہت سے اس سے بہتر نہ ہو۔

اس حالت میں مذکورہ غیر معمولی شخص، جو راستہ کھولنے والا پہلا شخص ہے، صرف پیشوا اور پیش رو ہو سکتا ہے، مثلاً سخاوت میں حاتم طائی سے بلند کوئی شخص نہیں ہو سکتا ہے، لیکن اس کے جیسا کام انجام دیا جا سکتا ہے، خوشنویسی میں میر کے برابر اور نقاشی میں مانی کے مقام تک نہیں پہنچ سکتے ہیں، لیکن مناسب کوشش اور جستجو کے نتیجہ میں میر کے نہج پر ایک کلمہ لکھا جا سکتا ہے یا مانی کے اسلوب پر نقاشی کا ایک چھوٹا سا نمونہ بنایا جا سکتا ہے۔

اس عام قانون کی بنا پر، اگر قرآن مجید فصیح و بلیغ ترین انسانی کلام (نہ کلام خدا) ہوتا تو

دوسروں کے لئے خاص کر دنیا کے نامور سخن وروں کے لئے ممکن تھا کہ اسی اسلوب کا تجربہ کر کے، ایک کتاب یا کم از کم قرآن مجید کے سوروں کے مانند ایک سورہ کو بناتے۔

قرآن مجید نے مقابلہ کے مرحلہ میں لوگوں سے اپنے جیسے کلام کا تقاضا کیا ہے نہ کہ اس سے بہتر کا:

(فلیاتوا بحدیث مثله) (طور ۳۴)

(فاتوا بسورة مثله) (یونس ۳۸)

(فاتوا بعشر سور مثله مفتریٰت) (هود ۱۳)

(لا یاتون بمثله ولو کان بعضهم لبعض ظهیرا) (اسراء ۸۸)

قرآن مجید کی تعلیمات

قرآن مجید ۲۳ سال کے عرصہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کے دوران تدریجاً نازل ہوا اور انسانی معاشرہ کی ضرورتوں کا حل پیش کیا۔

قرآن مجید، ایک ایسی کتاب ہے کہ خود اس کے بیانات کے مطابق لوگوں کی سعادت کی طرف رہنمائی کے علاوہ اس کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ صحیح اعتقاد، پسندیدہ اخلاق اور شائستہ عمل، جو انسان کے انفرادی و اجتماعی سعادت کی بنیادیں ہیں، کی فصیح زبان میں تعلیم دیتا ہے:

(۔۔۔ونزّلنا علیك الکتٰب تبیٰنا لکلّ شیء۔۔۔) (نحل ۸۹)

اور ہم نے آپ پر کتاب نازل کیا ہے جس میں ہر شے کی وضاحت موجود ہے

قرآن مجید نے اسلامی معارف کو خلاصہ کے طور پر بیان کیا ہے۔ان معارف کی تفصیلات خاص کر فقہی مسائل کی وضاحت کے لئے ،لوگوں کو خانہ نبوت کا دروازہ کھٹکھٹانے کی طرف ہدایت کرتا ہے چنانچہ فرماتا ہے:

(...وانزلنا الیك الذّکر لتبیّن للنّاس مانزّل الیهم ...) (نحل ۴۴)

اورآپ کی طرف بھی ذکرکو(قرآن) نازل کیا ہے تاکہ ان کے لئے ان احکام کو واضح کردیں جوان کی طرف نازل کئے گئے ہیں...

(وما انزلنا علیك الکتب الّا لتبیّن لهم الذی اختلفوا فیه ...)

(نحل ٦٤)

اورہم نے آپ پر کتاب صرف اس لئے نازل کی ہے کہ آپ ان مسائل کی وضاحت کردیں جن میں یہ اختلاف کئے ہوئے ہیں

جان لیجئے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کتاب خدا کی تفسیر اوردین کے معارف کی وضاحت کے لئے اپنے اہل بیت علیہم السلام کے کلام کو اپنے کلام کے مانند قرار دیتے ہوئے فرمایا:

قرآن مجید اور میرے اہل بیت قیامت کے دن تک ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے اور جو بھی شخص قرآن مجید سے استفادہ کرنا چاہتا ہے، اسے میرے اہل بیت کے دامن کو پکڑنا چاہئے۔(۱)

....

ا۔حقاق الحق،ج۹،ص۳۰۹۔۳۷۵۔

قرآن مجید کی نظر میں علم وجہل

قرآن مجید میں علم ودانش کی جوتعریف اورغوروحوض کی جوتشویق کی گئی ہے،وہ کسی اورآسمانی کتاب میں پائی نہیں جاتی۔اسی طرح جہل ونادانی کی جوسرزنش کی گئی ہے وہ بھی قرآن مجید کے خصوصیات میں سے ہے۔قرآن مجید نےعلم ودانش کوزندگی اورجہل ونادانی کوموت سے تعبیر کیاہے۔اوراسلام سےقبل فساد سے بھرے ماحول کو(جاہلیت) کاماحول کہاہے چنانچہ فرماتاہے:

(۔۔۔ھل یستوی الّذین یعلمون والّذین لا یعلمون۔۔)

(زمر۹)

کیاوہ لوگ جوجانتے ہیں ان کے برابرہوجائیں گےجونہیں جانتے؟

(اومن کان میتا فاحیینہ وجعلنا لہ نورا یمشی بہ فی الناس کمن مثلہ فی الظّلمات لیس بخارج منہا۔۔۔)(انعام۱۲۲)

جوشخص مردہ تھا پھرہم نے اسے زندہ کیااوراس کے لئے ایک نورقراردیا جس کےسہارے وہ لوگوں کےدرمیان چلتاہےاس کی مثال اس شخص کی سی ہوسکتی ہے جوتاریکیوں میں ہواوران سےنکل بھی نہ سکتاہو ۔

(۔۔۔فانها لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور) (حج ۴۶)

...درحقیقت آنکھیں اندھی نہیں ہوتی ہیں بلکہ وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں کے اندر پائے جاتے ہیں

(۔۔۔لهم قلوب لا یفقهون بها و لهم اعین لا یبصرون بها ولهم آذان لا یسمعون۔۔) (اعراف۱۷۹)

...ان کے پاس دل ہیں مگر سمجھتے نہیں ہیں اور آنکھیں ہیں دیکھتے نہیں ہیں اور کان ہیں سنتے نہیں ہیں۔ یہ چوپایوں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں...

(ومایستوی الاعمی والبصیر ٭ولا الظلمات ولا النور ٭ولا الظل ولا الحرور ٭ ومایستوی الاحیاء ولا الاموات۔۔) (فاطر ۲۲۱۹)

اور اندھے اور بینا برابر نہیں ہو سکتے اور تاریکیاں اور نور دونوں برابر نہیں ہو سکتے اور سایہ اور دھوپ دونوں بر بر نہیں ہو سکتے اور زندہ اور مردے برابر نہیں ہو سکتے...

خدائے متعال اپنے کلام پاک کی بہت سی آیتوں میں، انسان کو غور و فکر، اور تدبر کی ترغیب اور تشویق فرماتا ہے اور اپنے بندوں کو حکم دیتا ہے کہ آسمانوں، زمین اور ان میں موجود گوناگون مخلوق کی خلقت کے بارے میں غور و فکر کریں، بالخصوص انسان کی خلقت کے بارے میں غور و فکر سے کام لیں گزشتہ ملتوں اور امتوں کی تاریخ، آثار، رسومات، عادات اور طور طریقوں، جو حقیقت میں مختلف علوم وفنون انسانی ہیں، مطالعہ کی تاکید کرتا ہے اور ان مطالعات کے ذریعہ اپنی حقیقی سعادت حاصل کریں۔ اور جان لینا چاہئے کہ فنی نظریات اور

علمی مسائل کی چھان بین کرنا اس دنیا کی چندروزہ محدود زندگی کی فلاح وبہبود کے لئےنہیں ہے بلکہ علمی مطالعات کی بنیاد پر جاودانی حیات کی سعادت وآسائش حاصل کرنے ہونا چاہیۓ۔

خالق کائنات کے بارے میں قرآن مجید کی تعلیم

(...افی اللّٰہ شكٌّ فاطر السّمٰوات والارض...) (ابراھیم ۱۰)

کیا تمھیں اللہ کے بارے میں شک ہے جو زمین وآسمان کا پیدا کرنے والا ہے....؟

وضاحت

دن کے اجالے میں تمام چیزیں آنکھوں کے سامنے نمایاں ہوتی ہیں، ہم اپنے آپ کو، گھر، شہر، بیابان، پہاڑ، جنگل اور دریا کو دیکھتے ہیں۔لیکن جب رات کا اندھیرا چھا جاتا ہےتو تمام وہ چیزیں جو روشن ونمایاں تھیں، اپنی روشنی کو کھودیتی ہیں، ہم اس وقت سمجھتے ہیں کہ ان کی وہ روشنی اپنی نہیں تھی بلکہ سورج سے مربوط تھی کہ وہ ایک قسم کے رابطہ کی وجہ سے انھیں روشن کئے ہوئے تھا۔سورج بذات خود روشن ہے اور اپنے نور سے زمین اور اس میں موجود تمام چیزوں کو روشن اورنمایان کرتا ہے۔اگر ان اشیاء کی روشنی اپنی ہوتی تو ہرگز اسے کھونہیں دیتیں۔

انسان اور دیگر تمام زندہ حیوانات اپنی آنکھوں، کانوں اور دیگر حواس سے اشیاء کودرک کرتے ہیں اور ہاتھ، پاؤں اور تمام اندرونی وبیرونی اعضاء سے سرگرمی انجام دیتے ہیں،لیکن وہ بھی

ایک مدت کے بعد حس وحرکت کو کھو کر کسی قسم کی سرگرمی انجام نہیں دے پاتے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جائے کہ وہ مرجاتے ہیں۔

ہم اس چیز کا مشاہدہ کرنے کے بعد فیصلہ کرتے ہیں کہ ان جانداروں سے ظاہر ہونے والا شعور، ارادہ اور تحرک، ان کے جسم و بدن سے نہیں ہے، بلکہ ان کی روح وجان سے ہے کہ جس کے نکل جانے کے بعد اپنی زندگی اور تحرک کو کھو دیتے ہیں۔

اگر دیکھنے اور سننے کا تعلق مثلا صرف آنکھ اور کان سے ہوتا، تو جب تک یہ دونوں عضو موجود ہوتے دیکھنا اور سننا بھی جاری رہنا چاہئے تھا، جبکہ ایسا نہیں ہے۔

اسی طرح یہ عظیم کائنات کہ، جس کے اجزاء میں سے ہم بھی ایک جزو اور ایک وجود ہیں ہرگز شک وشبہ نہیں کرسکتے، کہ یہ کائنات اور ناقابل انکار خلقت، اگر خود سے ہوتی، تو ہرگز اسے کھونہ دیتی، جبکہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ اس کے اجزاء یکے بعد دیگرے اپنے وجود کو کھو دیتے ہیں اور ہمیشہ تغییر وتبدل کی حالت میں ہوتے ہیں، یعنی ایک حالت کو کھو کر دوسری صورت اختیار کرتے ہیں۔

لہذا ہمیں قطعی فیصلہ کرنا چاہئے کہ تمام مخلوقات کی خلقت اور وجود کا سرچشمہ کوئی دوسری چیز ہے جو ان کا خالق اور پروردگار ہے اور جوں ہی خلقت کا رابطہ اس ذات سے ٹوٹ جاتا ہے تو وہ نیستی ونابودی کے دریا میں غرق ہوجاتی ہے۔

قرآن مجید کا احترام

معارف و احکام کا خزانہ اسلام کی آسمانی کتاب قرآن مجید ہے، جسے خدائے متعال نے وحی کے ذریعہ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ پر نازل فرمایا ہے۔

قرآن مجید دنیا کے مسلمانوں کی مادی و معنوی زندگی کا نہایت گرانقدر پشت پناہ ہے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو بارہا اس کتاب کی اسی عنوان سے تاکید کیا ور مکرر طور پر (خاص کر اپنی زندگی کے آخری ایام میں) لوگوں سے فرمایا ہے:

میں اپنے بعد دو گراں بہا چیزیں تم لوگوں میں چھوڑ رہا ہوں جو قیامت تک ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گی، جب تک تم ان دونوں سے متمسک رہو گے، ہرگز گمراہ نہیں ہو گے، ان میں سے ایک قرآن مجید ہے اور دوسری میری عترت (اہل بیت) ہیں، جو قرآن مجید کو بیان کرنے والے ہیں۔

قرآن مجید کے تقدّس اور احترام کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ یہ:

۱۔کلام خدا ہے۔

۲۔پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ کی قطعی اور زندہ سند ہے۔

۳۔اسلام کے بنیادی قانون کا حامل ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: قرآن مجید سے جدا نہ ہونا، کیونکہ اس میں آپ کے اسلاف مستقبل میں آپ کے آنے والوں کے حالات موجود ہیں اور آپ لوگوں کے درمیان عدل وانصاف سے حکومت کرتا ہے۔

راہ خدا میں جہاد اور فداکاری کے متعلق قرآن کا دستور

اجتماعی طریقے، ایک پھل دار درخت کے مانند ہیں، جسے شگوفہ دینے، پھلنے اور پھولنے کے لئے ایک مناسب زمیں میں لگانا چاہیئے، پھر اس کی آبیاری کرنی چاہیئے تا کہ زمین میں اسکی جڑیں مضبوط و مستحکم ہوجائیں، اوراس کے بعد وہ نشو ونما پائے اور اس میں مناسب موسم میں، شگوفے نکلیں اور پھل آئیں۔

اسلام کا یہ درخت سو فیصدی اجتماعی دین ہے، اس کے مکمل موثر ہونے کے لئے مندرجہ ذیل مراحل کا طے کرنا ضروری ہے:

۱۔لوگ اسے قبول کریں۔

۲۔تربیت کے ذریعہ، اس کی حفاظت کی جائے تا کہ اپنی زندگی کو جاری رکھ سکے۔

۳۔اس کے قوانین کی عملی مخالفت کی روک تھام کی جائے، اور حوادث کے گزند سے ان کی حفاظت کی جائے تا کہ اپنے آثار وفوائد کو انسانی معاشرہ میں پھیلاسکیں۔

بحث کا خاتمہ

بحث کے اختتام پر یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید نے صرف فصاحت و بلاغت کی دلکشی سے ہی دوسروں کو عاجز نہیں کیا ہے، بلکہ اس لحاظ سے بھی عاجز کیا ہے، کہ اس میں انسان کی

تمام ضرورتوں کا حقیقی حل موجود ہے اور غیبی خبروں کے اعتبار سے بھی کہ جن کی اس نے پیشنگوئی کی ہے اور کچھ حقائق بیان بھی کئے ہیں اور دیگر جہات سے بھی جو اس آسمانی کتاب میں پائے جاتے ہیں، قرآن مجید چلینج کرتے ہوئے اعلان کرتا ہے کہ اس کی مثال پیش نہیں کر سکتے ہو۔

۳۔معاد یا قیامت

معاد، دین مقدس اسلام کے تین اصولوں میں سے ایک اصول ہے اور اس مقدس دین کی ضروریات میں سے ہے۔

قرآن مجید کی سینکڑوں آیات اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اطہار علیہم السلام کی ہزاروں روایتیں پوری وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہیں کہ خدائے متعال اپنے تمام بندوں کو موت کے بعد ایک معین دن کو پھر سے زندہ کرے گا اور ان کا اعمال کا حساب لے گا۔ پھر نیک کام انجام دینے والوں کو ابدی نعمت ولذت سے نوازے گا اور بدکرداروں کو ان کے کیفر کردار تک پہنچا کر ابدی عذاب میں مبتلا کرے گا۔

خدائے متعال قرآن مجید میں فرماتا ہے کہ تمام گذشتہ پیغمبروں نے، معاد اور روز قیامت کے بارے میں لوگوں کو یاددہانی کرائی ہے۔

دوسرے آسمانی ادیان بھی دین اسلام کے مانند، معاد کو ثابت کرتے ہیں، اس کے علاوہ آثار

قدیمہ کے توسط سے ہزاروں سال پرانی قبروں کی کھدائی سے ایسے آثار و علائم ہاتھ آرہے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا اور ماقبل تاریخ کے بشر بھی انسان کے لئے موت کے بعد ایک قسم کی زندگی کا قائل تھا، اور یہاں سے یہ بات سمجھی جاسکتی ہے انسان اپنی سادہ سوچ سے بھی نیک انسانوں کے لئے جزا اور بدکاروں کے لئے سزا کا قائل ہے اور اس کے لئے ایک معین دن کو جانتے ہیں، چونکہ ایسا دن اس دنیا میں موجود نہیں ہے، اس لئے اس کا دوسری دنیا میں ہونا ضروری ہے۔

ادیان و ملل کی نظر میں معاد

تمام وہ مذاہب، جو خدا کی پرستش کی دعوت دیتے ہیں اور انسان کو نیک کام انجام دینے کا حکم اور بدکاری سے روکتے ہیں، وہ موت کے بعد معاد اور دوسری زندگی کے قائل ہیں، کیونکہ وہ ہرگز معین نہیں کرتے ہیں کہ نیک کام کی اس وقت قدر و قیمت ہوگی جب نیکی کی جزا ہوگی اور چونکہ یہ جزا اس دنیا میں دیکھی نہیں جاسکتی ہے، اس لئے مرنے کے بعد دوسری دنیا اور ایک دوسری زندگی میں اس کا ہونا ضروری ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اس دن کو کہ جسے قیامت کا دن کہا ہے، پوری وضاحت سے ثابت کیا ہے اور اس کی ناقابل انکار حالت میں تعارف کراتا ہے۔ اس پر اعتقاد کو دین کے تین اصولوں میں سے ایک شمار کرتا ہے اور قرآن مجید میں اسی مطلب کو سابقہ پیغمبروں کی دعوت سے نقل کرتا ہے۔

اس کے علاوہ، آثار قدیمہ کے کشف ہوئے بہت سے مقبروں سے کچھ ایسے آثار و علامتیں پائی گئی ہیں، جو اس چیز پر دلالت کرتی ہیں کہ قدیم انسان موت کے بعد دوسری زندگی پر ایمان رکھتا تھا اور اپنے عقائد کے مطابق کچھ فرائض انجام دیتا تھا تا کہ لوگ اس دنیا میں آرام و آسائش حاصل کریں۔

قرآن مجید کی نظر میں معاد

قرآن مجید نے سیکڑوں آیات میں معاد سے لوگوں کو آگاہ کیا ہے، اور اس کے بارے میں ہر قسم کے شک وشبہہ کی نفی کی ہے بصیرت کی افزائش اور عدم امکان کو دور کرنے کے لئے اور اشیاء کی اولین خلقت اور خدا کی قدرت مطلقہ کے بارے میں بہت سے مواقع پر لوگوں کو یاددہانی کراتے ہوئے فرماتا ہے:

(اولم یر الانسان انا خلقناہ من نطفۃ فاذا ھو خصیم مبین٭ و ضرب لنا مثلاونسی خلقه قال من یحی العظام و ھی رمیم٭ قل یحییها الذی انشأھا اوّل مرّۃ و ھو بکل خلقٍ علیم) (یٰسین۷۷۔۷۹)

تو کیا انسان نے یہ نہیں دیکھا کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا ہے اور وہ یکبارگی ہمارا کھلا ہوا دشمن ہوگیا ہے اور ہمارے لئے مثل بیان کرتا ہے اور اپنی خلقت کو بھول گیا ہے، کہتا ہے کہ ان بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرسکتا ہے؟ آپ کہہ دیجئے کہ جس نے پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے وہی زندہ بھی کرے گا اور وہ ہر مخلوق کا بہتر جاننے والا ہے

اور کبھی جاڑے میں مردہ ہوجانے والی زمین کو بہار میں زندہ کرکے لوگوں کے انکار کو خدا کی قدرت کی طرف متوجہ کیا ہے، چنانچہ فرماتا ہے:

(ومن آیاتہ انك تری الارض خشعة فاذا انزلنا علیها الماء اهتزّت وربت انّ الذی احیاها لمحی الموتی انه علی کل شیء قدیر) (فصلت۳۹)

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ تم زمین کو صاف اور مردہ دیکھ رہے ہو اور پھر جب ہم نے پانی برسادیا تو زمین لہلہانے لگی اور اس میں نشوونما پیدا ہوگئی، بیشک جس نے زمین کو زندہ کیا ہے وہی مردوں کا زندہ کرنے والا بھی ہے اور یقیناوہ ہر شے پر قادر ہے

اور کبھی عقلی استدلال سے سامنے آکر انسان کی خداداد فطرت کو اس حقیقت کے اعتراف پر ابھارا ہے، چنانچہ فرماتا ہے:

(وما خلقنا السماء والارض وما بینهما باطلاً ذلك ظنّ الذین کفروا فویل للّذین کفروا من النّار ۔ ام نجعل الذین آمنوا و عملوا الصٰلحت کالمفسدین فی الارض ام نجعل المتقین کالفجّار) (ص۲۷۔۲۸)

اور ہم نے آسمان اور زمین اور ان کے درمیان کی مخلوقات کو بیکار نہیں پیدا کیا ہے(کیونکہ اگر مقصد یہی ہوتا کہ مثلاً انسان پیدا ہوتا اور چند دن گھومنے کے بعد سوتا اور مرجاتا اور اس طرح دوسرا انسان آتا اور اس سلسلہ کی تکرار ہوتی تو کائنات کی خلقت بیہودہ اور ایک کھلونے سے زیادہ نہ ہوتی، جبکہ بیہودہ کام خدا سے کبھی انجام نہیں پاتا ہے) یہ تو صرف کافروں کا خیال ہے اور کافروں کے لئے جہنم میں ویل کی منزل ہے کیا ہم ایمان لانے والے اور نیک عمل کرنے والوں کو زمین میں فساد برپا کرنے والوں جیسا قرار دیدیں یا صاحبان تقوی کو فاسق و فاجر

افراد جیسا قرار دیدیں۔ (کیونکہ اس دنیا میں اچھا اور برا کام انجام دینے والے اپنے اعمال کی مکمل جزا نہیں پا سکتے، اگر دوسری دنیا نہ ہوتی، کہ جہاں ان دونوں گروہوں کو ان کی رفتار و کردار کے مطابق واقعی سزا ملتی تو وہ دونوں گروہ خدا کے نزدیک یکسان ہوتے اور یہ عدل الٰہی کے خلاف ہے)۔

موت سے قیامت تک

بدن مرتا ہے نہ کہ روح

اسلام کی نظر میں، انسان، روح و بدن سے تشکیل پائی ہوئی ایک مخلوق ہے۔ انسان کا جسم بھی بذات خود مادہ اور مادہ سے مربوط قوانین کی ترکیبات میں سے ایک ہے، یعنی اس کے لئے حجم اور وزن ہے۔ اس کی زندگی ایک زمان ومکان میں ہے، سردی، گرمی وغیرہ سے متاثر ہوتا ہے اور تدریجاً بوڑھا اور کمزور ہوتا ہے اور ایک دن خدائے متعال کے حکم سے پیدا ہوا تھا ،آخرکار ایک دن تجزیہ ہو کر نابود ہو جاتا ہے۔

لیکن روح، مادی نہیں ہے اور مادہ کی مذکورہ خاصیتوں میں سے کوئی ایک اس میں نہیں پائی جاتی ہے، بلکہ علم، احساس، فکر اور ارادہ کی صفت کے علاوہ دوسری معنوی صفات جیسے: محبت ،کینہ، خوشی غم، اور امید وغیرہ اس سے مخصوص ہیں۔ اور چونکہ روح میں مادہ کی مذکورہ خصوصتیں نہیں پائی جاتیں۔ لہذا معنوی خاصیتیں بھی مادی خاصیتوں سے الگ ہیں، بلکہ دل ودماغ

اور بدن کے دوسرے تمام اجزاء اپنی بے شمار سرگرمیوں میں روح اور معنوی صفات کے تابع ہوتے ہیں ،اور بدن کے اجزاء میں سے کسی ایک کوفرمانروا کا مرکز قرارنہیں دیا جاسکتا ۔خدائے متعال فرماتا ہے:

(ولقد خلقنا الانسٰن من سلٰلةٍ من طين٭ ثم جعلناه نطفة فی قرار مكين٭ ثم خلقنا النطفة علقة فخلقنا العلقة مضغة فخلقنا المضغة عظٰما فكسونا العظٰم لحماً ثم انشأنه خلقا آخر...) (مؤمنون۱۴۔۱۲)

اورہم نے انسان کو گیلی مٹی سے پیدا کیا ہے پھر اسے ایک محفوظ جگہ پر نطفہ بنا کر رکھا ہے، پھر نطفہ کو علقہ بنایا ہے اور پھر علقہ سے مضغہ پیدا کیا ہے اور پھر مضغہ سے ہڈیاں پیدا کی ہیں اور پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا ہے، پھر ہم نے اسے ایک دوسری مخلوق بنادیا ہے...

اسلام کی نظر میں موت کے معنی

مذکورہ اصل کے مطابق اسلام کی نظر میں موت کا معنی یہ نہیں ہے کہ انسان نابود ہوتا ہے، بلکہ یہ ہے کہ انسان کی روح لافانی ہے، بدن سے اسکا رابطہ منقطع ہوجاتا ہے، نتیجہ میں بدن نابود ہو جاتا ہے اور روح بدن کے بغیر اپنی زندگی کو جاری رکھتی ہے۔خدائے متعال فرماتا ہے:

(وقالوا أاذا ضللنا فی الارض أءِنّا لفی خلق جديد بل هم بلقاء ربهم كافرون ٭قل يتوّفكم ملك الموت الذی وُكِّل بكم ...) (سجده۱۱۔۱۰)

اور کہتے ہیں کہ اگر ہم زمین میں گم ہوگئے (مرگئے) تو کیا نئی خلقت میں پھر ظاہر کئے جائیں

گے۔بات یہ ہے کہ یہ اپنے پروردگار کی ملاقات کے منکر ہیں۔آپ کہہ دیجئے کہ تم کو وہ ملک الموت زندگی کی آخری منزل تک پہنچائے گا جو تم پر تعینات کیا گیا ہے۔

برزخ

اسلام کا نظریہ ہے کہ انسان،مرنے کے بعد ایک خاص طریقے سے زندہ رہتا ہے۔اگر اس نے نیکی کی ہو تو اسے نعمت وسعادت ملتی ہے اور اگر برا تھا تو عذاب میں ہوگا،اور جب قیامت برپا ہوگی تو اسے عام حساب وکتاب کے لئے حاضر کیا جائے گا۔جہاں پر انسان مرنے کے بعد قیامت تک زندگی کرتا ہے اسے عالم برزخ کہتے ہیں۔اس سلسلہ میں خدائے متعال فر ماتا ہے:

(...ومن ورآئھم برزخ الی یوم یبعثون) (مؤمنون ۱۰۰)

...اوران کے پیچھے ایک عالم برزخ ہے جو قیامت کے دن تک قائم رہنے والا ہے

(ولا تحسبنَّ الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا بل احیاء عند ربھم یرزقون) (آل عمران ۱۶۹)

اورخبردار راہ خدا میں قتل ہونے والوں کو مردہ خیال نہ کرنا وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے یہاں رزق پا رہے ہیں۔

قیامت یقینی ہے

ہر انسان (بلا استثنا) اپنی خداداد فطرت سے، اچھائی اور برائی کام میں فرق کو محسوس کرتا ہے اور نیک کام کو (اگر چہ اس پر عمل نہ کرتا ہو) اچھا اور لازم العمل جانتا ہے اور برے کام کو (اگر چہ اس میں پھنسا بھی ہو) برا اور لازم الاجتناب جانتا ہے۔ اس میں کسی قسم کا شک وشبہہ نہیں ہے کہ اچھائی اور برائی، نیکی اور بدی ان دونوں صفتوں میں موجود سزا اور جزا کی جہت سے ہے اور اس میں کوئی شک وشبہہ نہیں ہے کہ اس دنیا میں کوئی ایسا دن نہیں ہے جس میں اچھے اور برے انسانوں کو ان کی اچھائی اور برائی کی سزا اور جزا دی جائے، کیونکہ ہم اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں کہ بہت سے نیک انسان اپنی زندگی انتہائی تلخی اور سختی میں گزارتے ہیں اور بہت سے برے انسان جو گناہ اور ظلم وستم میں آلودہ ہیں لیکن پھر بھی خوشی اور آرام وآسائش میں زندگی گزارتے ہیں۔

اس بنا پر، کہ اگر انسان کے لئے اپنے مستقبل میں اور اس دنیا کے علاوہ دوسری دنیا میں ایک ایسا دن نہ ہو کہ جس میں اس کے نیک اور برے اعمال کا حساب کر کے اسے مناسب سزا و جزا دی جائے، یہ نظریہ (نیک کام اچھا اور واجب الاطاعت ہے اور برا کام برا اور واجب الاجتناب ہے) انسان کی فطرت میں قرار پایا ہے۔

یہ تصور نہیں کیا جانا چاہئے کہ نیک کام کرنے والوں کی جزا جسے انسان اچھا سمجھتا ہے۔ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ معاشرہ کے انتظامات برقرار ہوتے ہیں اور نیک لوگ زندگی کی سعادت حا

صل کرتے ہیں اور نتیجہ میں اس منافع کا ایک حصہ خود نیکی کرنے والے کو ملتا ہے اور اسی طرح بدکار اپنے نامناسب کردار سے، معاشرہ کو درہم برہم کر دیتا ہے اور اسکا نامناسب کام آخر کار خود اس کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے، کیونکہ یہ تصور اگر چہ سماج کے پسماندہ اور مفلس طبقہ کے لوگوں میں کسی حد تک پایا جاتا ہے لیکن جو لوگ اپنی قدرت کے عروج پر پہنچے ہیں اور معاشرہ کا انتظام وخلل ان کی خوشبختی اور کامیابی میں موثر نہیں ہے، بلکہ معاشرہ میں جس قدر افراتفری اور فساد ہو اور لوگوں کے حالات بدتر ہوں وہ زیادہ خوشحال اور کامیاب ہوتے ہیں اور کوئی دلیل نہیں ہے کہ ان افراد کی فطرت نیک کام کو نیک اور برے کام کو برا جانے! یہ بھی تصور نہیں کرنا چاہئے کہ یہ لوگ اگر چہ اپنی چند روزہ زندگی میں کامیاب رہے ہوں، لیکن کسی وجہ سے ان کا نام ہمیشہ کے لئے عام طور پر آنے والی نسلوں کی نظروں میں ننگ و عار سمجھا جائے گا، کیونکہ ان کے نام کا ننگ وعار کی صورت میں ظاہر ہونا اور لوگوں کا ان کے بارے میں خیال رکھنا اس وقت ہوگا، جب وہ مر چکے ہوں گے اور اس ننگ وعار کا ان کی اس دنیا میں گئے خوشحال اور لذت اندوز زندگی پر کسی قسم کا اثر نہیں پڑے گا۔

اس صورت میں کوئی دلیل نہیں ہوگی کہ انسان نیک کام کو اچھا جان کر اسے انجام دے اور برے کام کو برا جان کر اس سے پرہیز کرے، اور اس طرح مذکورہ نظریہ کا قائل ہو۔ اگر معاد کا وجود نہ ہو تو یہ اعتقاد قطعاً ایک خرافائی اعتقاد ہوگا۔

لہذا ہمیں خالق کائنات کی طرف سے ہماری فطرت میں ودیعت کئے گئے اس مقدس اور مستحکم اعتقاد سے یہ سمجھنا چاہئے کہ معاد کا ہونا ضروری ہے اور انسان کے لئے ضرور ایک

دن ایسا آئے گا، جس دن اسے خالق کائنات کے حضور اس کی رفتار و کردار کے حساب و کتاب کے لئے پیش کیا جائے گا جہاں پر اسے نیک کاموں کی جزا اور برے کاموں کی سزا دی جائے گی۔

۳۔معادیا قیامت

معاد ، دین مقدس اسلام کے تین اصولوں میں سے ایک اصول ہے اور اس مقدس دین کی ضروریات میں سے ہے۔

قرآن مجید کی سیکڑوں آیات اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اطہار علیہم السلام کی ہزاروں روایتیں پوری وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہیں کہ خدائے متعال اپنے تمام بندوں کو موت کے بعد ایک معین دن کو پھر سے زندہ کرے گا اور ان کا اعمال کا حساب لے گا۔ پھر نیک کام انجام دینے والوں کو ابدی نعمت ولذت سے نوازے گا اور بدکرداروں کو ان کے کیفر کردار تک پہنچا کر ابدی عذاب میں مبتلا کرے گا۔

خدائے متعال قرآن مجید میں فرماتا ہے کہ تمام گذشتہ پیغمبروں نے، معاد اور روز قیامت کے بارے میں لوگوں کو یاددہانی کرائی ہے۔

دوسرے آسمانی ادیان بھی دین اسلام کے مانند، معاد کو ثابت کرتے ہیں، اس کے علاوہ آثار قدیمہ کے توسط سے ہزاروں سال پرانی قبروں کی کھدائی سے ایسے آثار وعلائم ہاتھ آرہے

ہیں،جن سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا اور ماقبل تاریخ کے بشر بھی انسان کے لئے موت کے بعد ایک قسم کی زندگی کا قائل تھا، اور یہاں سے یہ بات سمجھی جاسکتی ہے انسان اپنی سادہ سوچ سے بھی نیک انسانوں کے لئے جزا اور بدکاروں کے لئے سزا کا قائل ہے اور اس کے لئے ایک معین دن کو جانتے ہیں، چونکہ ایسا دن اس دنیا میں موجود نہیں ہے، اس لئے اس کا دوسری دنیا میں ہونا ضروری ہے۔

ادیان وملل کی نظر میں معاد

تمام وہ مذاہب، جو خدا کی پرستش کی دعوت دیتے ہیں اور انسان کو نیک کام انجام دینے کا حکم اور بدکاری سے روکتے ہیں، وہ موت کے بعد معاد اور دوسری زندگی کے قائل ہیں، کیونکہ وہ ہرگز معین نہیں کرتے ہیں کہ نیک کام کی اس وقت قدر و قیمت ہوگی جب نیکی کی جزا ہوگی اور چونکہ یہ جزا اس دنیا میں دیکھی نہیں جاسکتی ہے، اس لئے مرنے کے بعد دوسری دنیا اور ایک دوسری زندگی میں اس کا ہونا ضروری ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اس دن کو کہ جسے قیامت کا دن کہا ہے، پوری وضاحت سے ثابت کیا ہے اور اس کی نا قابل انکار حالت میں تعارف کراتا ہے۔ اس پر اعتقاد کو دین کے تین اصولوں میں سے ایک شمار کرتا ہے اور قرآن مجید میں اسی مطلب کو سابقہ پیغمبروں کی دعوت سے نقل کرتا ہے۔

اس کے علاوہ، آثار قدیمہ کے کشف ہوئے بہت سے مقبروں سے کچھ ایسے آثار و علامتیں

پائی گئی ہیں، جو اس چیز پر دلالت کرتی ہیں کہ قدیم انسان موت کے بعد دوسری زندگی پر ایمان رکھتا تھا اور اپنے عقائد کے مطابق کچھ فرائض انجام دیتا تھا تا کہ لوگ اس دنیا میں آرام و آسائش حاصل کریں۔

قرآن مجید کی نظر میں معاد

قرآن مجید نے سیکڑوں آیات میں معاد سے لوگوں کو آگاہ کیا ہے، اور اس کے بارے میں ہر قسم کے شک وشبہہ کی نفی کی ہے بصیرت کی افزائش اور عدم امکان کو دور کرنے کے لئے اور اشیاء کی اولین خلقت اور خدا کی قدرت مطلقہ کے بارے میں بہت سے مواقع پر لوگوں کو یاددہانی کراتے ہوئے فرماتا ہے:

(اولم یر الانسان انا خلقناہ من نطفة فاذا ھو خصیم مبین ٭ و ضرب لنا مثلا ونسی خلقه قال من یحی العظام و ھی رمیم ٭ قل یحییھا الذی انشأھا اوّل مرّۃ و ھو بکل خلقٍ علیم) (یٰسین ۷۷۔۷۹)

تو کیا انسان نے یہ نہیں دیکھا کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا ہے اور وہ یکبارگی ہمارا کھلا ہوا دشمن ہوگیا ہے اور ہمارے لئے مثل بیان کرتا ہے اور اپنی خلقت کو بھول گیا ہے، کہتا ہے کہ ان بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرسکتا ہے؟ آپ کہہ دیجئے کہ جس نے پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے وہی زندہ بھی کرے گا اور وہ ہر مخلوق کا بہتر جاننے والا ہے

اور کبھی جاڑے میں مردہ ہوجانے والی زمین کو بہار میں زندہ کر کے لوگوں کے انکار کو خدا کی

قدرت کی طرف متوجہ کیا ہے، چنانچہ فرماتا ہے:

(ومن آیاته انك تری الارض خشعة فاذا انزلنا علیها الماء اهتزت وربت ان الذی احیاها لمحی الموتی انه علی کل شیء قدیر) (فصلت۳۹)

اوراس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ تم زمین کو صاف اور مردہ دیکھ رہے ہو اور پھر جب ہم نے پانی برسا دیا تو زمین لہلہانے لگی اور اس میں نشو ونما پیدا ہو گئی، بیشک جس نے زمین کو زندہ کیا ہے وہی مردوں کا زندہ کرنے والا بھی ہے اور یقیناوہ ہر شے پر قادر ہے

اور کبھی عقلی استدلال سے سامنے آ کر انسان کی خداداد فطرت کو اس حقیقت کے اعتراف پر ابھارا ہے، چنانچہ فرماتا ہے:

(وما خلقنا السماء والارض وما بینهما باطلاً ذلك ظن الذین كفروا فویل للذین كفروا من النار* ام نجعل الذین آمنوا و عملوا الصلحت كالمفسدین فی الارض ام نجعل المتقین كالفجار) (ص۲۷۔۲۸)

اور ہم نے آسمان اور زمین اور ان کے درمیان کی مخلوقات کو بیکار نہیں پیدا کیا ہے(کیونکہ اگر مقصد یہی ہوتا کہ مثلاً انسان پیدا ہوتا اور چند دن گھومنے کے بعد سوتا اور مرجاتا اور اس طرح دوسرا انسان آتا اور اس سلسلہ کی تکرار ہوتی تو کائنات کی خلقت بیہودہ اور ایک کھلونے سے زیادہ نہ ہوتی، جبکہ بیہودہ کام خدا سے کبھی انجام نہیں پاتا ہے) یہ توصرف کافروں کا خیال ہے اور کافروں کے لئے جہنم میں ویل کی منزل ہے کیا ہم ایمان لانے والے اور نیک عمل کرنے والوں کو زمین میں فساد برپا کرنے والوں جیسا قرار دیدیں یا صاحبان تقوی کو فاسق و فاجر افراد جیسا قرار دیدیں۔(کیونکہ اس دنیا میں اچھا اور برا کام انجام دینے والے اپنے اعمال

کی مکمل جزا نہیں پا سکتے، اگر دوسری دنیا نہ ہوتی، کہ جہاں ان دونوں گروہوں کو ان کی رفتار و کردار کے مطابق واقعی سزا ملتی تو وہ دونوں گروہ خدا کے نزدیک یکساں ہوتے اور یہ عدل الٰہی کے خلاف ہے)۔

ائمہ ھدیٰ علیہم السلام

ائمہ ھدیٰ علیہم السلام، جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کے جانشین اور دین و دنیا کے پیشوا ہیں، بارہ ہیں۔ اس سلسلہ میں شیعہ و سنی دونوں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ سے بے شمار روایتیں نقل کی ہیں اور ان ائمہ میں سے ہر ایک نے اپنے بعد آنے والے امام کو معین فرمایا ہے۔

ائمہ علیہم السلام کے اسمائے گرامی

١۔ حضرت امیر المؤمنین علی بن ابیطالب علیہ السلام

٢۔ حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام

٣۔ حضرت امام حسین سید الشہداء علیہ السلام

٤۔ حضرت امام سجاد زین العابدین علیہ السلام

٥۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام

٦۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام

۷۔حضرت امام موسی کاظم علیہ السلام

۸۔حضرت امام علی رضا علیہ السلام

۹۔حضرت امام محمد تقی علیہ السلام

۱۰۔حضرت امام علی نقی علیہ السلام

۱۱۔حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام

۱۲۔حضرت امام عصر، حجتہ بن الحسن، عجل اللہ تعالی فرجہ الشریف

ائمۂ اطہار علیہم السلام کی عام سیرت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد بارہ امام ۲۵۰ سال تک لوگوں کے درمیان تھے۔لیکن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے دن سے ہی ان کے مخالفین پیدا ہوئے اور ہر ممکن وسیلہ سے،خلافت کے عہدے کو غصب کر کے دین کے فطری راستہ کو منحرف کر دیا اس کے علاوہ مذکورہ مخالفین کا گروہ ہر احتمالی خطرے کے مقابلہ میں اپنی حیثیت کو مستحکم کرنے اور اپنی حکومت کی حفاظت میں،اہل بیت پیغمبر اسلام کے نور کو ہر وسیلہ سے بجھانے کے درپے تھے،ہر بہانہ سے ان پر دباؤ ڈالتے،جسمانی اذیتیں پہنچاتے،حتیٰ یہاں تک کہ قتل کرنے کی کوششیں بھی کرتے تھے۔اسی سبب سے ائمہ ھدی علیہم السلام عام اصلاحات کے سلسلہ میں کچھ نہیں کر سکتے تھے، یا اسلامی معاشرہ میں اسلام کے معارف و قوانین اور سیرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وسیع پیمانے پر پھیلانے سے قاصر تھے۔

یہاں تک کہ امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام بھی اپنی ظاہری خلافت کے پانچ سال کے دوران ،اندورونی اختلافات اور طلحہ،زبیر،عائشہ اور معاویہ جیسے دعویداروں اور دیگر بانفوذ صحابیوں کی رخنہ اندازیوں کی وجہ سے ان سے خونین جنگیں لڑتے رہے اور اپنے عالی مقاصد اور اصلاحات تک دلخواہ صورت میں نہ پہنچ سکے۔

یہی وجہ ہے کہ ائمہ ھدیٰ خدا کی طرف سے اپنی مسئولیت اور ذمہ داری کے مطابق معاشرہ میں عمومی تعلیم وتربیت،خاص افراد کی تعلیم وتربیت اور معاشرہ کی عمومی اصلاحات،جیسے(حتی الامکان)امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے پر اکتفا کی۔یعنی دین کے معارف وقوانین کو کھلم کھلا طور پر معاشرہ میں بیان کرنے اور زمام حکومت کو اپنے ہاتھ میں لیکر معاشرہ کو دین کی اعلی مصلحتوں کے مطابق چلانے کے بجائے بااستعداد اور خاص افراد کی تربیت پر اکتفا کرتے تھے کیونکہ اس کے علاوہ ان کے لئے ممکن ہی نہیں تھا۔وہ لوگوں کی خاطر وقت کی حکومتوں کے سامنے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے قیام کیا کرتے تھے تا کہ اس طرح دین کو نابود ہونے سے بچالیں اور خدا کا نورانی دین،تدریجی طور پر خاموشی کے ساتھ نورافشانی کرتا رہے اور آگے بڑھتا رہے اور ایک دن پھر سے پہلی حالت پیدا کر کے دنیا کو اپنے نور سے منور کردے۔

ائمہ ھدیٰ علیہم السلام میں سے ہر ایک کی زندگی کے حالات اور امامت کے زمانے میں ان کی روش کی تحقیقات سے یہ حقیقت مکمل طور پر واضح ہوجاتی ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت علیہم السلام

عرف اورلغت میں اہل بیت اور مرد کا خاندان، مرد کے گھر کے چھوٹے معاشرے کے افراد کو کہا جاتا ہے، جن میں بیوی ، بیٹے ، بیٹیاں اور نوکر شامل ہوتے ہیں جو مجموعی طور پر صاحب خانہ کے سائے میں زندگی بسر کرتے ہیں۔

بعض اوقات اہل بیت کے معنی کو عمومیت دے کر اس لفظ کو اپنے قریبی رشتہ داروں جیسے باپ ، ماں ، بھائی ، بہن ، چچا ، پھوپھی ، ماموں ، خالہ اور ان کی اولاد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

لیکن قرآن مجید اور احادیث میں لفظ کلمہ اہل بیت سے مذکورہ دو عرفی ولغوی معنی میں سے کوئی بھی معنیٰ مراد نہیں ہے۔ کیونکہ شیعہ وسنی سے منقول متواتر احادیث کے مطابق اہل بیت ایک ایسا عطیہ ہے جو حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ، حضرت علی، حضرت فاطمہ زہرا، حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین علیہم السلام سے مخصوص ہے۔ اس بنا پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل خانہ اور دوسرے رشتہ دار، اگر چہ عرف ولغت کے لحاظ سے اہل بیت شمار ہوتے ہیں، لیکن اس اصطلاح کے اعتبار سے اہل بیت نہیں ہیں، یہاں تک کہ حضرت خدیجہ کبریٰ سلام اللہ علیہا، جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سب سے زیادہ معزّز و محترم بیوی اور حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی والدۂ گرامی تھیں اہل بیت میں شمار نہیں ہوتیں اور اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ کے صلبی بیٹے حضرت ابراہیم بھی اہل بیت کے اس زمرے میں شامل نہیں ہیں۔

لیکن ان روایتوں اور دیگر احادیث کی رو سے بارہ اماموں میں سے دوسرے نو امام، جو فرزند امام حسین علیہ السلام کی اولاد اور آپ کی نسل میں ہیں، اہل بیت میں ہیں۔اس بناء پر اہل بیت چودہ معصومین علیہم السلام ہیں اور معمولا اہل بیت پیغمبر وہ تیرہ افراد ہیں جو پیغمبر کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کی عترت کے طور پر مشہور رہیں۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ کے اہل بیت علیہم السلام، اسلام میں بہت سے فضائل ومناقب اور نا قابل موازنہ مقامات کے مالک ہیں، کہ ان میں سے درج ذیل دو مقام سب سے اہم ہیں:

۱۔آیۂ شریفہ (...انّما یرید اللہ لیذہب عنکم الرّجس اہل البیت ویطہّرکم تطہیراً)

(احزاب ۳۳)

کی رو سے مقام عصمت وطہارت پر فائز تھے، اس مقام کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ہرگز گناہ کے مرتکب نہیں ہو سکتے۔

۲۔حدیث ثقلین، جو متواتر حدیث ہے اور اس سے پہلے اسکی طرف اشارہ کیا گیا، کی رو سے، عترت ہمیشہ قرآن مجید کے ہمراہ ہیں اور ان میں کبھی جدائی پیدا نہیں ہوسکتی یعنی وہ قرآن مجید کے معنی اور دین مبین اسلام کے مقاصد کو سمجھنے میں کبھی خطا ولغزش سے دوچار نہیں ہوسکتے۔ان دو مقامات کا لازمہ یہ ہے کہ اسلام میں اہل بیت علیہم السلام کا قول وفعل حجت ہے (جیسا کہ شیعوں کا عقیدہ ہے)

اہل بیت علیہم السلام کی عام سیرت

اہل بیت علیہم السلام پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم وتربیت کے مکمل نمونہ ہیں اور ان کی سیرت بالکل پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت ہے۔

البتہ ۲۵۰ سال کا عرصہ (۱۱ھ یعنی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت سے، ۲۶۰ھ یعنی حضرت حجت عج کی غیبت تک) ائمہ ھدی علیہم السلام نے لوگوں کے ساتھ گزارا، اس مدت میں ان کی زندگی مختلف حالات اور مراحل سے گزری کہ جن میں ائمہ اطہار کی زندگی مختلف شکلوں میں ظاہر ہوئی، لیکن وہ اصلی مقصد، یعنی اصول دین وفروع دین کو انحرافات اور تبدیل ہونے سے بچایا اور حتی الامکان لوگوں کی تعلیم وتربیت سے دست بردار نہیں ہوئے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ۲۳ سال کی تبلیغ کے دوران، زندگی کے تین مراحل طے کئے۔ ابتدائی تین سال کے دوران مخفیانہ تبلیغ انجام دیتے تھے، اس کے بعد دس سال تک کھلم کھلا تبلیغ میں مشغول رہے، لیکن اس مدت کے دوران خود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کے پیرو انتہائی دباؤ اور نہایت جسمانی اذیتوں میں زندگی گزارتے تھے اور ہر قسم کی عملی آزادی سے محروم تھے جو معاشرہ کی اصلاح میں اثر انداز ہوتی ہے، اور اسکے بعد والے دس سال (جو ہجرت کے بعد میں ہیں)، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک ایسے ماحول میں تھے کہ جس کا مقصد حق وحقیقت کو زندہ کرنا تھا، اور اسلام دن بہ دن فاتحانہ طور پر آگے بڑھ رہا تھا اور ہر لمحہ لوگوں کے لئے علم وکمال کا ایک نیا باب کھل رہا تھا۔

البتہ واضح ہے کہ ان تین مختلف مراحل کے مختلف تقاضے تھے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم کی سیرت کو۔جس کا مقصد حق وحقیقت کو زندہ کرنے کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ گونا گوں صورتوں میں ظاہر کرتے ہیں۔

ائمہ ھدیٰ کے زمانہ میں جومختلف اور گونا گوں حالات رونما ہوئے ،وہ تقریباً پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ کی ہجرت سے پہلے تبلیغی زمانہ سے شباہت رکھتے ہیں۔کبھی ائمہ اطہار کے لئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے پہلے تین سال کی طرح کسی بھی صورت میں اظہار حق ممکن نہیں تھا اور(وقت کے)امام بڑی احتیاط سے اپنا فریضہ انجام دیتے تھے،چنانچہ چوتھے امام کے زمانہ میں اور چھٹے امام کی آخری عمر میں یہی حالت تھی ۔کبھی ہجرت سے پہلے دس سال کے مانند، کہ جس مین پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ میں اعلانیہ طور پر دعوت دیتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ ہرطرف سے اپنے پیرووٴں پر کفار کی اذ یتوں کی وجہ سے پریشان تھے،امام بھی معارف دین کی تعلیم اوراحکام کی اشاعت میں مشغول ہو جاتے تھے،لیکن وقت کے حکام انھیں جسمانی اذیت وتکلیف پہنچانے میں کوئی کسر باقی نہ رکھتے تھے اوران کے لئے ہردن کوئی نہ کوئی مشکل ایجاد کرتے تھے۔

البتہ ،پیغمبر اکرم کی ہجرت کے بعد والے ماحول کے مانند جو زمانہ کسی حدتک ہے وہ امیرالموٴمنین حضرت علی علیہ السلام کی خلافت ظاہری کے پانچ سال کا زمانہ،حضرت فاطمہ زہرا سلام علیہا اور امام حسن علیہ السلام کی زندگی کا تھوڑا سا زمانہ اور امام حسین علیہ السلام اور آپ کے اصحاب کا مختصر اور چندروزہ زمانہ تھا، کہ جس میں حق وحقیقت اور کھلم کھلا طور پر ظاہر ہورہی تھی اور صاف وشفاف آئینہ کی طرح پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کے

جیسے حالات پیش کئے جا رہے تھے۔

خلاصہ یہ کہ ائمہ اطہار علیہم السلام، مذکورہ مواقع کے علاوہ وقت کے حکمرانوں اور فرمانرواؤں کی آشکارا طور پر بنیادی مخالفت نہیں کر سکتے تھے، اس لئے اپنی رفتار و گفتار میں تقیہ کا طریقہ اپنانے پر مجبور تھے تا کہ وقت کے حکام کے ہاتھ کوئی بہانہ نہ آسکے، اسکے باوجود ان کے دشمن گوناگوں بہانے بنا کر ان کے نور کو خاموش کرنے اور ان کے آثار کو مٹانے میں کوئی دقیقہ فرو گزار نہیں کرتے تھے۔

وقت کے حکّام کے ساتھ ائمہ اطہار کے اختلافات کا اصلی سبب

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے بعد اسلامی معاشرہ میں تشکیل پانے والی مختلف حکومتیں، کہ جو اسلامی حکومت کا لیبل لگائے ہوئے تھیں، وہ سب کی سب اہل بیت علیہم السلام سے بنیادی مخالفت رکھتی تھیں اور اس ختم نہ ہونے والی دشمنی کی ایک ایسی جڑ تھی جو کبھی خشک نہیں ہوتی تھی۔ یہ سچ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اہل بیت علیہم السلام کے فضائل اور مناقب بیان فرمائے تھے کہ ان میں سے اہم ترین فضیلت معارف قرآن اور ان کا حلال و حرام کا جاننا تھا، جس کی وجہ سے ان کے مقام کا احترام اور تعظیم کرنا تمام امت پر واجب تھا، لیکن امت نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس نصیحت اور تاکید کا حق ادا نہ کیا۔

بیشک پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب پہلے دن دعوت دی تو سب سے پہلے اپنے رشتہ داروں کو اسلام کی دعوت دی اور حضرت علی علیہ السلام کو اپنا جانشین مقرر کیا اور اپنی زندگی کے آخری دنوں میں بھی غدیر خم میں اور دوسرے مقامات پر آپ کی جانشینی کا علان کیا۔لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد لوگوں نے دوسروں کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جانشین منتخب کیا اور اہل بیت علیہم السلام کو ان کے مسلم حق سے محروم کر دیا ،لہذا وقت کے حکام اہل بیت کو ہمیشہ اپنا خطرناک رقیب سمجھتے رہے اور ان سے خائف رہتے تھے ،اوران کا خاتمہ کرنے کے لئے گوناگوں امکانات اور وسائل سے استفادہ کرتے تھے۔

لیکن اہل بیت علیہم السلام اور اسلامی حکومتوں کے درمیان اختلافات کا سب سے بڑا سبب کچھ اور تھا اگر چہ حکومت اسلامی مسلۂ خلافت کے فروعات میں سے تھی۔

اہل بیت اطہار علیہم السلام امت اسلامیہ کے لئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کی اطاعت کو ضروری سمجھتے تھے اور اسلامی حکومت کو اسلام کے آسمانی احکام کی رعایت ،تحفظ اورنفاذ کے لئے ذمہ دار سمجھتے تھے ،لیکن جو اسلامی حکومتیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد تشکیل پائیں ،جیسا کہ ان کی کارکردگی سے ظاہر ہے، وہ اسلامی احکام کو مکمل طور پر نافذ کرنے کی رعایت اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کی اطاعت کرنے کی پابند نہیں تھیں۔

خدائے متعال اپنے کلام پاک میں کئی جگہوں پر، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اور اسی طرح امت کو آسمانی احکام میں تبدیلی ایجاد کرنے سے منع فرماتا ہے یہاں تک کہ دینی احکام

اور قوانین میں چھوٹی سے چھوٹی خلاف ورزی کی تنبیہ فرماتا ہے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی انہی ناقابل تغییر احکام وقوانین کی روشنی میں ،لوگوں کے درمیان ایک ایسی سیرت اختیار ہوئے تھے کہ دینی قوانین کو نافذ کرنے میں زمان ومکان اوراشخاص کے لحاظ سے کسی قسم کا فرق نہیں کرتے تھے۔آسمانی احکام کی رعایت کرنا ہرایک کے لئے یہاں تک کہ خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے واجب تھا اور یہ احکام ہرایک کے حق میں لازم الاجرا تھےاورشریعت ہرحال میں اور ہرجگہ پرزندہ اورنافذ تھی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی مساوات وعدالت کے نتیجہ میں لوگوں سے ہرقسم کے امتیاز وفرق کو ہٹایا تھا۔خودآنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ جو خدا کے حکم سے واجب الاطاعت حاکم وفرمانروا تھے،اپنی انفرادی اوراجتماعی زندگی میں تمام لوگوں کی نسبت اپنے لئے کسی قسم کے امتیاز کے قائل نہیں تھے،عیش وعشرت سے پرہیز فرماتے تھے،اپنی حکومتی حیثیت میں کسی قسم کے تکلف سے کام نہیں لیتے تھے،اپنی حیثیت کی عظمت کولوگوں کے سامنے ظاہر نہیں فرماتے تھےاور جاہ وحشم کا مظاہرہ نہیں کرتے تھےاورآخرکار دوسروں سے ایک معمولی اورظاہری امتیاز سے بھی پہچانے نہیں جاتے تھے۔

لوگوں کے مختلف طبقات میں سے کوئی طبقہ امتیاز کے بل بوتے پر دوسروں پرفضیلت نہیں جتلاتا تھا،عورت ومرد،اونچے اور نچلے طبقہ کے لوگ،غنی وفقیر،قوی وکمزور،شہری ودیہاتی اور غلام وآزادسب ایک صف میں تھےاورکوئی بھی اپنے دینی فرائض سے زیادہ کا پابند نہ تھااور معاشرہ کےقوی لوگوں کےسامنے جھکنےاورظالموں کےسامنےحقیر ہونے سے معاشرہ کا ہرفرد

محفوظ تھا۔

تھوڑا غور وفکر کرنے سے ہمارے لئے واضح ہوجاتا ہے (مخصوصاً پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد سے آج تک جو ہم نے اندازہ کیا ہے) کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنی سیرت سے صرف یہ مقصد تھا کہ اسلام کے آسمانی احکام لوگوں میں عادلانہ اور مساوی طور پر نافذ ہوجائیں اور اسلام کے قوانین انحراف اور تبدیل ہونے سے محفوظ رہیں لیکن اسلامی حکومتوں نے اپنی سیرت کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت سے مطابق وہم آہنگ نہیں کیا اور روش کو بدل دیا جس کے نتیجہ میں:

۱۔اسلامی معاشرہ میں نہایت کم وقت کے اندر شدید ترین صورت میں طبقاتی اختلافات رونما ہوئے اور مسلمان طاقتور اور کمزور دو گروہوں میں تقسیم ہوگئے اور اس طرح ایک گروہ کی جان ومال اور عزت دوسرے گروہ کے ہوا وہوس کا کھلونا بن گئی۔

۲۔اسلامی حکومتیں اسلامی قوانین میں تدریجی طور پر تبدیلیاں پیدا کرنے لگیں اور کبھی اسلامی معاشرہ کی رعایت کے نام پر اور کبھی حکومت اور حکومت کی سیاسی حیثیت کے تحفظ کے عنوان سے دینی احکام پر عمل کرنے اور اسلامی قوانین کے نفاذ سے پہلو تہی کی گئی۔

یہ طریقہ دن بدن وسیع تر ہوتا گیا۔یہاں تک کہ اسلامی حکومت کے نام پر چلنے والے ادارے اسلامی قوانین کی رعایت اور انہیں نافذ کرنے میں کسی قسم کی ذمہ داری کا احساس نہیں کرتے تھے۔معلوم ہے جب عام قوانین وضوابط کو نافذ کرنے والے افراد ہی مخلص نہ ہوں گے تو ان قوانین کا کیا حشر ہوگا!

خلاصہ اور نتیجہ

مذکورہ گفتگو سے معلوم ہوا کہ اہل بیت علیہم السلام کی معاصر اسلامی حکومتیں وقت کی مصلحتوں کے پیش نظر اسلامی قوانین میں تصرف کرتی تھیں اور ان ہی تصرفات کی وجہ سے ان کی سیرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت سے بالکل مختلف ہوتی تھی۔ لیکن اہل بیت علیہم السلام قرآن مجید کے حکم کے مطابق پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کے احکام کو ہمیشہ کے لئے ضروری جانتے تھے۔

انہی اختلافات اور تضاد کے سبب وقت کی طاقتور حکومتوں نے اہل بیت علیہم السلام کا خاتمہ کرنے کے لئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا اور ان کے نور کو بجھانے کے لئے ہر ممکن وسیلہ سے استفادہ کرتے تھے۔

اہل بیت اطہار علیہم السلام بھی اپنی الٰہی ذمہ داری کے مطابق، اپنے سخت اور منحوس دشمنوں کی طرف سے فراوان مشکلات سے دوچار ہونے کے باوجود، دین کے حقائق کی تبلیغ کر رہے تھے اور صالح افراد کو تعلیم دینے اور ان کی تربیت کرنے سے پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔

اس مطلب کو سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ ہم تاریخ کی طرف رجوع کریں اور حضرت علی علیہ السلام کی پانچ سالہ حکومت میں شیعوں کی اکثریت کو ملاحظہ کریں، کیونکہ تھوڑا غور کرنے سے ہم سمجھ لیں گے کہ، یہ اکثریت حضرت کی اسی ۲۵ سالہ گوشہ نشینی کے دوران وجود میں آئی۔ اسی طرح حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے گھر پر گروہ در گروہ آنے والے شیعہ تھے جو

خاموشی کے ساتھ حضرت امام سجاد علیہ السلام کے تربیت یافتہ تھے، یہ حقائق کے ایسے خوشہ چین تھے کہ حضرت امام موسی ابن جعفر علیہ السلام حتی زندان کے ایک تاریک گوشہ میں بھی ان کی اشاعت فرماتے تھے۔

آخر کار اہل بیت علیہم السلام کی مسلسل تعلیم وتربیت کے نتیجہ میں، شیعہ جو پیغمبر اکرم کی رحلت کے وقت ایک معمولی تعداد میں تھے، ائمہ اطہار علیہم السلام کے آخری زمانے میں ایک بڑی تعداد میں تبدیل ہوئے۔

اہل بیت علیہم السلام کے کردار میں ایک استثنائی نکتہ

جیسا کہ بیان کیا گیا، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت علیہم السلام نے اپنی زندگی کا زمانہ مظلومیت اور محکومیت میں گزارا اور اپنی ذمہ داریوں کو تقیہ کے ماحول اور انتہائی سخت حالات میں انجام دیا۔ ان میں سے چار معصومین کی زندگی بہت کم مدت کے لئے نسبتاً آزادانہ اور بلا تقیہ نظر آتی ہے۔ لہذا ہم ان چار شخصیتوں، یعنی حضرت علی، حضرت فاطمہ اور حسنین علیہما اسلام کی تاریخ زندگی اور کردار کا اجمالی جائزہ پیش کرتے ہیں۔

اہل بیت علیہم السلام کے فضائل

شیعہ اور سنی راویوں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کے اہل بیت کے مناقب میں ہزاروں احادیث نقل کی ہیں ہم یہاں پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت کے فضائل میں سے تین کو بیان کرتے ہیں کہ جن کے پہلے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ ہیں:

۱۔ ٦ ہجری میں، شہر نجران کے نصرانیوں نے اپنے چند بزرگوں اور دانشوروں کو چن کر ایک وفد کی صورت میں مدینہ بھیجا۔ اس وفد نے پہلے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مناظرہ اور کٹ حجتی کی، لیکن مغلوب ہوئے، اور خدائے متعال کی طرف سے آیہ مباہلہ نازل ہوئی:

(فَمَن حاجَّكَ فيه من بعد ما جاءك من العلم فقل تعالَوا ندع ابناءنا وابناءكم ونساءنا ونساءكم وانفسنا وانفسكم ثم نبتهل فنجعل لعنت الله على الكاذبين) (آل عمران ٦١)

پیغمبر! علم کے آجانے کے بعد جو لوگ تم سے کٹ حجتی کریں ان سے کہہ دیجئے کہ آؤ ہم لوگ اپنے اپنے فرزند، اپنی اپنی عورتوں اور اپنے اپنے نفسوں کو بلائیں اور پھر خدا کی بارگاہ میں دعا کریں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت قرار دیں۔

اس آیہ شریفہ کے حکم کے مطابق پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نجران کے وفد کو مباہلہ کی دعوت دیدی، اس طرح سے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ، عورتوں اور فرزندوں کے ساتھ حاضر ہو کر جھوٹوں پر لعنت کریں تا کہ خدائے متعال ان کے لئے عذاب نازل کرے۔

نجران کے وفد نے مباہلہ کی تجویز کو قبول کیا، اور دوسرے ہی دن مباہلہ کا وقت مقرر کیا گیا۔ دوسرے دن مسلمانوں کی بڑی تعداد اور نجران کا وفد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے

تشریف لانے کا منتظر تھا کہ دیکھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کس شان وشوکت کے ساتھ تشریف لاتے ہیں اور کن لوگوں کو مباہلہ کے لئے اپنے ساتھ لا رہے ہیں۔

انہوں نے دیکھا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس شان سے تشریف لا رہے ہیں کہ آپ کی آغوش میں حسین علیہ السلام ہیں اور حسن علیہ السلام ہاتھ پکڑے ہوئے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کے پیچھے آپ کی بیٹی فاطمہ سلام اللہ علیہا اور ان کے پیچھے علی علیہ السلام ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ ان سے فرما رہے ہیں کہ جب میں دعا کروں تو تم لوگ آمین کہنا۔

اس نورانی وفد، جن کے وجود سے حق وحقیقت نمایاں تھی، جو خدا کی پناہ گاہ کے سوا کسی پناہ گاہ پر بھروسہ کئے ہوئے نہیں تھے، نے نجران کے وفد کو لرزہ براندام کر دیا، ان کے سردار نے اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہا:

خدا کی قسم! میں ایسے چہروں کو دیکھ رہا ہوں کہ اگر یہ بارگاہ الٰہی میں دعا کریں گے تو روئے زمین پر تمام نصاریٰ نابود ہو جائیں گے اسکے بعد وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مباہلہ سے دست بردار ہونے کی عذر خواہی کی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لہٰذا اسلام لاؤ۔

انہوں نے کہا: اسلام لانے سے بھی معذور ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ نے فرمایا: تو پھر ہم تم لوگوں سے جنگ کریں گے۔

انہوں نے کہا: مسلمانوں سے لڑنے کی ہم میں طاقت نہیں ہے، لیکن سالانہ جزیہ دیں گے اور اسلام کی پناہ میں زندگی کریں گے اسطرح اختلاف ختم ہوا۔

مباہلہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ حضرت علی، حضرت فاطمہ زہرا اور حسنین کے آنے سے واضح ہوا کہ آیہ شریفہ (ابنا ئنا ونسا ئنا وانفسنا)، پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ، علی ، فاطمہ، اور حسن و حسین علیہم السلام کے علاوہ کوئی اور نہ تھا۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جائے کہ جو پیغمبر نے اپنے نفس فرمایا اس سے مقصود خود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ اور علی تھے، اور یہ جو فرمایا اپنی عورتیں اس سے مقصود فاطمہ تھیں اور یہ جو فرمایا اپنے فرزند اس سے مقصود حسنین تھے۔

یہاں پر اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ علی علیہ السلام بمنزلۂ خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت علیہم السلام چار افراد تھے، کیونکہ شخص کے ہر اہل بیت وہ لوگ ہیں کہ جن کا تعارف وہ خود کلمہ انفس، نسا ئنا وابنا ئنا (ہمارے نفس، ہماری عورتیں، اور ہمارے بچوں) سے کرائے ہیں. اگر اہل بیت میں ان کے علاوہ کوئی اور ہوتا تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کو بھی مباہلہ کے لئے ہمراہ ضرور لے آتے۔

اس سے ان چار ہستیوں کی عصمت ثابت ہوتی ہے، کیونکہ خدائے متعال پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت علیہم السلام کی عصمت وطہارت کی گواہی دے رہا ہے:

(...انّما یرید اللہ لیذھب عنکم الرّجس اھل البیت و یطھّرکم تطھیراً)

(احزاب۳۳)

بس اللہ کا ارادہ ہے اے اہل بیت! تم سے ہر برائی کو دور رکھے اور تم کو اس طرح پاک

وپاکیزہ رکھے جو پاک وپاکیزہ رکھنے کا حق ہے۔

۲۔جیسا کہ عامہ وخاصہ (سنی وشیعہ) نے نقل کیا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

مِثْلُ اَھْلُ بَیْتِیْ کَمِثْلِ سَفِیْنَۃُ نُوْحَ مَنْ رَکَبَھَا نَجِی وَمَنْ تَخَلّف عَنھا غَرَق

میرے اہل بیت کی مثال نوح کی کشتی کے مانند ہے، جو اس میں سوار ہوا اس نے نجات پائی اور جس نے اس سے روگردانی کی وہ غرق ہوگیا۔

۳۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ایک اور متواترہ روایت میں، جسے عامہ وخاصہ نے نقل کیا ہے، فرمایا ہے:

انی تارك فیکم الثقلین : کتاب الله وعترتی اهل بیتی لن یفترقا حتی یردا علیَّ الحوض ما ان تمسَّکتم بهما لن تضِلّوا ابعدی

میں تمہارے درمیان دوگراں قدر چیزیں چھوڑ رہا ہوں، جو کبھی ایک دسرے سے جدا نہیں ہوں گی، یہ دو چیزیں خدا کی کتاب اور میرے اہل بیت ہیں جب تک ان دونوں سے متمسّک رہو گے، گمراہ نہیں ہو گے۔

ائمہ علیہم السلام کی تقرری

حضرت علی علیہ السلام کی امامت (جیسا کہ معلوم ہوا) خدا کی طرف سے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نص سے تھی، اور اسی طرح دوسرے ائمہ علیہم السلام جو حضرت علی کے بعد تھے

، ہرامام نے اپنے بعد والے امام کا خدا کے حکم سے لوگوں میں تعارف کیا ہے۔ چنانچہ حضرت علی علیہ السلام پہلے امام اور مسلمانوں کے پہلے پیشوا تھے ،آپ صلی اللہ علیہ وآلہ نے اپنی شہادت کے وقت اپنے بیٹے امام حسن علیہ السلام کا تعارف کرایا اور امام حسن علیہ السلام نے بھی اپنی شہادت کے موقع پر اپنے بھائی حضرت امام حسین علیہ السلام کا تعارف کرایا اور اسی طرح بارہویں امام تک سلسلہ رہا۔

ہرامام سے اپنے بعد والے امام کے بارے میں نص کے علاوہ ،پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی (عامہ وخاصہ سے نقل کی گئی بہت سی حدیثوں کے مطابق)اماموں کے بارہ ہونے کے بارے میں یہاں تک کہ بعض حدیثوں میں ان کے ناموں کے ساتھ تعارف کرایا ہے۔

ائمہ معصومین علیہم السلام کی زندگی کا ایک مختصر جائزہ

حضرت امام علی علیہ السلام

(مسلمانوں کے پہلے امام)

حضرت امیر المومنین علی بن ابیطالب علیہ السلام پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم وتربیت کے پہلے کامل نمونہ تھے۔

علی علیہ السلام نے بچپن سے ہی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دامن میں پرورش پائی تھی ،اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے آخری لمحہ تک ایک سایہ کے مانند ساتھ ساتھ رہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کی شمع وجود کے گرد پروانہ کی طرح پرواز کرتے رہے۔ جب آخری بار آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جدا ہوئے ، یہ وہ لمحہ تھا جب آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ کے جسد مطہر کو آغوش میں لے کر سپرد خاک کیا۔

حضرت علی علیہ السلام ایک عالمی شخصیت ہیں۔دعوی کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جتنی گفتگو اس عظیم شخصیت کے بارے میں ہوئی ہے،اتنی کسی بڑے سے بڑے عالمی شخصیت کے بارے میں نہیں ہوئی ہے۔شیعہ وسنی اور مسلم وغیر مسلم دانشوروں اور مصنفوں نے حضرت علی علیہ السلام کی شخصیت کے بارے میں ایک ہزار سے زائد کتابیں تالیف کی ہیں۔آپ کے

بارے میں دوست ودشمن بے شمار تحقیق اورکھوج کے باوجود آپ کے ایمان میں کسی قسم کا کمزور نقطہ پیدانہیں کر سکے یا آپ کی شجاعت،عفت،معرفت،عدالت اور دوسرے تمام پسندیدہ اخلاق کے بارے میں شمّہ برابرنقص نہیں نکال سکے،کیونکہ آپ ایک ایسے شخص تھے ،جوفضیلت وکمال کے علاوہ کسی چیز کونہیں پہچانتے تھےاوراسی طرح آپ میں فضیلت وکمال کےعلاوہ کوئی چیزنہیں پائی جاتی تھی۔

تاریخ گواہ ہے کہ،پیغمبراسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت سے آج تک جتنے حکّام نے اسلامی معاشرہ میں حکومت کی ان میں صرف حضرت علی علیہ السلام ایسے ہیں کہ جنھوں نے اسلامی معاشرہ پراپنی حکومت کے دوران پیغمبراسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت پر پوری طرح عمل کیا اورآنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ کی روش سے ذرہ برابر منحرف نہیں ہوئے اوراسلامی قوانین اورشریعت کوکسی قسم کے دخل وتصرف کے بغیراسی طرح نافذکیا،جس طرح پیغمبراسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات میں نافذ ہوئے تھے۔

دوسرے خلیفہ کی وفات کے بعد نئے خلیفہ کومعین کرنے کے لئے خلیفہ دوم کی وصیت کے مطابق جو چھ رکنی کمیٹی بنائی گئی تھی،اس میں کافی گفتگو کے بعد خلافت کا مسئلہ علی اورعثمان کے درمیان تذبذب میں پڑا علی کوخلافت کی پیشکش کی گئی،لیکن اس شرط پرکہ لوگوں میں خلیفہ اول اوردوم کی سیرت پرعمل کریں حضرت علی نے ان شرائط کوٹھکراتے ہوئے فرمایا: میں اپنے علم سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھوں گا۔

اس کے بعد وہی شرائط عثمان کے سامنے رکھی گئیں،انہوں نے قبول کیا اورخلافت حاصل کی

،اگرچہ خلافت ہاتھ میں آنے کے بعد دوسری سیرت پر عمل کیا۔

علی علیہ السلام نے راہ حق میں جن جاں نثاریوں، فداکاریوں اور عفو وبخشش کا مظاہرہ کیا ہے ان میں آپ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب میں بے نظیر تھے۔ اس حقیقت سے ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا، کہ اگر اسلام کا یہ جاں نثار اور سورمانہ ہوتا، تو کفار ومشرکین ہجرت کی رات کو، اس کے بعد بدر واحد، خندق وخیبر وحنین کی جنگوں میں نبوت کی شمع کو آسانی کے ساتھ بجھا کر حق کے پرچم کو سرنگوں کر دیتے۔

علی علیہ السلام نے جس دن سماجی زندگی میں قدم رکھا، اسی لمحہ سے انتہائی سادہ زندگی گزارتے تھے، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات میں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کی رحلت کے بعد، یہاں تک کہ اپنی باعظمت خلافت کے دنوں میں فقیروں اور پسماندہ ترین افراد جیسی زندگی بسر کرتے تھے، خوراک، لباس اور مکان کے لحاظ سے معاشرہ کے غریب ترین افراد میں اور آپ میں کوئی فرق نہیں تھا اور آپ فرماتے تھے۔

ایک معاشرے کے حاکم کو اس طرح زندگی بسر کرنی چاہئے کہ ضرورت مندوں اور پریشان حال افراد کے لئے تسلی کا سبب بنے نہ ان کے لئے حسرت اور حوصلہ شکنی کا باعث ہو۔(۱)

علی علیہ السلام اپنی زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے محنت ومزدوری کرتے تھے، خاص کر کھیتی باڑی سے دلچسپی رکھتے تھے، درخت لگاتے تھے اور نہر کھودتے تھے، لیکن جو کچھ اس سے کماتے تھے یا جنگوں میں جو مال غنیمت حاصل کرتے تھے، اسے فقرا اور حاجتمندوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ جن زمینوں کو آباد کرتے تھے انھیں یا وقف کرتے تھے یا ان کو بیچ کر

پیسے حاجتمندوں کو دیتے تھے۔ اپنی خلافت کے دوران ایک سال حکم دیا کہ آپ کے اوقاف کی آمدنی کو پہلے آپ کے پاس لایا جائے پھر خرچ کیا جائے۔ جب

....

١۔ نہج البلاغہ فیض الاسلام، خطبہ ٢٠٠، ص ٦٦٣۔

مذکورہ آمدنی جمع کی گئی تو یہ سونے کے ٢٤ ہزار دینار تھے۔

علی علیہ السلام نے اتنی جنگوں میں شرکت کی لیکن کبھی کسی ایسے دشمن سے مقابلہ نہ کیا جسے موت کے گھاٹ نہ اتار دیا ہو۔ آپ نے کبھی دشمن کو پیٹھ نہ دکھائی اور فرماتے تھے:

اگر تمام عرب میرے مقابلہ میں آجائیں اور مجھ سے لڑیں تو بھی میں شکست نہیں کھاؤں گا اور مجھے کوئی پروانہیں ہے۔

علی علیہ السلام ایسی شجاعت و بہادری کے مالک تھے کہ دنیا کے بہادروں کی تاریخ آپ کی مثال پیش نہ کرسکی، اس کے باوجود آپ انتہائی مہربان، ہمدرد، جوانمرد اور فیاض تھے۔ جنگوں میں عورتوں، بچوں اور کمزوروں کو قتل نہیں کرتے تھے اور ان کو اسیر نہیں بناتے تھے بھاگنے والوں کا پیچھا نہیں کرتے تھے۔

جنگ صفین میں معاویہ کے لشکر نے سبقت حاصل کر کے نہر فرات پر قبضہ کرلیا اور آپ کے لشکر پر پانی بند کر دیا، حضرت علی علیہ السلام نے ایک خونین جنگ کے بعد نہر سے دشمن کا قبضہ ہٹا دیا، اس کے بعد حکم دیا کہ دشمن کے لئے پانی کا راستہ کھلا رکھیں۔

خلافت کے دوران کسی رکاوٹ اور دربان کے بغیر ہر ایک سے ملاقات کرتے تھے

اور تنہا اور پیدل راستہ چلتے تھے، گلی کوچوں میں گشت زنی کرتے تھے اور لوگوں کو تقوی کی رعایت کرنے کی نصیحت فرماتے تھے اور لوگوں کو ایک دوسروں پر ظلم کرنے سے منع کرتے تھے، بے چاروں اور بیوہ عورتوں کی مہر بانی اور فروتنی سے مدد فرماتے تھے۔ یتیموں اور لا وارثوں کو اپنے گھر میں پالتے تھے، ان کی زندگی کی ضرورتوں کو ذاتی طور پر پورا کرتے تھے اور ان کی تربیت بھی کرتے تھے۔

حضرت علی علیہ السلام علم کو بے حد اہمیت دیتے تھے اور معارف کی اشاعت کے میں خاص توجہ دیتے تھے، اور فرماتے تھے:

نادانی کے مانند کوئی درد نہیں ہے (۱)

جمل کی خونین جنگ میں آپ اپنے لشکر کی صف آرائی میں مشغول تھے، ایک عرب نے سامنے آکر توحید کے معنی پوچھے۔ لوگ ہر طرف سے عرب پر ٹوٹ پڑے اور اس سے کہا گیا ایسے سوالات کا یہی وقت ہے؟! حضرت نے لوگوں کو اعرابی سے ہٹا کر فرمایا:

ہم لوگوں سے ان ہی حقائق کو زندہ کرنے کے لئے لڑ رہے ہیں (۲)

اس کے بعد اعرابی کو اپنے پاس بلایا، اپنے لشکر کی صف آرائی کرتے ہوئے اعرابی کو ایک دلکش بیان سے مسئلہ کی وضاحت فرمائی۔

اس قسم کے واقعات حضرت علی علیہ السلام کے دینی نظم وضبط اور ایک حیرت انگیز خدائی طاقت کی حکایت کرتے ہیں۔ جنگ صفین کے بارے میں مزید نقل کیا گیا ہے کہ، جب دو لشکر دو تلاطم دریاؤں کے مانند آپس میں لڑ رہے تھے اور ہر طرف خون کا دریا بہہ رہا تھا۔

توحضرت اپنے ایک سپاہی کے پاس پہنچے،اس سے پینے کے لئے پانی مانگا۔
سپاہی نےلکڑی کا ایک پیالہ نکالا اوراس میں پانی بھر کے پیش کیا،حضرت نے اس پیالہ میں ایک شگاف مشاہدہ کیااور فرمایا:ایسے برتن میں پانی پینا اسلام میں مکروہ ہے۔

....

۱۔شرح غررالحکم،ج۲،ص۳۷۷،ح۲۸۸۲۔

۲۔بحارالانوار،ج۳،ص۲۰۷،ح۱۔

سپاہی نے عرض کی:اس حالت میں کہ جب ہم ہزاروں تیروں اورتلواروں کے حملہ کی زد میں ہیں اس قسم کی دقت کرنے کا موقعہ نہیں ہے!
اس سپاہی کوآپ نے جوجواب دیا،اس کا خلاصہ یہ ہے: ہم ان ہی دینی احکام وقوانین کو نافذکرنے کے لئےلڑرہے ہیں اوراحکام چھوٹے بڑے نہیں ہوتے ہیں
اس کے بعدحضرت نے اپنے دونوں ہاتھوں کوملاکرسامنے کیااورسپاہی نے پیالہ میں بھرا پانی آپ کے ہاتھوں میں ڈال دیا۔
حضرت علی علیہ السلام پیغمبراسلام کے بعدایسے پہلے شخص ہیں کہ جنہون نے علمی حقائق کوفلسفی طرزتفکر،یعنی آزاداستدلال میں بیان فرمایااور بہت علمی اصطلاحیں وضع کیں اورقرآن مجید کی غلط قرأت اورتحریف سے حفاظت کے لئےعربی زبان کےقوائد علم نحو وضع کئے اوران کومرتب کیا۔
آپ کی تقریروں،خطوط اوردیگرفصیح بیانات میں،معارف الٰہی،علمی،اخلاقی،سیاسی یہاں

تک کہ ریاضی کے مسائل میں جو باریک بینی پائی جاتی ہے، یقیناوہ حیرت انگیز ہیں۔

امام علی علیہ السلام کے فضائل کا خلاصہ

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو چھ سال کی عمر میں حضرت ابوطالب کے یہاں سے اپنے گھر لے آئے اوران کی پرورش اپنے ذمہ لے لی۔حضرت علی علیہ السلام اسی دن سے ایک سایہ کے مانند پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ساتھ رہے اورآنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ سے آخری باراس وقت جدا ہوئے ،جب آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ کے جسد مطہر کوسپرد خاک کیا۔

حضرت علی علیہ السلام پہلے کامل نمونہ ہیں جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ کی تعلیم وتربیت کے مکتب میں پروان چڑھے۔آپ پہلے شخص ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائے اورآپ ہی سب سے آخر میں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ سے جدا ہوئے۔

بعثت کے پورے زمانہ میں جو خدمات حضرت علی علیہ السلام نے خدا کے دین کے لئے انجام دیئے،دوست ودشمن گواہ ہیں کہ وہ خدمات کوئی اورانجام نہیں دے سکا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے اسلام کی سب سے اہم جنگوں میں شرکت فرمائی اور جنگ کے تمام خونین میدانوں میں مسلمانوں کے اندر بے مثال بہادری اور کامیابی کا راز آپ ہی تھے ۔چنانچہ بڑے بڑے صحابی جنگوں میں بارہا بھاگ جاتے تھے،لیکن آپ نے کبھی دشمن کو پیٹھ نہیں دکھائی اورکوئی حریف آپ کی تلوار کی وار سے بچ نہ سکا۔اس بے نظیر شجاعت ،جوضرب

المثل بن چکی تھی ، کے باوجود آپ ہمدرداورمہربان تھے،کبھی اپنے زخمی دشمن کوقتل نہیں کرتے تھےاور جنگ سے بھاگنے والوں کا پیچھانہیں کرتے تھے۔

حضرت علی علیہ السلام،اپنی تقریروں،کلمات قصاراوراپنے گوہر بار بیانات،جو یادگار کے طور پر مسلمانوں کے پاس موجود ہیں ،کے اعتبار سے مسلمانوں میں قرآن مجید کے بلند مقاصد کے بارے میں معروف ترین شخص ہیں۔آپ نے اسلام کے اعتقادی وعلمی معارف کوکماحقّہ حاصل کرکے حدیث شریف:

انامدینۃالعلم وعلی بابہا(۱)

....

۱۔بحارالانوار،ج۴۰،ص۲۰۱۔

کوثابت کردیا اوراس علم کوعملی جامہ پہنایا۔حضرت علی علیہ السلام کا دینداری،عفت نفس اورزھدوتقویٰ میں کوئی نظیرنہیں تھا۔آپ اپنے معاش کے لئے روزانہ محنت ومشقت کرتے تھے ، بالخصوص زراعت کو بہت پسند کرتے تھے ۔بنجر زمینوں کوآباد کرتے تھے ،نہریں کھودتے تھے ،درخت لگاتے تھے،جس جگہ کوآباد کرتے اسے مسلمانوں کے لئے وقف کر دیتے تھے یااس کو بیچ کر پیسے فقراء میں تقسیم کر دیتے تھےاورخودنہایت زھدوقناعت کے ساتھ فقیرانہ زندگی گزارتے تھے۔جس دن شہید ہوئے ۔باوجوداس کے کہ تمام اسلامی ممالک کے فرمانروا تھے۔آپ کی پونجی صرف سات سودرہم تھی جنھیں آپ اپنے گھر کے لئے ایک خدمت گار پرصرف کرنا چاہتے تھے۔

حضرت علی علیہ السلام کی عدالت ایسی تھی کہ خدا کے احکام کے نفاذ اور لوگوں کے حقوق کو زندہ کرنے میں ہرگز کسی طرح کے استثناء کے قائل نہیں تھے۔ آپ ذاتی طور پر گلی کوچوں میں گشت لگاتے تھے اور لوگوں کو اسلامی قوانین کی رعایت کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔

حضرت امیر المؤمنین کا طریقہ

چنانچہ ہم جانتے ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد مسلمانوں کے مسائل میں ولی ہونا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نص کے مطابق خدائے متعال کی طرف سے حضرت علی علیہ السلام کے لئے مخصوص تھا، لیکن اسے انتخابی خلافت میں تبدیل کیا گیا اور اس طرح خلافت کی کرسی پر دوسرے لوگوں نے قبضہ جمایا۔

حضرت علی علیہ السلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چند خاص صحابیوں جیسے سلمان فارسی، ابوذر غفاری اور مقداد اسدی نے لوگوں سے ایک اعتراض کیا لیکن انھیں مثبت جواب نہیں ملا۔

حضرت علی علیہ السلام لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کر کے ایک مدت تک اپنے گھر میں قرآن مجید جمع کرنے میں مصروف رہے۔ اس کے بعد کچھ خاص صحابیوں اور چند دیگر افراد کی تعلیم وتربیت میں مشغول ہوئے۔

حضرت علی علیہ السلام کا ماضی درخشان اور بے مثال تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات میں آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ کے وزیر اور اسلامی فتوحات کی کلید تھے. علم

ودانش میں، فیصلہ دینے میں، سخن وری اور دیگر تمام معنوی فضائل میں آپ تمام مسلمانوں پر برتری رکھتے تھے۔اس کے باوجود خلیفہ اول کے زمانے میں اجتماعی مسائل اور عمومی کام میں آپ سے کسی قسم کا استفادہ نہیں کیا گیا، اس لئے آپ صرف خدا کی عبادت اور چند اصحاب کی علمی و عملی تربیت میں مشغول رہتے تھے اور ایک عام انسان کی طرح زندگی گزارتے تھے۔

خلیفہ دوم کے زمانے میں بھی کسی کام کو آپ کے حوالہ نہیں کیا جاتا تھا، لیکن کسی حد تک آپ سے رجوع کرتے تھے اور اہم مسائل میں آپ کے نظریات سے استفادہ کیا جاتا اور آپ سے مشورہ لیا جاتا تھا۔چنانچہ خلیفہ دوم نے بارہا کہا ہے:(اگر علی کی رہنمائی نہ ہوتی ،تو عمر ہلاک ہوجاتا)۔(۱)

خلیفہ سوم کے زمانہ میں لوگوں کی توجہ آپ کی طرف زیادہ ہوئی اور اس پوری ۲۵ سالہ

....

۱۔بحارالانوار، ج۴۰ ص۲۲۹۔

مدت میں آپ کی تعلیم وتربیت کا دائرہ دن بدن وسیع تر ہوتا گیا یہاں تک کہ مکتب ولایت سے بالواسطہ اور بلاواسطہ تربیت پانے والوں کی ایک بڑی جماعت نے خلیفہ سوم کے قتل کے فوراً بعد آپ کے پاس ہجوم کیا اور آپ کو خلافت قبول کرنے پر مجبور کیا۔

حضرت امیرالمومنین نے خلافت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ کی سیرت کو۔جیسے مدتوں سے فراموش کیا گیا تھا۔پھر سے زندہ کیا۔آپ نے مساوات

اوراجتماعی عدالت نافذ کرکے تمام بیجا امتیازات کوختم کردیا۔تمام لاابالی گورنروں اورفرمانرواؤں کومعزول کردیااورانکے بیت المال سےلوٹے گئے مال ودولت اور خلیفہ کی طرف سے مختلف لوگوں کو بے حساب دی گئی جاگیروں واملاک کوضبط کیا،اوردینی ضوابط اورقوانین کی خلاف ورزی کرنے والوں کومناسب سزائیں سنائیں۔

اثرورسوخ رکھنے والےلیڈروں اورناجائز منافع حاصل کرنے والوں نے جب دیکھا کہ ان کے ذاتی منافعے خطرے میں پڑرہے ہیں،توانہوں نے مخالفت کا پرچم بلندکرکےعثمان کے خون کابدلہ لینے کے بہانے سے داخلی خونین جنگوں کی آگ بھڑکادی جوحضرت کی مشکلات کاسبب اوراصلاحات رکھنے میں رکاوٹ بن گئیں۔

حضرت علی علیہ السلام نے اپنی خلافت کے پانچ سالہ دورمیں کمرتوڑ مشکلات کے باوجود بے شمارافراد کی تربیت کی اوراپنی تقریروں اورفصیح بیانات کے ذریعہ علمی میدان کے مختلف ہنروفنون کے گراں بہا خزانے یادگارکےطور پرچھوڑدئے ،ان میں سے ایک علم نحو کے اصولوں کاوضع کرناہے جوحقیقت میں عربی زبان کےقواعدوضوابط ہیں۔

آپ کی برجستہ شخصیت کےاوصاف ناقابل بیان ہیں،آپ کےفضائل بےانتہااوربےشمار ہیں۔تاریخ ہرگزکسی ایسے شخص کوپیش نہیں کرسکتی جس نے آپ کے برابردنیاکےدانشوروں، مصنّفوں اورمتفکروں کےافکارکواپنی طرف جذب کیاہو۔

حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام

(دوسرے امام)

امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے اپنے والد گرامی کی شہادت کے بعد خلافت کی باگ ڈور سنبھالی۔آپ معاویہ کے بلوے کو دبانے کے لئے ایک لشکر کو مسلح اور منظم کرنے میں لگ گئے ۔آپ نے لوگوں میں اپنے نانا اور والد گرامی کی سیرت کو جاری رکھا۔لیکن کچھ مدت کے بعد معلوم ہوا کہ معاویہ کی مخفیانہ سازشوں اور ریشہ دوانیوں کی وجہ سے آپ کی کوششیں نا کام ہورہی ہیں،آپ کے لشکر کے سردار معاویہ سے ساز باز کر چکے ہیں،اور یہاں تک آمادہ تھے کہ آپ کو گرفتار کر کے معاویہ کے حوالہ کر دیں یا قتل کر دیں۔

بدیہی ہے کہ ایسے حالات میں معاویہ سے جنگ کرنے میں امام حسن مجتبیٰ کے لئے شکست و نا کامی یقینی تھی، یہاں تک کہ اگر امام تنہا یا اپنے نزدیک ترین افراد کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے قتل ہوتے ،تو معاویہ کی سلطنت میں کسی قسم کی ہلچل نہ مچتی اور لوگوں کے دلوں پر بھی کوئی اثر نہ ہوتا، کیونکہ معاویہ اپنی مخصوص شاطرانہ چال سے آسانی کے ساتھ آپ کو مختلف ذرائع حتی اپنے ہی افراد کے ذریعہ قتل کرا سکتا تھا،اس کے بعد لباس عزا پہن کر آپ کی انتقام کا دعویٰ کر کے فرزند پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ کے خون سے اپنے دامن کو دھو سکتا تھا۔ان نا گفتہ بہ حالات کے پیش نظر حضرت امام حسن مجتبی علیہ السلام نے معاویہ کی طرف سے صلح کی تجویز کو کچھ شرائط کے ساتھ قبول کیا اور خلافت سے دستبردار ہو گئے۔لیکن معاویہ نے تمام شرائط کو پامال کر کے ان میں سے کسی ایک پر عمل نہیں کیا۔

حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے اس طرح اپنی، اپنے بھائی حضرت امام حسین اور اپنے چند اصحاب کی جان کو یقینی خطرہ سے بچالیا اور اپنے خاص اصحاب کا ایک مختصر ومحدود لیکن حقیقت پر مبنی معاشرہ تشکیل دیا اور اصلی اسلام کو بالکل نابود ہونے سے بچالیا۔

البتہ معاویہ ایسا شخص نہیں تھا جو امام حسن مجتبیٰ کے مقصد اور آپ کے منصوبہ سے بے خبر رہتا، اس لئے صلح برقرار ہونے اور پورے طور پر تسلط جمانے کے بعد معاویہ نے حضرت علی علیہ السلام کے دوستوں اور حامیوں کو جہاں کہیں پایا ان کو مختلف ذرائع سے نابود کر دیا، اگر چہ صلح کے شرائط میں سے ایک شرط یہ تھی کہ خاندان رسالت کے حامی اور دوست امان میں رہیں گے۔

بہر حال معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کی ولی عہدی کے مقدمات کو مستحکم کرنے کے لئے امام حسن مجتبی علیہ السلام کو آپ کی بیوی کے ہاتھوں زہر دلا کر شہید کرا یا، کیونکہ صلح نامہ کے دوسرے شرائط میں یہ بھی تھا کہ معاویہ کے بعد خلافت پھر سے حضرت امام حسن مجتبی کو ملے گی ۔

حضرت امام حسین علیہ السلام

(تیسرے امام)

حضرت امام حسین علیہ السلام اپنے برادر بزرگوار کے بعد حکم خدا اور اپنے بھائی کی وصیت سے امامت کے عہدہ پر فائز ہوئے اور معاویہ کی خلافت کے دوران تقریباً دس سال زندگی گزاری اور اس مدت میں اپنے بھائی حضرت امام حسن مجتبی علیہ السلام کی سیرت پر عمل کرتے رہے اور جب تک معاویہ زندہ تھا امام کوئی موثر کام انجام نہ دے سکے۔ تقریباً ساڑھے نو سال کے بعد معاویہ مر گیا، اور خلافت جو سلطنت میں تبدیل ہو چکی تھی اس کے بیٹے یزید کو ملی۔

یزید، اپنے ریاکار باپ کے برعکس، ایک مست، مغرور، عیاش، فحاشی میں ڈوبا ہوا اور لاابالی جوان تھا۔ یزید نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی مدینہ کے گورنر کو حکم دیا کہ حضرت امام حسین علیہ السلام سے اس کے لئے بیعت لے ورنہ ان کا سر قلم کر کے اس کے پاس بھیجدے۔ اس کے بعد مدینہ کے گورنر نے حکم کے مطابق امام حسین علیہ السلام سے یزید کی بیعت کا تقاضا کیا، آپ نے مہلت چاہی اور رات کو اپنے اہل خانہ کے ساتھ راہی مکہ ہوئے۔ اور حرم خدا میں، جو اسلام میں ایک سرکاری پناہ گاہ ہے، پناہ لی، لیکن وہاں پر کچھ مہینے گزارنے کے بعد، سمجھ گئے کہ یزید کسی قیمت پر آپ سے دست بردار ہونے والا نہیں ہے، اور بیعت نہ کرنے کی صورت میں، آپ کا قتل ہونا قطعی ہے۔ اور دوسری جانب سے اس مدت کے

دوران عراق سے کئی ہزار خطوط حضرت کی خدمت مین پہنچے تھے کی جن میں آپ کی مدد کا وعدہ دے کر ظالم بنی امیہ کے خلاف تحریک چلانے کی دعوت دی تھی۔

امام حسین علیہ السلام عمومی حالات کے مشاہدہ سے اور شواہد وقرائن سے سمجھ چکے تھے کہ آپ کی تحریک ظاہری طور پر آگے نہیں بڑھ سکتی ہے،اس کے باوجود یزید کی بیعت سے انکار کر کے قتل ہونے پر آمادہ ہوئے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ تحریک کا آغاز کر کے مکہ سے کوفہ کی طرف روانہ ہوئے۔راستہ میں سرزمین کربلا (کوفہ سے تقریباً ستر کلومیٹر پہلے) دشمن کے ایک بڑے لشکر سے آپ کی مڈبھیڑ ہوئی۔

امام حسین علیہ السلام راستہ میں لوگوں کو اپنی مدد کے لئے دعوت دے رہے تھے اور اپنے ساتھیوں سے تذکرہ کرتے تھے کہ اس سفر میں قطعی طور پر قتل ہونا ہے اور اپنا ساتھ چھوڑنے پر اختیار دیتے تھے،اسی لئے جس دن آپ کا دشمن سے مقابلہ ہوا تو آپ کے گنے چنے جان نثار ساتھی باقی بچے تھے جنہوں نے آپ پر قربان ہونے کا فیصلہ کیا تھا،لہٰذا وہ بڑی آسانی کے ساتھ دشمن کی ایک عظیم فوج کے ذریعہ انتہائی تنگ محاصرہ میں قرار پائے اور یہاں تک کہ ان پر پانی بھی بند کیا گیا،اور ایسی حالت میں امام حسین علیہ السلام کو بیعت کرنے یا قتل ہونے کے درمیان اختیار دیا گیا۔

امام حسین علیہ السلام نے بیعت کرنے سے انکار کیا اور شہادت کے لئے آمادہ ہو گئے۔ایک دن میں صبح سے عصر تک اپنے ساتھیوں کے ساتھ دشمن سے لڑتے رہے۔اس جنگ میں خود امام،آپ کے بیٹے، بھائی ،بھتیجے ،چچیرے بھائی اورآپ کے اصحاب کہ جن کی کل

تعداد تقریبا ستر افراد کی تھی، شہید ہوئے۔صرف آپ کے بیٹے امام سجاد علیہ السلام بچے، جو شدید بیمار ہونے کی وجہ سے جنگ کرنے کے قابل نہیں تھے۔

دشمن کے لشکر نے، حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد مال کو لوٹ لیا اور آپ کے خاندان کو اسیر بنالیا اور شہداء کے کٹے ہوئے سروں کے ہمراہ اسیروں کو کوفہ اور کوفہ سے شام لے جایا گیا۔

اس اسیری میں امام سجاد علیہ السلام نے شام میں اپنے خطبہ سے اسی طرح حضرت زینب کبری سلام اللہ علیہا نے کوفہ کے مجمع عام میں اور کوفہ کے گورنر ابن زیاد کے دربار میں اور شام میں یزید کے دربار میں اپنے خطبوں سے حق سے پردہ اٹھایا اور بنی امیہ کے ظلم وستم کو دنیا والوں کے سامنے آشکار اور واضح کردیا۔

بہرحال امام حسین علیہ السلام کی تحریک ،ظلم ، وزیادتی اور لاابالی کے مقابلہ میں خود آپ اور آپ کے فرزندوں ،عزیزوں اور اصحاب کے پاک خون کے بہنے اور مال کی غارت اور خاندان کی اسیری پر ختم ہوئی ۔یہ تحریک اپنی خصوصیات وامتیازات کے پیش نظر اپنی نوعیت کا ایک ایسا واقعہ ہے انقلاب کی تاریخ کے صفحات پر رقم ہے۔یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اسلام اس واقعہ سے زندہ ہے اور اگر یہ واقعہ رونما نہ ہوتا تو بنی امیہ اسلام کا نام ونشان باقی نہ رکھتے۔

اس جانکاہ واقعہ نے نمایاں طور پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ کے اہل بیت علیہم السلام کے مقاصد کو بنی امیہ اوران کے طرفداروں کے مقاصد سے جدا کر کے حق وباطل کو واضح وروشن کردیا۔

یہ واقعہ نہایت کم وقت میں اسلامی معاشرہ کے کونے کونے میں منتشر ہوا اور شدید انقلابوں اور بہت زیادہ خونریزوں کا سبب بنا جو بارہ سال تک جاری رہے وآخرکار بنی امیہ کے زوال کا ایک بنیادی سبب بنا۔

اس واقعہ کا واضح ترین اثر لوگوں کی ایک بڑی تعداد کی معنوی پرورش کے نتیجہ میں رونما ہوا جن کے دلوں میں علی بن ابیطالب کی ولایت نے جڑ پکڑ لی اوران لوگوں نے خاندان رسالت کی دوستی کو اپنا لائحہ عمل بنالیا اور دن بدن ان کی تعداد اور طاقت بڑھتی گئی۔اور آج کی دنیا میں تقریباً دس کروڑ مسلمان شیعہ کے نام سے موجود ہیں۔

کیاامام حسن اورامام حسین علیہما السلام کی روش مختلف تھی؟

اگر چہ ان دو محترم پیشواؤں کی روش۔جو نص پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ کے مطابق برحق امام ہیں ۔ظاہراً مختلف نظر آتی ہیں،بعض لوگوں نے اس حد تک کہا ہے کہ:ان دو بھائیوں کے درمیان اس حد تک نظریاتی اختلاف پایا جاتا تھا کہ ایک نے چالیس ہزار سپاہی ہونے کے باوجود صلح کی اور دوسرے نے رشتہ داروں کے علاوہ چالیس دوست واحباب کے ساتھ جنگ کی حتی کہ شش ماہہ طفل شیر خوار کو بھی اس راہ میں قربان کیا۔

لیکن عمیق اور دقیق تحقیقات سے اس نظریہ کے خلاف ثابت ہوتا ہے،کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ امام حسن علیہ السلام تقریباً ساڑھے نو سال معاویہ کی سلطنت میں رہے اور کھلم کھلا مخالفت نہیں

کی ۔امام حسین علیہ السلام نے بھی اپنے بھائی کی شہادت کے بعد تقریباً ساڑھے نو سال معاویہ کی سلطنت میں زندگی گزاری اور تحریک کا نام تک نہیں لیا اور مخالفت نہیں کی ۔

پس دونوں کی روش میں اس ظاہری اختلاف کی اصلی ابنیاد کو معاویہ اور یزید کی متضاد روشوں میں ڈھونڈنا چاہئے نہ کہ ان دو محترم پیشواؤں کے نظریاتی اختلاف میں ۔

معاویہ کی روش بظاہرا ایک ایسی روش نہیں تھی جو بے دینی پر استوار ہوا اور اپنی اعلانیہ مخالفت سے احکام دین کا مذاق اڑائے ۔

معاویہ اپنے آپ کو ایک صحابی اور کاتب وحی کے طور پر پہچنواتا تھا اور اپنی بہن کے ذریعہ (جو زوجہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ام المؤمنین تھیں) اپنے آپ کو خال المومنین کہلاتا تھا اور خلیفہ دوم کا مورد اعتماد تھا اور عام لوگ خلیفہ پر پورا اعتماد اور خاص احترام رکھتے تھے ۔

اسکے علاوہ اس نے لوگوں کی نظر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ کے قابل احترام اکثر اصحاب (جیسے ابو ہریرہ ،عمرو عاص ،سمرہ ،بسر اور مغیرۃ بن شعبہ وغیرہ) کو گورنری اور دیگر حساس حکومتی عہدوں پر فائز کیا تھا جو لوگوں کے حسن ظن کو اس کی طرف مبذول کرتے تھے اور لوگوں میں اس کے فضائل اور دین کے سلسلہ میں صحابہ کے محفوظ ہونے کے بارے میں ۔یعنی جو کام بھی انجام دیں معذور ہیں ۔ بہت سی روایتیں نقل کرتے تھے ،لہذا معاویہ جو بھی کام انجام دیتا تھا وہ قابل توجیہ ہوتا تھا اور جب اس سے کام نہیں بنتا تھا تو معاویہ بھاری انعام واکرام اور لالچ دے کر اعتراض کرنے والوں کا منہ بند کرتا تھا ۔ جہاں پر یہ حربہ کارگر ثابت نہیں ہوتا تھا ،تو اپنے انہی حامیوں اور طرفداروں کے ذریعہ مخالفت کرنے والوں کو نابود کراتا تھا ۔ چنانچہ

اس کے ان ہی حامی صحابیوں کے ہاتھوں، دسیوں ہزار بے گناہ شیعیان علی اور دیگر مسلمانوں حتی کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابیوں کی ایک جماعت کو بھی قتل کیا گیا۔

معاویہ تمام کاموں میں ایک حق بجانب روپ اختیار کرتا تھا اور ایک خاص صبر وتحمّل سے قدم بڑھاتا تھا اور ایک خاص مہربانی سے لوگوں کو اپنا محب اور مطیع بنالیتا تھا یہاں تک کہ کبھی اپنے خلاف گالیاں سنتا تھا اور جھگڑوں سے روبرو ہوتا تھا، لیکن خنداں پیشانی اور عفو وبخشش کے ساتھ جواب دیتا تھا، وہ اس طرح اپنی سیاست کو نافذ کرتا تھا۔

حضرت امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کا بظاہر احترام کرتا تھا اور دوسری طرف سے اعلان کرتا تھا جو بھی شخص اہل بیت علیہم السلام کے فضّائل میں کوئی حدیث بیان کرے گا اس کی جان ومال اور عزت وآبرو کسی صورت میں محفوظ نہیں ہے اور جو شخص اصحاب کی منقبت میں کوئی حدیث بیان کرے گا تو اسے انعام واکرام سے نوازا جائیگا۔

اسی طرح یہ بھی حکم دیتا تھا کہ خطباء مسلمانوں کے منبروں سے علی کو (لازمی طور پر) گالیاں دیں اور اس کے حکم سے حضرت علی کے حامیوں کو جہاں بھی پاتے تھے موقع پر ہی قتل کرڈالتے تھے اور اس کام میں اس قدر زیادتی کی کہ حضرت علی علیہ السلام کے دشمنوں کی ایک بڑی تعداد کو بھی آپ کی دوستی کے الزام میں قتل کیا گیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام حسن علیہ السلام کے انقلاب سے اسلام کو نقصان پہنچتا۔ اور آپ اور آپ کے ساتھیوں کا خون رایگان ہوتا۔

ان حالات میں بعید نہیں تھا معاویہ امام حسین کو اپنی ہی افراد میں سے کسی کے ذریعہ قتل

کرواتا اوراس کے بعد عام لوگوں کے جذبات کوٹھنڈا کرنے اورافکار کو بدلنے کے لئے آپ کے ماتم میں اپنا گریبان چاک کرتا اورآپ کے خون کا بدلہ لینے کے بہانے سے آپ کے شیعوں کاقتل عام کرتا، کیونکہ اس نے یہی رویہ عثمان کے بارے میں اختیار کیا تھا۔(۱)

لیکن یزید کی سیاسی روش کسی صورت میں اس کے باپ کی روش سے مشابہ نہیں تھی۔وہ ایک خودخواہ اور لاابالی و بے دین جوان تھا، زورو زبردستی کے علاوہ کچھ نہیں جانتا تھا،لوگوں کے افکارونظریات کوکوئی اہمیت نہیں دیتا تھا۔

یزید نے اسلام کوپس پردہ پہنچائے جانے والے نقصانات کو اپنے مختصر دورحکومت میں اچانک آشکار کیا اوراس سے پردہ ہٹادیا۔

اپنی حکومت کے پہلے سال میں، خاندان پیغمبرصلی اللہ علیہ وآلہ کاقتل عام کیا۔

دوسرے سال مدینہ منورہ کومنہدم کیا اور تین دن تک لوگوں کی عزت، ناموس اور جان و مال کواپنے سپاہیوں کے لئے مباح قرار دیا۔

تیسرے سال کعبہ کومنہدم کردیا۔

اسی وجہ سے، امام حسین علیہ السلام کے انقلاب نے لوگوں کے ذہنوں اورافکار میں جگہ پائی اورروز بروز یہ اثر گہرااورنمایاں ہوتا گیا اورابتدائی مرحلہ میں خونین انقلابوں کی صورت میں ظاہر ہوااورآخرکار مسلمانوں کی ایک عظیم تعداد کوحق وحقیقت کے حامیوں اورمحبان اہل بیت علیہم السلام کے عنوان سے وجود میں لایا۔

۱۔تاریخ گواہ ہے کہ عثمان نے معاویہ سے مسلسل مدد کی درخواست کی لیکن معاویہ نے

اسکا مثبت جواب نہیں دیا،لیکن جب عثمان قتل کئے گئے تو ان کے خون کا بدلہ لینے کے بہانہ سے امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام سے جنگ کی۔

یہی وجہ تھی کہ معاویہ نے یزید کو اپنی وصیتوں کے ضمن میں تاکید و نصیحت کی تھی کہ امام حسین علیہ السلام سے کوئی سروکار نہ رکھے اوران پر اعتراض نہ کرے۔لیکن کیا یزید کی مستی اورخودخواہی اسے اس بات کی اجازت دیتی کہ وہ اپنے فائدے اور نقصان میں تمیز دے سکے؟!

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام

(چوتھے امام)

امام سجاد علیہ السلام نے اپنی امامت کی مدت میں جس روش کو اختیار کیا اسے دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے کہ جو مجموعی طور پر ائمہ اطہار علیہم السلام کی عام روش کے مطابق ہے۔حضرت امام سجاد علیہ السلام کربلا کے جانکاہ واقعہ میں اپنے والد گرامی کے ہمراہ تھے اور حسینی انقلاب میں شریک تھے اور آپ کے والد گرامی کی شہادت کے بعد آپ اسیر کئے گئے اور کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام لے جائے گئے۔امام سجاد علیہ السلام نے اپنی اسیری میں تقیہ سے کام نہیں لیا اور بلا جھجک حق و حقیقت کا اظہار کرتے تھے،اور موقع و محل کے مطابق اپنی تقریروں اور بیانات کے ذریعہ خاندان رسالت کی حقانیت اوران کے فخر و مباہات کو عام و خاص تک پہنچاتے تھے اور اپنے والد بزگوار کی مظلومیت اور بنی امیہ کے دردناک ظلم و ستم اور بے رحمی کو

تشت از بام کر کے لوگوں کے جذبات اور احساسات کو ایک پر تلاطم طوفان میں تبدیل کرتے تھے۔

لیکن قید اور اسیری سے رہائی پانے کے بعد، امام سجاد علیہ السلام مدینہ لوٹے اور جاں نثاری کا ماحول آرام وسکون کے ماحول میں تبدیل ہوا، گھر میں گوشہ نشینی اختیار کی اور غیروں کے لئے دروازہ بند کر دیا اور خدائے متعال کی عبادت میں مشغول ہوئے۔ اور خاموشی سے حق و حقیقت کے حامیوں کی تربیت کرتے رہے۔

حضرت امام سجاد علیہ السلام نے اپنی امامت کے ۳۵ سال کے دوران بالواسطہ یا براہراست لوگوں کی ایک بڑی تعداد کی پرورش وتربیت کی اور ان کو اسلامی معارف کی تعلیم دی۔

جو دعائیں حضرت امام سجاد علیہ السلام محراب عبادت میں آسمانی لہجہ میں پڑھتے اور ان کے ذریعہ اپنے پروردگار سے راز و نیاز فرماتے تھے، وہ عظیم اسلامی معارف کے ایک مکمل دورہ پر مشتمل ہیں۔ دعاؤں کے مجموعہ کو صحیفۂ سجادیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام

(پانچویں امام)

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی امامت کے زمانہ میں دینی علوم کی نشر و اشاعت کے لئے کسی حد تک ماحول سازگار رہا۔ بنی امیہ کے دباؤ کے نتیجہ میں اہل بیت علیہم السلام کی احادیث نابود ہو چکی تھیں. جبکہ احکام کے لئے ہزاروں احادیث کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن اصحاب

کے ذریعہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ کی نقل کی گئی احادیث کی تعداد پانچ سو سے زیادہ نہ تھی۔

مختصر یہ کہ اس زمانے میں کربلا کے جانکاہ واقعہ اور حضرت امام سجاد علیہ السلام کی ۳۵ سالہ کوششوں کے نتیجہ میں شیعوں کی ایک بڑی تعداد وجود میں آ گئی تھی۔لیکن وہ فقہ اسلامی سے خالی ہاتھ تھے۔ چونکہ بنی امیہ کی سلطنت، اندرونی اختلافات، راحت طلبی اور حکّام کی بے لیاقتی کے نتیجہ میں کمزور ہورہی تھی اوراس کے پیکر میں روز بروز سستی کے آثار نمایاں ہوتے جارہے تھے، لہذا امام محمد باقر علیہ السلام نے اس فرصت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے علوم اہل بیت علیہم السلام اورفقہ اسلامی کے نشرواشاعت کا کام شروع کیا اور تعلیم وتربیت کے بعد اپنے مکتب سے بہت سے دانشوروں کومعاشرے کے حوالے کیا۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام

(چھٹے امام)

چھٹے امام حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانہ میں اسلامی علوم کی نشرواشاعت کے لئے زمین زیادہ ہموار اورحالات زیادہ مناسب تھے، کیونکہ حضرت امام محمد باقر کے ذریعہ احادیث کی نشرواشاعت اورآپ کے مکتب کے شاگردوں کی تبلیغ سے لوگوں میں اسلامی معارف اورعلوم اہل بیت علیہم السلام کے بارے میں شوق پیدا ہو چکا تھا اورحدیث سننے کے تشنہ تھے۔

اس کے علاوہ اموی سلطنت نیست ونابود ہوچکی تھی اور عباسی سلطنت ابھی پوری طرح سے مستحکم نہیں ہوسکی تھی اور بنی عباس نے اپنے مقاصد کو حاصل کرنے اور بنی امیہ کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے اہل بیت علیہم السلام کی مظلومیت اور شہدائے کربلا کے خون کو دستاویز قرار دیا تھا، لہذا وہ اہل بیت علیہم السلام سے خوش اخلاقی سے پیش آتے تھے۔

اس فرصت کو غنیمت سمجھتے ہوئے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے مختلف علوم کی تعلیم و تربیت کا کام شروع کیا۔ تمام اطراف واکناف سے علماء ودانشور گروہ در گروہ آپ کے گھر پر آتے تھے اورآپ کی شاگردی کا شرف حاصل کر کے معارف اسلامی کے مختلف ہنر، اخلاق، تاریخ انبیاء وامم اور حکمت وموعظہ کے بارے میں سوالات کرتے تھے اور جواب حاصل کرتے تھے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے مختلف طبقات کے لوگوں سے بحثیں کیں اور گوناگوں ملل ونحل سے مناظرے کئے اور علوم کے مختلف شعبوں میں کافی شاگردوں کی تربیت کی، آپ کی احادیث اور علمی بیانات سے سیکڑوں کتابیں تالیف ہوئی ہیں، جو اصول کے نام سے مشہور ہیں۔

شیعوں نے، جو اسلام میں اہل بیت علیہم السلام کی روش پر چلتے ہیں، اپنے دینی مقاصد اور مسائل سے آپ کی برکتوں سے مکمل طور پر ابہام کو دور کیا ہے اور اپنے مذہبی مجہولات کو آپ کے واضح اور روشن بیانات سے حل کر دیا۔ اسی لئے شیعہ مذہب (کہ وہی مذہب اہل بیت ہے) لوگوں میں مذہب جعفری کے نام سے معروف ہوگیا۔

امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام کی تحریک

اگر چہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد اہل بیت علیہم السلام کے پیرووں میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا جارہا تھا، لیکن بنی امیہ کے حکام کی طرف سے اہل بیت علیہم السلام کے پیرووں پر زبردست دباؤ کی وجہ سے امام سجاد علیہ السلام کے لئے ممکن نہیں تھا، کہ معارف اسلامی کی تعلیم کا کام عملی اور اعلانیہ طور پر انجام دیں، یہاں تک کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے زمانہ میں اموی سلطنت اندرونی اختلافات اور بنی عباس سے کشمکش کے نتیجہ میں کمزور ہونے کے بعد ختم ہوئی گئی۔

اس لئے شیعہ اور اہل بیت علیہم السلام کے پیرو اور حضرت امام سجاد علیہ السلام کی ۳۵ سالہ امامت کے دوران تربیت یافتہ شاگردوں کو موقع ملا اور وہ دوردراز علاقوں سے سیلاب کی طرح امام محمد باقر علیہ السلام کے گھر پر آکر دینی علوم اور اسلامی معارف کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔

امام محمد باقر علیہ السلام کے بعد امام جعفر صادق علیہ السلام نے بھی اسلامی معارف کی نشر واشاعت کا کام شروع کیا، دنیا کے کونے کونے سے آنے والے دانشوروں کو قبول کر کے آپ ان کی تعلیم وتربیت فرماتے تھے اور آپ کی کوششوں کے نتیجہ میں ہزاروں دانشور مختلف علوم و فنون کو آپ سے سیکھ کر دنیا بھر میں ان علوم کی نشر واشاعت میں مشغول ہوئے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے شاگردوں کی تالیف کی ہوئی کتابوں کی تعداد چارسو ہے جو اصول اربعمائۃ کے نام سے شیعوں میں معروف ہیں۔

ان کے بعد آنے والے باقی ائمہ علیہم السلام نے بھی ان دو اماموں کی روش پر عمل کرتے ہوئے معارف اسلامی کی نشر و اشاعت کی ،بنی عباس کے سخت اور شدید دباؤ کے باوجود ،انہوں نے بھی بہت سے دانشوروں کی پرورش و تربیت کی اور اسلام کے علمی خزانوں کو ان کے حوالے کیا۔ان ہی ائمہ ھدیٰ علیہم السلام کی کوششوں کے نتیجہ میں آج، دنیا کے کونے کونے میں کروڑوں اہل حق موجود ہیں۔

حضرت امام موسی کاظم علیہ السلام

(ساتویں امام)

بنی عباس نے بنی امیہ کی حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد خلافت پر قبضہ جمایا۔پھر اس کے بعد بنی فاطمہ کی طرف رخ کیا اور پوری طاقت کے ساتھ خاندان نبوت کو نابود کرنے پر اتر آئے ،کچھ لوگوں کے سر قلم کئے، کچھ کو زندہ دفنا دیا اور کچھ کو عمارتوں کی بنیادوں میں یا دیواروں میں چن دیا۔

چھٹے امام حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے گھر کو جلا دیا اور خود حضرت کو چند بار عراق بلایا۔اس طرح چھٹے امام کی زندگی کے آخری دنوں میں تقیہ اور سخت ہو گیا تھا اور چونکہ حضرت

پر شدید پابندی تھی ،لہذا خاص شیعوں کے علاوہ آپ کسی سے ملاقات نہیں کرتے تھے اورآخرکارعباسی خلیفہ منصور کے ذریعہ زہر سے شہید کئے گئے ۔اس طرح ساتویں امام حضرت موسیٰ کاظم کی امامت کے زمانہ میں دشمنوں کا دباؤ بہت سخت تھا اور روز بروز بڑھتا جارہا تھا۔

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے شدید تقیہ کے باوجود علوم اسلامی کی نشرواشاعت کو جاری رکھا اور بہت سی احادیث کو شیعوں کے حوالہ کردیا۔ چنانچہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ آپ سے منقول فقہی احادیث پانچویں اور چھٹے امام کے بعد دوسرے ائمہ کی نسبت سب سے زیادہ ہیں۔تقیہ کی شدت کی وجہ سے آپ سے منقول احادیث میں عالم وعبد صالح جیسی تعبیریں استعمال کی گئی ہیں اور حضرت کا نام صریحاً ذکر نہیں کیا گیا ہے۔حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام عباسی خلفاء کے چار افراد: منصور، ہادی،مہدی، اور ہارون کے معاصر تھے۔آخرکار ہارون کے حکم سے آپ کو گرفتار کر کے قید خانہ میں ڈال دیا گیا اور برسوں تک ایک زندان سے دوسرے زندان میں منتقل ہوتے رہے اور سرانجام زندان میں ہی زہر دے کر آپ کو شہید کیا گیا۔

حضرت امام رضا علیہ السلام

(آٹھویں امام)

حالات پر غور وفکر کرنے سے ہر صاحب نظر کے لئے واضح تھا کہ خلفائے وقت اور دشمنان اہل بیت علیہم السلام جتنا ائمہ ھدیٰ کو جسمانی اذیتیں پہنچا کر نابود کرنے کی کوشش کرتے تھے اوران کے شیعوں سے سختی سے پیش آتے تھے، اتنا ہی ان کے پیرووٴں کی تعداد بڑھتی جارہی تھی اوران کا ایمان مزید مستحکم ہوتا جارہا تھا اوردربار خلافت ان کی نظروں میں ایک نجس اور ناپاک دربار سمجھا جاتا تھا۔

یہ مطلب، ایک باطنی عقیدہ تھا جو ائمہ اطہار علیہم السلام کے معاصر خلفاء کو ہمیشہ رنج وعذاب میں مبتلا کررہا تھااور حقیقت میں انھیں بےبس اور بیچارہ کر کے رکھدیا تھا۔

مامون ، بنی عباس کا ساتواں خلیفہ تھا اور حضرت امام رضا علیہ السلام کا معاصر تھا۔اس نے اپنے بھائی امین کو قتل کرنے کے بعد خلافت پر اپنی گرفت مظبوط کرلی اوراس فکر میں پڑا کہ اپنے آپ کو باطنی رنج وپریشانی سے ہمیشہ کے لئے نجات دےاورزوروز بردستی اوردباوٴ کے علاوہ کسی اورراستہ سے شیعوں کواپنے راستہ سے ہٹادے۔

اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جس سیاست کو مامون نے اختیار کیا، وہ یہ تھی کہ اپناولی عہد، حضرت امام رضا علیہ السلام کو بنایا تا کہ حضرت کو ناجائز خلافت کے نظام میں داخل کر کے، شیعوں کی نظروں میں آپ کو مشکوک کر کےان کے ذہنوں سے امام کی عصمت وطہارت کونکال دے۔اس صورت میں مقام امامت کے لئے کوئی امتیاز باقی نہ رہتا، جوشیعوں کے

مذہب کا اصول ہے، اس طرح ان کے مذہب کی بنیاد خود بخو د نابود ہو جاتی۔

اس سیاست کو عملی جامہ پہنانے میں ایک اور کامیابی بھی تھی وہ یہ کہ، بنی فاطمہ کی طرف سے خلافت بنی عباس کو سرنگوں کرنے کے لئے جو پے در پے تحریکیں سر اٹھارہی تھیں، ان کو کچل دیا جاتا، کیونکہ جب بنی فاطمی مشاہدہ کرتے کہ خلافت ان میں منتقل ہو چکی ہے ،تو فطری طور پر اپنے خونین انقلابوں سے اجتناب کرتے۔ البتہ اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے بعد امام رضا علیہ السلام کو راستے سے ہٹانے میں مامون کے لئے کوئی حرج نہیں تھا۔

مامون نے حضرت امام رضا علیہ السلام کو پہلے خلافت قبول کرنے اور اس کے بعد ولی عہدی کا عہدہ قبول کرنے کی پیش کش کی۔ امام نے مامون کی طرف سے تاکید، اصرار اور دھمکی کے نتیجہ میں آخر کار اس شرط پر ولی عہدی کو قبول کیا کہ حکومت کے کاموں میں جیسے عزل ونصب میں مداخلت نہیں کریں گے۔

حضرت امام رضا علیہ السلام نے ایسے ماحول میں لوگوں کے افکار کی ہدایت کرنے کا کام سنبھالا اور جہاں تک آپ کے لئے ممکن تھا مختلف مذاہب وادیان کے علماء سے بحثیں کیں اور اسلامی معارف اور دینی حقائق کے بارے میں گراں بہا بیانات فرمائے (مامون بھی مذہبی بحثوں کے بارے میں کافی دلچسپی رکھتا تھا) اسلامی معارف کے اصولوں کے بارے میں جس طرح امیر المومنین کے بیانات بہت ہیں اور دیگر ائمہ کی نسبت بیش تر ہیں۔

حضرت امام رضا علیہ السلام کی برکتوں میں سے ایک برکت یہ تھی ، کہ آپ کے آباء واجداد کی بہت سی احادیث جو شیعوں کے پاس تھیں، ان سب کو آپ کی خدمت میں پیش کیا گیا اور آپ

کے اشارہ اور تشخیص سے ان میں سے ،دشمنوں کے ناپاک ہاتھوں کی جعل اوروضع کی گئی احادیث کو مشخص کر کے مسترد کیا گیا۔

حضرت امام رضا علیہ السلام نے ولی عہدی کے طور پر جو سفر مدینہ منورہ سے مرو تک کیا، اس کے دوران، خاص کر ایران میں عجیب جوش وخروش پیدا ہوا اور لوگ ہر جگہ سے جوق در جوق زیارت کے لئے آپ کی خدمت میں آتے تھے اور شب وروز آپ کے شمع وجود کے گرد پروانہ وار رہتے تھے اور آپ سے دینی معارف واحکام سیکھتے تھے۔

مامون نے جب دیکھا کہ لوگ بے مثال اور حیرت انگیز طور پر حضرت امام رضا علیہ السلام کی طرف متوجہ ہیں تو اس کو اپنی سیاست کے غلط ہونے کا احساس ہوا، اسلئے اس نے اپنی غلط سیاست میں اصلاح کرنے کی غرض سے امام کو زہر دیکر شہید کیا اور اس کے بعد اہل بیت علیہم السلام اور ان کے شیعوں کے بارے میں خلفاء کی اسی پرانی سیاست پر گامزن رہا۔

حضرت امام محمد تقی علیہ السلام

(نویں امام)

حضرت امام علی نقی علیہ السلام

(دسویں امام)

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام

(گیارہویں امام)

ان تین ہستیوں کی زندگی کے حالات مشابہ تھے۔امام رضا علیہ السلام کی شہادت کے بعد مامون نے آپ کے اکلوتے بیٹے حضرت امام محمد تقی علیہ السلام کو بغداد بلایا اور پیار و محبت سے پیش آیا، اپنی بیٹی سے آپ کی شادی کی اور پورے احترام کے ساتھ اپنے پاس رکھا۔

یہ طرز عمل، اگرچہ دوستانہ دکھائی دیتا تھا، لیکن مامون نے حقیقت میں اس سیاست کے ذریعہ امام علیہ السلام پر ہر لحاظ سے شدید پابندی لگائی تھی۔حضرت امام علی نقی وحضرت امام حسن عسکری علیہما السلام کا اپنی امامت کے دوران سامرا میں۔جو ان دنوں دار الخلافہ تھا۔سکونت کرنا بذات خود ایک قسم کی نظر بندی تھی۔

ان تین اماموں کی امامت کی مدت مجموعی طور پر ۵۷ سال ہے، ان دنوں ایران، عراق اور شام میں رہنے والے شیعوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی تھی اور ان میں ہزاروں رجال حدیث بھی موجود تھے۔اسکے باوجود ان تین ائمہ علیہم السلام سے منقول احادیث بہت کم ہیں اور ان کی عمریں بھی کم تھیں۔نویں امام ۲۵ سال کی عمر میں دسویں امام ۴۰ سال کی عمر میں اور

گیارہویں امام ۲۷ سال کی عمر میں شہید کئے گئے۔ یہ سب نکات اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ ان کے زمانے میں دشمنوں کی طرف سے ان پر شدید پابندی تھی اوران کے کام میں روڑے اٹکائے جاتے تھے، لہذا یہ ائمہ اپنی ذمہ داریوں کوآزادانہ طور پرانجام نہیں دے سکتے تھے، پھربھی دین کے اصول اورفروع کے بارے میں ان تین ائمہ سے بعض گراں بہا احادیث نقل ہوئی ہیں۔

حضرت امام مہدی موعود عجل اللہ تعالی فرجہ الشریف

(بارہویں امام)

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کے زمانہ میں خلافت کی انتظامیہ نے فیصلہ کیا تھا کہ ہرممکن وسیلہ اورذریعہ سے حضرت کے جانشین کونابودکریں، تاکہ اس کے ذریعہ مسئلہ امامت اوراس کے نتیجہ میں مذہب تشیع کوختم کردیں۔حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام پردوسری پابندیوں کےعلاوہ یہ بھی ایک پابندی تھی۔

اس لحاظ سے امام عصرعجل اللہ تعالی فرجہ الشریف کی پیدائش مخفی رکھی گئی اورآپ(عج) کی چھ سال کی عمرتک آپ(عج) کے پدربزرگوارزندہ تھے۔آپ(عج) کولوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھا جاتا تھااورشیعوں کے چندخاص افراد کےعلاوہ آپ(عج) کوکوئی نہیں دیکھ سکتا تھا ۔

والد گرامی کی شہادت کے بعد حضرت (عج) نے، خدا کے حکم سے غیبت صغری اختیار کی، اوراپنے چار خاص نائبوں کے ذریعہ جو یکے بعد دیگرے آپ (عج) کے نائب مقرر ہوئے تھے، شیعوں کے سوالات کا جواب دیتے تھےاوران کی مشکلات کوحل فرماتے تھے۔ اس کے بعد سے حضرت (عج) آج تک غیبت کبری میں ہیں، جب آپ (عج) کوخدا کا حکم ہوگا تو اس وقت ظہور فرما کر زمین کوعدل وانصاف سے بھردیں گے جوظلم وستم سے بھر چکی ہوگی۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حضرت مہدی موعود (عج) اورآپ (عج) کی غیبت وظہور کے بارے میں شیعہ وسنی راویوں نے بے شما احادیث نقل کی ہیں اوراسی طرح شیعوں کی بزرگ شخصیتوں کی ایک بڑی تعداد آپ (عج) کے والد گرامی کی زندگی میں آپ (عج) کی خدمت میں پہنچ کر آپ (عج) کے نورانی جمال کا دیدار کر چکی ہے اورآپ (عج) کے والدگرامی سے امامت کی خوش خبری سن چکی ہے۔

اسکے علاوہ نبوت اورامامت کی بحث میں ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ دنیا ہرگز خدااوراس دین کی حفاظت کرنے والے امام سے خالی نہیں رہے گی۔

ائمہ دین کی روش کا اخلاقی نتیجہ

خدا کے انبیاء اورائمہ دین کے بارے میں جو کچھ تاریخ سے خلاصہ کے طور پر حاصل ہوتا ہے ،وہ یہ ہے کہ وہ حقیقت پسند اورحق کے پیرو تھے اورعالم بشریت کوحقیقت پسندی اورحق کی

پیروی کرنے کی دعوت دیتے تھے اوراس سلسلے میں ہرقسم کی جاں نثاری اورقربانی دینے سے گریزنہیں کرتے تھے۔

دوسرے الفاظ میں یہ کہا جائے کہ وہ کوشش کرتے تھے کہ انسان اورانسانی معاشرہ کی کماحقہٗ تربیت کریں ۔وہ چاہتے تھے کہ لوگوں پر جاہلانہ یاخرافاتی افکارکی حکمرانی کے بجائے صحیح افکاروعقائدحکم فرماہوں،اورانسانیت کے پاک دامن کوحیوانی خصلتوں سے داغداراورآلودہ نہ ہونے دیں درندوں کی طرح ایک دوسرے کو پھاڑنے اوراپنااپیٹ بھرنے کے بجائے انسانی عادات کواپنا کرزندگی کے بازارمیں انسانیت کاسرمایہ لگاکرانسانیت کےنقد فائدے سےسعادت حاصل کریں۔یعنی وہ ایسے تھے جواپنی سعادت نہیں چاہتے تھےمگرمعاشرے کی سعادت اورعالم انسانیت کے لئےاس کےعلاوہ کسی فریضہ کوتشخیص نہیں دیتے تھے۔

انہوں نے اپنی بھلائی اورسعادت (کہ انسان اس کے علاوہ کوئی چیزنہیں چاہتا ہے)اس میں دیکھی تھی کہ سب کے خیرخواہ ہوں اور چاہتے تھے کہ دوسرے بھی ایسے ہی ہوں ،یعنی جوشخص جس چیزکواپنے لئے پسند کرتاہے،اسے دوسرے کیلئے پسند کرے اورجس چیزکواپنے لئے پسندنہیں کرتاہےاسے دوسروں کے لئےبھی پسند نہ کرے۔

اسی حقیقت بینی اورحق کی پیروی کےنتیجہ میں ان حضرات نےاس عام انسانی فریضہ کی اہمیت خیرخواہی اوردیگر جزئی فرائض ،جو اس کے فروع ہیں،کاپتہ چلایا ہے اورجاں نثاری وفدا کاری جیسےصفات کے مالک بن گئے ہیں اورانہوں نے راہ حق میں جان ومال کی قربانی دینے سے گریزنہیں کیااور بدخواہی پرمشتمل ہرصفت کو جڑ سے اکھاڑکرپھینک دیا۔وہ اپنے

مال وجان کے بارے میں بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔خود پرستی اور کنجوسی سے متنفر تھے ،جھوٹ نہیں بولتے تھے،کسی پر تہمت نہیں لگاتے تھے،دوسروں کی عزت اورجان ومال پر تجاوز نہیں کرتے تھے۔ان صفات کی تفصیلی وضاحت اورآثار کو اخلاق کے حصہ میں ہونا چاہیئے۔

ائمہ معصومین علیہم السلام کے اجمالی حالات

پہلے امام

نام: امیرالمومنین حضرت علی بن ابیطالب علیہ السلام

پیدائش: ۲۳ سال قبل ہجرت

خلافت: ۳۵ ہجری

شہادت: ۴۰ ہجری

مدت خلافت: تقریباً پانچ سال

مدت عمر: ۶۳ سال

دوسرے امام

نام: حسن علیہ السلام

مشہور لقب: مجتبیٰ

کنیت: ابومحمد

والدگرامی: حضرت امیرالمومنین علی بن ابیطالب علیہ السلام

پیدائش: ۳ ہجری

شہادت: ۵۰ ہجری، معاویہ کے ایماء پر اپنی زوجہ کے ذریعہ زہر سے شہید کئے گئے۔

مدت عمر: ٤٨ سال

مدت امامت: دس سال

تیسرے امام

نام: حسین علیہ السلام

لقب: سیدالشہداء

کنیت: ابوعبداللہ

والدگرامی: حضرت امیرالمومنین علی بن ابیطالب علیہ السلام

پیدائش: ٤ ہجری

شہادت: ٦١ ہجری، یزید بن معاویہ کے حکم سے شہید کئے گئے۔

مدت عمر: ٥٧ سال

مدت امامت: دس سال

چوتھے امام

نام: علی علیہ السلام

لقب: سجاد اور زین العابدین

کنیت: ابو محمد

والد گرامی: حضرت امام حسین علیہ السلام

پیدائش: ٣٨ ہجری

شہادت: ٩٤ ہجری میں ہشام بن عبد الملک کے حکم سے
زہر دیا گیا۔

مدت عمر: ٦٦ سال

مدت امامت: ٣٥ سال

پانچویں امام

نام: محمد علیہ السلام

لقب: باقر

کنیت: ابوجعفر

والدگرامی: حضرت امام سجاد علیہ السلام

پیدائش: ۵۸ ہجری

شہادت: ۱۱۷ ہجری میں ابراہیم بن ولید کے حکم سے زہر دیا گیا۔

مدت عمر: ۵۹ سال

مدت امامت: ۲۳ سال

چھٹے امام

نام: جعفر علیہ السلام

لقب: صادق

کنیت: ابوعبداللہ

والدگرامی: حضرت امام محمد باقر علیہ السلام

پیدائش: ۸۰ ہجری

شہادت: ۱٤۸ ہجری میں منصور عباسی کے حکم سے زہر دیا گیا

مدت عمر: ٦۸ سال

مدت امامت: ۳۱ سال

ساتویں امام

نام: موسیٰ علیہ السلام

لقب: کاظم

کنیت: ابوالحسن

والد گرامی: حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام

پیدائش: ۱۲۸ ہجری

شہادت: ۱۸۲ ہجری

مدت عمر: ٥٤ سال

مدت امامت: ۳٥ سال

آٹھویں امام

نام: علی علیہ السلام

لقب: رضا

کنیت: ابوالحسن

والدگرامی: حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام

پیدائش: ۱٤۸ہجری

شہادت: ۲۰۳ ہجری میں مامون عباسی کے ہاتھوں زہر سے شہید کئے گئے

مدت عمر: ۵۵ سال

مدت امامت: ۲۱ سال

نویں امام

نام: محمد علیہ السلام

لقب: تقی اور جواد

کنیت: ابوجعفر

والدگرامی: حضرت امام رضا علیہ السلام

پیدائش: ۱۹۵ہجری

شہادت: ۲۲۰ ہجری میں معتصم عباسی کے ایما پر اپنی زوجہ کے ہاتھوں زہر سے شہید کئے گئے

مدت عمر: ۲۵ سال

مدت امامت: ۱۷سال

دسویں امام

نام: علی علیہ السلام

لقب: ہادی ونقی

کنیت: ابوالحسن

والد گرامی: حضرت امام محمد تقی علیہ السلام

پیدائش: ۲۱٤ ہجری

شہادت: ۲۵٤ ہجری

مدت عمر: ٤۰ سال

مدت امامت: ۳٤ سال

گیارہویں امام

نام: حسن علیہ السلام

لقب: عسکری

کنیت: ابومحمد

والدگرامی: حضرت امام علی نقی علیہ السلام

پیدائش: ۲۳۲ ہجری

شہادت: ۲٦۰ ہجری

مدت عمر: ۲۸ سال

مدت امامت: ۷ سال

بارہویں امام

نام: م ح م د علیہ السلام

لقب: ہادی اور مہدی

کنیت: ابوالقاسم

والدگرامی: حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام

پیدائش: ۲۵٦ ہجری

آپ خدا کے حکم سے نظروں سے غائب ہیں، جس دن خدا چاہے گا ظہور فرما کر دنیا کو عدل وانصاف سے بھر دیں گے۔

اخلاق واحکام کے چند سبق

۱۔اخلاق کے چند سبق

جیسا کہ معلوم ہوا، دین مقدس اسلام ایک ایسا عام اور لا فانی نظام ہے، جسے خدائے متعال نے انسان کی دنیوی واخروی زندگی کے لئے خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل فرمایا ہے ،تا کہ انسانی معاشرے میں نافذ ہوجائے ،اورانسانیت کی کشتی کو جہالت وبدبختی کے بھنور سے نکال کر نجات کے ساحل پر لگا دے۔

چونکہ دین، زندگی کا نظام ہے، لہذا ضروری ہے کہ زندگی سے مربوط چیزوں کے بارے میں انسان کے لئے ایک فریضہ کو معین کرے اور اس کے انجام کو انسان سے طلب کرے۔کلی طور پر ہماری زندگی تین امور سے مربوط ہے:

۱۔خدائے متعال سے، کہ ہم اسکی مخلوق ہیں ،اسکی نعمت کا حق ہر حق سے زیادہ ہے اوراس کی ذات اقدس کے بارے میں فرض شناسی ہر واجب سے زیادہ واجب ہے۔

۲۔زندگی کا رابطہ خود ہمارے ساتھ۔

۳۔اپنے ہم جنسوں سے رابطہ، ہم اپنے ہم جنسوں کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور ہیں تا کہ

اپنے کاروکوشش کوان کے تعاون اورمدد سے انجام دیں۔اس بنا پر، ہم قاعدے کے مطابق کلی طور پر تین فرائض رکھتے ہیں:

الف: خدا کے بارے میں فریضہ۔

ب: اپنے بارے میں فریضہ۔

ج: دوسروں کے بارے میں فریضہ۔

خدا کے بارے میں انسان کا فریضہ

خدا کے بارے میں ہمارا فریضہ، اہم ترین فریضہ ہے۔اس کو انجام دینے میں ہمیں پاک دل اورخالص نیت سے کوشش کرنی چاہئے۔سب سے پہلے انسانی فریضہ یہ ہے کہ اپنے پروردگار کو پہچانے، کیونکہ خدائے متعال کا وجود، ہر مخلوق کے وجود کا سرچشمہ ہے اور ہر وجود وحقیقت کا خالق ہے۔اس کے مقدس وجود کی معرفت اوراس کا علم ہر حقیقت بیں نگاہ کے لئے روشنی ہے۔اس حقیقت سے بے اعتنائی اوردوری، ہر قسم کی جہالت، بے بصیرتی اورفریضہ کے نہ جاننے کا سرچشمہ ہے۔جو شخص حق کی معرفت سے بے اعتنائی کرے اورنتیجہ میں اپنے ضمیر کے روشن چراغ کو بجھادے، تواس کے لئے حقیقی انسانی سعادت کوحاصل کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

چنانچہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں، جولوگ خداشناسی سے روگردانی کرتے ہیں اوراپنی زندگی میں اس حقیقت کوکوئی اہمیت نہیں دیتے، وہ انسانی معنویات سے کلی طور پر دور ہیں اوران کی

منطق چوپایوں اور درندوں کی منطق ہے خدائے متعال اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے:

(فعرض عن مّن تولّی عن ذکرنا ولم یرد الاّ الحیوۃ الدنیا☆ذلک مبلغہم من العلم...)

(نجم۲۹،۳۰)

لہذا جو شخص بھی ہمارے ذکر سے منہ پھیرے اور زندگانی دنیا کے علاوہ کچھ نہ چاہے، آپ بھی اس سے کنارہ کش ہوجائیں، یہی ان کے علم کی انتہا ہے۔

البتہ یہ یاددہانی ضروری ہے کہ،خداشناسی ،انسان کے لئے۔جوایک حقیقت بین اوراستدلالی فطرت والی مخلوق ہے۔اضطراری اورقہری ہے، کیونکہ وہ اپنے خداداد شعور سے خلقت کے جس شئے پر بھی نگاہ کرتا ہے، خالق کائنات کے وجوداوراس کے علم وقدرت کے آثار کا مشاہدہ کرتا ہے۔اس بنا پر خداشناسی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انسان نے خداشناسی کو اپنے لئے ایجاد کیا ہے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ انسان اس واضح حقیقت کو، کہ جس پر پردہ نہیں ڈالا جاسکتا، بے اعتنائی کی نگاہ سے نہ دیکھے اوراپنے ضمیر کو، جو اسے ہر وقت خدا کی طرف دعوت دیتا ہے، مثبت جواب دے اوراس معرفت کی تحقیق کر کے ہر قسم کے شک وشبہہ کو اپنے دل سے نکال دے۔

خداپرستی

خداشناسی کے بعد ہمارا دوسرا فریضہ خداپرستی ہے، کیونکہ حق کی معرفت کے ضمن میں یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ سعادت وخوشبختی۔جو ہمارا تنہا مقصد ہے۔ایک ایسے پروگرام پر عمل

کرنے اوراسے نافذ کرنے میں پوشیدہ ہے، جسے خدائے متعال نے ہماری زندگی کے لئے معین فرمایاہےاوراسے اپنے انبیاء کے ذریعہ ہم تک پہنچایاہے، پس خدائے متعال کے حکم کی اطاعت اوراسکی بندگی ایسافریضہ ہے کہ جس کے مقابلہ میں ہر فریضہ ناچیز اورحقیر ہے ۔خدائے متعال فرماتاہے:

(وقضی ربّک الاّ تعبدوا الاّ ایّاہ ۔..)(اسرائ ۲۳)

اورآپ کے پروردگار کا فیصلہ ہے کہ تم اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرنا...

)الم اعھد الیکم یابنی آدم ان لّا تعبدوا الشّیطن انّہ لکم عدوّ مبین ٭وان اعبدونی ھذا صراط مّستقیم) (نسا ءِ ۵۹)

اولاد آدم ! کیا ہم نے تم سے اس بات کا عہد نہیں لیا تھا کہ خبر دار شیطان کی عبادت نہ کرنا کہ وہ تمہارا کھلا ہوادشمن ہے. اورمیری عبادت کرنا کہ یہی صراط مستقیم اورسیدھا راستہ ہے

اس بناپر، ہمارا فریضہ ہے کہ مقام بندگی اوراپنی ضرورت کو پہچانیں اورخدائے متعال کی لا محدود عظمت وکبریائی کو مدنظر رکھیں اوراس کو ہر جہت سے اپنے اوپر مسلط جان کراس کے فرمان کی اطاعت کریں ۔ہم پر واجب ہے کہ خدائے متعال کے سوا کسی اورکی پرستش نہ کریں اور پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ اورائمہ ھدی ۔کہ خدائے متعال نے ہمیں ان کی اطاعت کاحکم دیاہے۔کے علاوہ کسی اورکی اطاعت نہ کریں ۔خدائے متعال فرماتاہے:

(...اطیعوا اللّٰہ واطیعوا الرّسول واولی الامر منکم ۔..)

(نسا ءِ ۵۹)

...اللہ کی اطاعت کرو، رسول اورصاحبان امر (ائمہ) کی اطاعت کرو

البتہ، خدائے متعال اوراولیائے دین کی اطاعت کے اثر میں، عملاً خدا سے منسوب ہر چیز کا مکمل احترام کرنا چاہئے۔ خدا اوراولیائے دین کے نام کوادب کے ساتھ لینا چاہئے۔ خدا کی کتاب (قرآن مجید)، کعبہ شریف، مساجد اوراولیائے دین کی قبور کا احترام کرنا چاہئے، چنانچہ خدائے متعال فرماتا ہے:

(...ومن یعظّم شعائر اللّٰہ فانّہا من تقوی) (حج۳۲)

جو بھی اللہ کی نشانیوں کی تعظیم کرے گا یہ تعظیم اس کے دل کے تقوی کا نتیجہ ہوگی۔

اپنے بارے میں انسان کا فریضہ

انسان، اپنی زندگی میں جو بھی روش اختیار کرے اور جس راستہ پر چلے، حقیقت میں وہ اپنے لئے سعادت و کامیابی کے علاوہ کوئی چیز نہیں چاہتا۔ چونکہ سعادت کو پہچاننا، کسی اور چیز کی پہچاننے کے ضمن میں ہے، یعنی جب تک ہم خود کو نہ پہچانیں گے اس وقت تک اپنی حقیقی ضرورتوں۔ کہ ان کو پورا کرنے میں ہماری سعادت ہے۔ کو بھی نہیں پہچان سکیں گے۔ اس بنا پر انسان کا سب سے اہم فریضہ یہ ہے کہ خود کو پہچان لے تا کہ اس کے سبب اپنی سعادت وخوشبختی کو سمجھے اور اپنے پاس موجود وسائل کے ذریعہ اپنی ضرورتوں کو دور کرنے کی کوشش کرے اور اپنی گراں بہا عمر، جو اسکا تنہا سرمایہ ہے، کو مفت میں ضائع نہ ہونے دے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے خدا کو پہچان لیا ہے (۱)

....

۱۔ بحارالانوار، ج۶۱، ص۹۹۔

امیر المؤمنین حضرت علی فرماتے ہیں:

جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا، وہ معرفت کے بلندترین مقام پر پہنچ گیا (۱)

انسان، اپنے آپ کو پہچاننے کے بعد متوجہ ہوتا ہے کہ اس کا سب سے بڑا فریضہ یہ ہے کہ وہ گوہر انسانیت کی قدر کرے۔

اس گوہر تابناک کو ہوا وہوس کے ذریعہ پامال نہ کرے، اپنی ظاہری و باطنی صفائی کے لئے کوشش کرے تاکہ ایک شیرین، لذت بخش اور ابدی زندگی کو حاصل کر سکے۔

امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

جو شخص اپنا احترام کرے گا، اسکے سامنے نفسانی خواہشات حقیر اور ناچیز ہوں گی۔(۲)

انسانی وجود دو چیزوں کا مرکّب ہے: روح اور بدن انسان کا فریضہ ہے کہ ان دونوں ارکان کی صحت واستحکام کے لئے کوشش کرے اور اسلام کے مقدس دین میں دونوں حصوں کے بارے میں بیان کئے گئے مفصل اور کافی احکام کے مطابق بدن اور روح کی صفائی کی کوشش کرے۔

بدن کی صفائی

دین مقدس اسلام نے کچھ قوانین وضوابط کے ضمن میں، جسمانی صفائی کی کافی تاکید کی ہے، جیسے: خون، مردار، بعض حیوانوں کا گوشت اورزہریلی غذاؤں کو کھانے سے منع کی

....

۱۔غررالحکم، ج۲ ص ۱۲۸۷ ص ۶۹۸۔
۲۔غررالحکم، ج۲، ص۶۸۱، ح۱۱۰۹۔

ہے۔شراب نوشی، نجس پانی پینے، پرُخوری، اور بدن کوضرر پہنچانے کی نہی کی ہےاس کےعلاوہ دوسرے احکامات ہیں کہ اس فصل میں ان سب کی تفصیل بیان کرنے کی گنجائش نہیں ہے ،خلاصہ کے طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اسلام نے انسان کوتمام نقصان دہ چیزوں سے پرہیز کرنے کاحکم دیا ہے۔

صفائی کا خیال

صفائی، حفظان صحت کے اہم اصولوں میں سے ایک اصول ہے، اسی لئے دین اسلام میں اس اصول کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ جو اہمیت اسلام میں صفائی کو دی گئی ہے، کسی اور دین میں نہیں پائی جاتی ہے۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

النظافۃ من الایمان (۱)

صفائی ایمان کا حصہ ہے

اسکےعلاوہ اسلام عام طور پر صفائی اور پاکیزگی کا حکم دیتا ہے، بالخصوص ہر ایک کے لئے صفائی کی نصیحت کرتا ہے، جیسے: ہاتھ پاؤں کے ناخن کاٹنا، سر اور بدن کے زائد بالوں کو صاف کرنا ،کھانا کھانے سے پہلے اور بعد میں ہاتھوں کو دھونا، بالوں کو کنگی کرنا، کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا، دن میں کئی بار مسواک کرنا، گھر کو جھاڑو کرنا، راستوں ، گھر کے دروازوں اور درختوں وغیرہ کے نیچے کو صاف ستھرا رکھنا۔

اسکےعلاوہ اسلام نے بعض عبادتوں کا حکم دیا ہے کہ جن کا تعلق صفائی و پاکیزگی وغیرہ سے

....

۱۔نہج الفصاحہ، ح۳۱۶۱، ص۶۳۶۔

ہے ،جیسے: لباس اور بدن کو نجاستوں سے پاک کرنا، دن میں کئی مرتبہ نماز کے لئے وضو کرنا اور نماز و روزہ کے لئے مختلف غسل کرنا۔

کُلّی اور مسواک

انسان منہ سے کھانا کھاتا ہے اور کھانا کھانے کی وجہ سے منہ آلودہ ہوتا ہے، دانتوں کے درمیان ،زبان پر اور منہ کی دوسری جگہوں پر کھانے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے رہ جاتے ہیں، اس لئے منہ کے اندر بدبو پیدا ہوجاتی ہے اور بعض اوقات کھانے کے ٹکڑوں میں کیمیائی عمل وردعمل اور خمیر ہونے کی وجہ سے زہریلے مواد وجود میں آتے ہیں اور کھانے کے ساتھ

مل کر معدے میں جاتے ہیں۔

اسکے علاوہ ایسا شخص لوگوں کے مجمع میں سانس لیکر بدبو پھیلاتا ہے اور دوسروں کو اذیت پہنچاتا ہے۔

اس لئے شرع مقدس اسلام نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ ہر دن (خاص کر ہر وضو سے پہلے) اپنے دانتوں کو مسواک کریں اور صاف پانی سے کلّی کریں اور اپنے منہ کو آلودگی سے پاک کریں۔

استنشاق (ناک میں پانی ڈالنا)

سانس لینا، انسان کی ضروریات زندگی میں سے ہے اور غالباً جو ہوا انسان کے رہنے کی جگہ پر ہوتی ہے، گرد وغبار اور کثافت سے خالی نہیں ہوتی، البتہ ایسی ہوا میں سانس لینا نظام تنفس کے لئے مضر ہے۔ اس ضرر کو روکنے کے لئے خدائے مہربان نے ناک کے اندر کچھ ایسے بال اگائے ہیں جو گرد وغبار کو پھیپھڑوں تک پہنچنے نہیں دیتے، اس کے باوجود کبھی گرد وغبار ناک کے اندر جمع ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے ناک کے بال اپنی ذمہ داری نبھانے سے قاصر رہتے ہیں۔ اسلئے دین اسلام میں حکم دیا گیا ہے کہ مسلمان دن میں کئی بار وضو سے پہلے ناک میں پانی ڈالیں اور اپنی ناک میں صاف پانی ڈال کر اپنے تنفس سے مربوط حفظان صحت کی رعایت کریں۔

تہذیب اخلاق

انسان، اپنے خداداد ضمیر سے پسندیدہ اخلاق کی قدرو قیمت کو سمجھتا ہے اور اسکی انفرادی واجتماعی اہمیت کو جان لیتا ہے ۔لہذا انسانی معاشرے میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے کہ جو پسندیدہ اخلاق کی تعریف اور پسندیدہ اخلاق رکھنے والے شخص کا احترام نہ کرے۔

جو اہمیت انسان پسندیدہ اخلاق کو دیتا ہے وہ محتاج تعارف وبیان نہیں ہے اور اسلام میں اخلاق کے بارے میں جو وسیع احکام بیان ہوئے ہیں وہ سب واضح ہیں ۔خدائے متعال فرماتا ہے:

(ونفس وماسوّٰ ہا☆فلھمھا فجورہاوتقوٰ ہا☆ قد افلح من زکّٰہا☆وقد خاب من دسّٰھا) (شمس ۷۔۱۰)

اور نفس کی قسم اور اس خدا کی قسم جس نے اسے درست کیا ہے، پھر بدی اور تقویٰ کی ہدایت دی ہے، بیشک وہ کامیاب ہوگیا جس نے نفس کو پاکیزہ بنالیا، اور وہ نامراد ہوگیا جس نے اسے آلودہ کردیا ہے

حصول علم

پسندیدہ معنوی صفات میں سے ایک علم ہے اور عالم کی جاہل پر فضیلت وبرتری اظہر من الشّمس ہے۔

جو چیز انسان کو دوسرے حیوانات سے جدا کرتی ہے، بیشک وہ عقل کی طاقت اور علم کا زیور ہے۔ دوسرے حیوانات میں سے ہر ایک اپنی خاص بناوٹ کے مطابق نا قابل تغیر فطرت رکھتا ہے اور یکساں صورت میں اپنی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے اور اس کی زندگی میں ہرگز کسی قسم کی ترقی اور بلندی کی کوئی امید نہیں پائی جاتی. وہ اپنے اور دوسروں کے لئے کوئی نیا باب نہیں کھول سکتے ہیں یہ صرف انسان ہے جو عقل کی طاقت سے، ہر روز اپنے گزشتہ معلومات میں جدید معلومات کا اضافہ کرتا ہے اور طبیعت اور مادرای طبیعت کے قوانین کو کشف کر کے ہر زمانہ میں اپنی مادی اور معنوی زندگی کو تازگی اور رونق بخشتا ہے، اپنے ماضی کے ادوار پر نظر ڈال کر اپنے اور دوسروں کے مستقبل کی بنیاد ڈالتا ہے۔

اسلام نے علم حاصل کرنے کے سلسلہ میں اس قدر تاکید کی ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے (۱)

علم حاصل کرو، اگر چہ چین میں بھی ہو (۲)

....

۱۔ اصول کافی، ج۱، ص۳۰۔

۲۔ نہج الفصاحہ، ح۳۲۷، ص۶۳۔

گہوارہ سے قبر تک علم حاصل کرنیکی کوشش کرو (۱)

اسلام، خلقت کے اسرار کو جاننے اور آسمانوں، زمین، انسان کی فطرت، تاریخ وملل اور اپنے

اسلاف کے آثار (فلسفہ،علوم ریاضی وطبیعی وغیرہ) کے بارے میں غور وخوض کرنے کی بہت تاکید کرتا ہے اور اسی طرح اخلاقی اور شرعی مسائل (اسلامی اخلاق وقوانین) اور صنائع کے اقسام۔ جو انسان کی زندگی کو منظّم کرتے ہیں۔ کو سیکھنے کی اسلام بہت ترغیب دیتا اور تاکید کرتا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر میں علم کی اہمیت اس قدر ہے کہ جنگ بدر میں جب کفار کی ایک جماعت مسلمانوں کے ہاتھوں اسیر ہوگئی، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ اسیروں میں سے ہر فرد زیادہ رقومات ادا کر کے آزاد ہوسکتا ہے، لیکن اسیروں میں جو افراد تعلیم یافتہ تھے وہ یہ رقومات ادا کرنے سے اس شرط پر مستثنیٰ قرار دیئے گئے کہ ان میں سے ہر ایک دس جوان مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھائے۔

اسلام کی نظر میں طالب علم کی اہمیت

ہر مقصد تک پہنچنے کے لئے سعی وکوشش کی اہمیت خود اس مقصد کی اہمیت کے برابر ہوتی ہے اور چونکہ ہر انسان اپنی خداداد فطرت سے عالم بشریت میں علم ودانش کو ہر چیز سے بالا تر جانتا ہے، لہذا طالب علم کی قدر وقیمت بالاترین قدر وقیمت ہوگی اس چیز کے پیش نظر کہ اسلام ایسا دین ہے کہ جو فطرت کی بنیادوں پر مستحکم واستوار ہے لہذا ابلا شبہہ طالب علم کی سب سے زیادہ قدر وقیمت کا قائل ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

....

١۔ نہج الفصاحہ، ح ٣٢٧، ص ٦٤۔

جو علم حاصل کرنے کی راہ میں ہو، وہ خدا کا محبوب ہے (۱)

اس کے باوجود کہ جہاد، دین کی بنیادوں میں سے ایک بنیاد ہے اور اگر پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ یا امام حکم جہاد دیدیں تو عام مسلمانوں کا جنگ میں شریک ہونا ضروری ہوجاتا ہے، لیکن جو لوگ دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں وہ اس حکم سے مستثنیٰ اور معاف ہیں۔ زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو ہمیشہ علمی مراکز میں تعلیم حاصل کرنے میں مشغول رہنا چاہیئے۔ خدائے متعال فرماتا ہے:

(وما کان المؤمنون لینفروا کافّۃً فلولا نفر من کلّ فرقۃ منہم طائفۃ لیتفقّھوا فی الدّین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیہم لعلّھم یحذرون) (توبہ ۱۲۲)

صاحبان ایمان کا یہ فرض نہیں ہے کہ وہ سب کے سب جہاد کے لئے نکل پڑیں تو ہر گروہ میں سے ایک جماعت اس کام کے لئے کیوں نہیں نکلتی ہے کہ دین کا علم حاصل کرے اور پھر جب اپنی قوم کی طرف پلٹ کر آئے تو اسے عذاب الٰہی سے ڈرائے کہ شاید وہ اسطرح ڈرنے لگیں۔

معلم اور مربی کی اہمیت

علم اور طالب علم کے بارے میں مذکورہ بیان سے اسلام میں معلم کی بھی اہمیت واضح ہوجاتی ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

من تعلّمت منہ حرفا صرت لہ عبدا (۲)

....

۱۔بحارالانوار،(ج۱ص۱۷۸،ح۶۰)

۲۔عوالی اللئالی،ج۱،ص۲۹۲،ح۱۹۳۔

جو مجھے ایک کلمہ تعلیم دیدے میں خود کو اس کا بندہ قرار دوں گا

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

لوگوں کے تین گروہ ہیں: پہلا: عالم ربانی دوسرا: جو اپنی اور دوسروں کی نجات کے لئے علم حاصل کرتا ہے۔ تیسرا: وہ لوگ جو عقل ودانش سے عاری ہوتے ہیں ان لوگوں کی مثال اس مکھی کی سی ہے جو جانوروں کے سر وصورت پر بیٹھتی ہے اور ہوا کے چلنے پر ادھر ادھر اڑتی ہے یا جہاں سے بھی بدبو آتی ہے اسکی طرف دوڑتی ہے ۔

معلم اور شاگرد کا فریضہ

قرآن مجید، علم ودانش کو انسان کی حقیقی زندگی جانتا ہے، کیونکہ اگر علم نہ ہوتا تو انسان اور جمادات اور مردوں میں کوئی فرق نہ ہوتا۔

اس بنا پر، طالب علم کو چاہئے کہ اپنے معلم کو زندگی کا مرکز تصور کرے تا کہ تدریجاً اپنی حقیقی زندگی کو اس سے حاصل کر سکے، اس لحاظ سے اسے یہ تصور کرنا چاہئے کہ اس کے توسط سے اسے زندگی ملی ہے اس لئے اس کی عزت وتعظیم میں کوتاہی نہ کرے اور اگر تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں اس کی طرف سے اگر سختی بھی دکھائی دے تو اس کی زندگی اور موت کے بعد اس

کے احترام میں کوتاہی نہ کرے۔

اسی طرح معلّم کوبھی اپنے آپ کو اپنے شاگرد کی زندگی کا ذمہ دار سمجھنا چاہئے اور جب تک اسے ایک زندہ انسان اور فخر ومباہات کے درجہ تک نہ پہنچا دے اس وقت تھکن محسوس نہ کرے اور آرام سے نہ بیٹھے۔

اگر کبھی اس کا شاگرد تعلیم وتربیت حاصل کرنے میں کوتاہی کرے تو استاد کا حوصلہ پست نہیں ہونا چاہئے ،اگر وہ تعلیم وتربیت میں ترقی کا مظاہرہ کرے تو اس کی ہمت افزائی کرنی چاہئے ،اگر لا پروائی کرے تو اس کی حوصلہ افزائی کر کے اس میں شوق پیدا کرنا چاہئے اور شاگرد کے جذبات کو ہرگز اپنے طرز عمل سے مجروح نہ کرے۔

ماں باپ کے بارے میں انسان کا فریضہ

ماں باپ اپنے فرزند کی پیدائش کا ذریعہ اوراس کے ابتدائی مربی ہیں اس سبب سے دین مقدس اسلام میں سب سے اہم نصیحت وتاکید ماں باپ کی اطاعت اوراحترام کے بارے میں کی گئی ہے، یہاں تک کہ خدائے متعال توحید کے ذکر کے بعد والدین کے ساتھ نیکی کی نصیحت کرتے ہوئے فرماتا ہے:

(وقضی ربُّك آلّا تعبدوا الّا ایّاہ وبالوالدین احسٰناً...)

(اسرائ ۲۳)

اور آپ کے پروردگار کا فیصلہ ہے کہ تم سب اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ

کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا...

جن روایتوں میں گناہان کبیرہ کو گنوایا گیا ہے ان میں شرک کے بعد والدین کے ساتھ برے برتاؤ کو گناہ کبیرہ شمار کیا گیا ہے. خدائے متعال مذکورہ آیہ شریفہ کے ضمن میں بھی فرماتا ہے:

(...اِمّا یبلغنّ عندك الکبر احدھما او کلاھما فلا تُقل لّھما اُفٍّ ولا تنھرھما و قل لھما قولاً کریماً ٭ واخفِض لھما جناح الذُّلّ من الرّحمة...) (اسراء ۲۴،۲۳)

...اور اگر تمہارے سامنے ان دونوں میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو جائیں تو خبردار ان سے اف بھی نہ کہنا اور جھڑکنا بھی نہیں اور ان سے ہمیشہ شریفانہ گفتگو کرتے رہنا، اور ان کے لئے خاکساری کے ساتھ اپنے کندھوں کو جھکا دینا۔

چہ خوش گفت زالی بہ فرزند خویش
چو دیدش پلنگ افکن و پیل تن
گر از عہد خردیت یاد آمدی
کہ بیچارہ بودی در آغوش من
نہ کردی در این روز بر من جفا
کہ تو شیر مردی و من پیر زن

کیا خوب کہا ہے ایک بوڑھیا نے اپنے بیٹے سے جب اس کو ایک طاقتور شیر اور ہاتھی کے

مانند دیکھا اگر تجھے وہ اپنا بچپن یاد آتا جب کہ تم میری آغوش میں ایک بیچارہ طفل تھے؟ تو آج تم مجھ پر یہ ظلم نہ کرتے کہ تم ایک شیر مرد بن چکے ہو اور میں ایک بوڑھی عورت ہوں۔

دین مقدس اسلام میں، ماں باپ کی اطاعت، واجب کے ترک ہونے یا حرام میں مرتکب ہونے کے علاوہ، واجب ہے، اور تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ جن لوگوں نے اپنے ماں باپ کو رنج و تکلیف پہنچائی ہے، وہ اپنی زندگی میں خوشبخت اور کامیاب و کامران نہیں ہوئے ہیں۔

بزرگوں کا احترام

بوڑھوں کا احترام بھی لازم ہے۔ چنانچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

بوڑھوں کا احترام اور تعظیم کرنا خدا کی تعظیم اور احترام کرنا ہے (۱)

اپنے رشتہ داروں کے بارے میں انسان کا فریضہ

انسان کے ماں باپ کے ذریعہ جو رشتہ دار نسبی رابطہ رکھتے ہیں، وہ طبیعی خاندان کو تشکیل دینے کا سبب بنتے ہیں اور خونی رشتہ اور انسانی خلیوں کے اشتراک کی وجہ سے انسان کو خاندان کا جز قرار دیتے ہیں۔ اس طبیعی اتحاد اور ارتباط کی وجہ سے اسلام نے اپنے پیروؤں کو صلہء رحم کا حکم دیا ہے اور قرآن مجید اور ائمہ دین کی روایتوں میں اس سلسلہ میں بہت ہی تاکید کی گئی ہے۔ خدائے متعال فرماتا ہے:

(...وَاتقوا اللّٰہ الذی تسائلون بہ وَالارحام ان اللہ کان علیکم رقیباً) (نسائی ۱)

اور اس خدا سے بھی ڈرو جس کے ذریعہ ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور قرابت داروں کی بے تعلقی سے بھی۔ اللہ سب کے اعمال کا نگراں ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

میں اپنی امت کو صلہ ءرحم کی نصیحت کرتا ہوں اور اگر رشتہ داروں کے درمیان ایک سال کی دوری کا فاصلہ ہو تو بھی اپنے رشتہ کے پیوند کو نہ توڑیں۔(۲)

....

۱۔بحار الانوار، ج ۷۵ ص ۱۳۶ ح ۲۔

۲۔اصول کافی۔ ج ۲ ص ۱۵۱۔

ہمسایوں کے بارے میں انسان کا فریضہ

چونکہ ہمسایہ زندگی بسر کرنے کی جگہ پر ایک دوسرے سے نزدیک ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے زیادہ رابطہ رکھتے ہیں اور گویا ایک بڑے خاندان کے حکم میں ہوتے ہیں لہذا ان میں سے کسی ایک کا اچھا اور برا طرز عمل ہمسایوں پر دوسروں کی نسبت زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔

جورات کو اپنے گھر میں صبح ہونے تک شور و غل مچاتا ہے، وہ شہر کے آخر میں رہنے والوں کو تکلیف نہیں پہنچاتا ہے، لیکن اپنے ہمسایہ کے آرام و آسائش میں خلل ڈالتا ہے۔

جو مالدار اپنے خوب صورت محل میں عیش وعشرت میں زندگی گزار رہا ہے، دور رہنے والے مفلسوں کی نگاہوں سے دور ہے ،لیکن ہر لمحہ اپنے ایک تنگ دست اور غریب ہمسایہ کی جھونپڑی میں اُگے ہوئے ایک پھول کے پودے کوآگ لگا تا ہے،تو یقیناایک دن ایسا آئے گا جب وہ اپنے کیفر کردار تک پہنچ جائے گا۔اس لحاظ سے دین مقدس اسلام میں ہمسایہ کے حالات کی رعایت کرنے کی بہت تاکید کی گئی ہے۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

جبرئیل امین نے ہمسایہ کے بارے میں اس قدر مجھے نصیحت کی کہ مجھے گمان ہونے لگا کہ خدائے متعال ہمسایہ کووارثوں میں قرار دے گا (۱)

....

۱۔مستدرک الوسائل، ج۸،ص ۴۲۷ ۔

نیز فرمایا:

جوشخص اپنے ہمسایہ کوتکلیف پہنچائے گا ،اس تک بہشت کی خوشبونہیں پہنچے گی ۔جو اپنے ہمسایوں کے حق کی رعایت نہیں کرے گا،وہ ہم میں سے نہیں ہے،اور جو سیر ہوگا اور وہ جانتا ہواس کا ہمسایہ بھوکا ہے اور اسے کچھ نہ دے تو وہ مسلمان نہیں ہے۔(۱)

ماتحتوں اور بیچاروں کے بارے میں انسان کا فریضہ

بیشک معاشرے کی تشکیل لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ہوتی ہے اور ایک معاشرے کے افراد کا سب سے اہم فریضہ یہ ہے کہ محتاجوں اور بے چاروں کی دستگیری کریں اور جو لوگ اپنی زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کی طاقت نہیں رکھتے ہیں، کسی نہ کسی طرح ان کی مدد کر کے ان کی مشکلات کو حل کرے۔

آج تو یہ مسئلہ واضح ہو چکا ہے کہ مالداروں کے مفلس و نادار افراد کی طرف توجہ نہ کرنے کی وجہ سے ایسا بڑا خطرہ لاحق ہے کہ، جو معاشرے کو نابود کر سکتا ہے اور سب سے پہلے مالدار ہی اس خطرے کے شکار ہوں گے۔

اسلام نے اس خطرہ کے پیش نظر چودہ سو سال پہلے ہی حکم دیا ہے، کہ مالداروں کو اپنی آمدنی کے ایک حصہ کو ہر سال کمزوروں اور حاجتمندوں میں تقسیم کرنا چاہئے اور اگر اس سے ان کی ضرورت پوری نہ ہو سکے تو مستحب ہے کہ غریبوں کی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے جتنا ممکن ہو سکے راہ خدا میں انفاق کریں۔

....

۱۔سفینۃ البحار، ج۱، ص۱۹۰۔

خدائے متعال فرماتا ہے:

(لن تنالوا البرّ حتّٰی تنفقوا ممّا تُحِبّون...) (آل عمران۹۲)

تم نیکی کی منزل تک نہیں پہنچ سکتے جب تک اپنی محبوب چیزوں سے راہ خدا میں انفاق نہ کرو

لوگوں کی خدمت ومدد کے بارے میں نقل کی گئی حدیثیں بےشمار ہیں۔پیغمبراکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

خیرالنّاس انفعھم للنّاس(۱)

لوگوں میں سب سے بہتر وہ ہے جوسب سے زیادہ لوگوں کے لئے فائدہ مند ہو۔

نیز فرماتے ہیں:

قیامت کے دن خدا کے نزدیک اس شخص کا مقام سب سے بلند ہوگا جوخدا کے بندوں کی حاجت روائی کی راہ میں سب سے زیادہ اقدام کرے۔(۲)

دربلا یار باش یاران را
تا کند فضل ایزدت یاری
بہ ہمہ حال بدروی روزی
تخم نیکی کہ این زمان کاری

....

۱۔نہج الفصاحہ،ح۱۵۰۰،ص۳۱۵۔

۲۔کنزالعمال،ج۶،ص۵۹۵۔

معاشرے کے بارے میں انسان کا فریضہ

چنانچہ ہم جانتے ہیں کہ لوگ ایک دوسرے کی مدد سے کام کرتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں ایک دوسرے کے کام وکوشش سے استفادہ کرتے ہیں اور اپنی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ان افراد سے تشکیل پانے والا معاشرہ ایک بڑے انسان کے مانند ہے اور تمام افراد اس بڑے انسان کے اعضاء کے مانند ہیں۔

انسان کے بدن کا ہر عضو، اپنے مخصوص کام کو انجام دیتا ہے اور اپنے کام کے نفع کے علاوہ دوسرے اعضاء کے منافع سے بھی فائدہ اٹھاتا ہے،یعنی اپنی سرگرمی کی حالت میں اپنے نفع کو دوسرے اعضاء کے منافع کے ضمن میں حاصل کرتا ہے اور دوسروں کی زندگی کے سائے میں اپنی زندگی کو جاری رکھتا ہے۔اگر سارے اعضاء خودغرض ہوتے اور دوسروں کے کام نہ آتے ،مثلا جہاں پر ہاتھ پاؤں اپنے کام میں مشغول ہیں،آنکھ اپنی نگاہ سے ان کا تعاون نہ کرتی یا منہ غذا کو چبانے اور اس سے لذت حاصل کرنے پر اکتفا کرتا اور معدہ کی ضرورت کو پورا نہ کرتا یعنی کھانے کو نہ نگلتا تو انسان بلا فاصلہ مر جاتا اور نتیجہ کے طور پر خودغرض وانحصار طلب اعضاء بھی مر جاتے۔

معاشرہ کے بارے میں معاشرے کے افراد کا فریضہ بھی ایک انسان کے بدن کے اعضاء کے مانند ہے۔یعنی انسان کو اپنا منافع معاشرے کے منافع کے ضمن میں حاصل کرنا چاہئے اور اپنے کام وکوشش سے معاشرے کو فائدہ پہنچانے کا خیال ہونا چاہئے تا کہ اپنی محنتوں سے بہرہ مند ہو سکے اور سبھی کو فائدہ پہنچائے تا کہ خود بھی بہرہ مند ہو سکے۔تمام لوگوں کے حقوق

سے دفاع کرے تا کہ خود اسکے حقوق نابود نہ ہوں ۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے ہم اپنی خدادادفطرت سے سمجھتے ہیں اوردین مقدس اسلام بھی ۔جوفطرت وخلقت پر استوار ہے۔اس کے علاوہ کوئی اور حکم نہیں رکھتا۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اوراجنبیوں کے مقابلہ میں ایک دست،ایک دل اور یک جہت ہیں (۱)

مزیدفرماتے ہیں:

المسلم من سلم المسلمون من یدہ ولسانہ (۲)

مسلمان وہ ہےجس کے ہاتھ اورزبان سے دوسرے مسلمان امان میں رہیں

مزیدفرماتے ہیں:

من اصبح ولم یھتم بامور المسلمین فلیس بمسلم (۳)

جومسلمانوں کے مسائل کواہمیت نہ دے وہ مسلمان نہیں ہے۔

اسی وجہ سے،پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنگ تبوک میں لشکر اسلام کو لے کر روم کی سرحد کی طرف روانہ ہوئے تو اس وقت تین افراد نے اس جنگ میں شرکت نہیں کی تھی ۔اسلامی لشکر کے جنگ سے واپس آنے پر جب یہ تینوں آدمی ان کے استقبال کے

....

۱۔نہج الفصاحہ،ص ٦٢٥،ح ٣٠٨١و ٣٠٨٢۔

۲۔بحارالانوار ج ۷۷ ص ۵۳۔

۳۔اصول کافی، ج ۲، ص ۱۶۳۔

لئے گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سلام کیا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ نے اپنے رخ کو موڑ لیا اور ان کے سلام کا جواب نہیں دیا اور اسی طرح مسلمانوں نے بھی ان سے اپنا منھ موڑ لیا، نتیجہ میں مدینہ منورہ میں کسی نے حتی ان کی عورتوں نے بھی ان سے بات نہیں کی انہوں نے بے بس ہو کر مدینہ کے پہاڑوں میں پناہ لی اور توبہ واستغفار کیا۔ چند دنوں کے بعد خدائے متعال نے ان کی توبہ قبول کی پھر وہ شہر کے اندر آ گئے۔

عدالت

قرآن مجید اور ائمہ دین کی روایتوں کے مطابق عدالت کی دو قسمیں ہیں: انفرادی عدالت اور اجتماعی عدالت۔ عدالت کی یہ دونوں قسمیں دین مبین اسلام کی نظر میں نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔

انفرادی عدالت

انفرادی عدالت سے مراد وہ عدالت ہے کہ انسان جھوٹ، غیبت اور دوسرے گناہان کبیرہ سے پرہیز کرے اور دوسرے گناہوں کو بار بار انجام نہ دے۔ جس میں یہ صفت ہو، اسے عادل کہتے ہیں اور اسلام کے قوانین کے مطابق ایسا شخص جج، حاکم، تقلید، اور دیگر اجتماعی ذمہ

داریوں کوسنبھال سکتا ہے۔لیکن جس میں یہ دینی صفات موجود نہ ہوں وہ ان اختیارات سے بہرہ مندنہیں ہوسکتا ہے۔

اجتماعی عدالت

اجتماعی عدالت سے مراد وہ عدالت ہے کہ انسان دوسروں کے حقوق کے بارے میں افراط وتفریط نہ کرے اورسب کو قانون الٰہی کے مقابلہ میں مساوی قرار دے اور اجتماعی عدالت کو نافذ کرنے میں دینی مقررات کے حق سے تجاوز نہ کرے، جذبات میں نہ آئے اور سیدھے راستہ سے منحرف نہ ہو۔خدائے متعال فرماتا ہے:

(انّ اللہ یامر بالعدل...) (نحل ۹۰)

بیشک اللہ عدل کاحکم یتا ہے...

بیشمار آیتوں اورروایتوں میں گفتاروکردار میں عدالت کے بارے میں حکم ہواہےاورخدائے متعال نے اپنے کلام پاک میں چندمواقع پرظالموں پرصراحتاً لعنت بھیجی ہے۔

علم اخلاق میں عدالت سے مراد ملکات وصفات نفسانی میں میانہ روی ہےاور یہ صفت اس میں پائی جاتی ہے جوانفرادی واجتماعی عدالت کی رعایت کرتا ہو۔

سچائی

لوگوں کے درمیان آپس میں رابطہ، جو انسان کی اجتماعی بنیاد ہے، گفتگو سے برقرار ہوتی ہے ۔اس بنا پر سچ بات جو انسان کیلئے پوشیدہ حقیقت کو ظاہر کرتی ہے،اجتماع کے ضروری ارکان میں سے ایک ہے،اوراہم فائدے۔جن سے اجتماع ہرگز بے نیاز نہیں ہے۔سچ بات سے حاصل ہوتے ہیں۔سچائی کےفوائدکومندرجہ ذیل چند جملوں میں بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔سچ بولنے والا،اپنے ہم جنسوں کے لئے قابل اعتماد ہوتا ہے اوران کواس کی ہر بات کے بارے میں تحقیق کی ضرورت نہں ہوتی۔

۲۔سچ بولنے والا،اپنےضمیر کے مقابلہ میں سر بلند اورجھوٹ کے رنج سے آسودہ ہوتا ہے۔

۳۔سچ بولنے والا،اپنے عہد و پیمان کی وفا کرتا ہے اور جو امانت اسکے حوالہ کی جاتی ہے،اس میں خیانت نہیں کرتا ہے،کیونکہ رفتار میں سچائی،گفتار کی سچائی سے جدانہیں ہے۔

٤۔سچ بولنے سے،اکثر اختلافات اورلڑائی جھگڑے ختم ہوجاتے ہیں،کیونکہ اکثر اختلافات اور جھگڑے اس لئے وجود میں آتے ہیں کہ ایک طرف یا دونوں طرف کےلوگ حق وحقیقت سے منکر ہوتے ہیں۔

٥۔سچ بولنے سے،اخلاقی عیوب اورقانون کی خلاف ورزی کاایک بڑا حصہ خودبخود ختم ہوجاتا ہے ،کیونکہ اکثر لوگ اسی قسم کے کردارکو چھپانے کیلئے جھوٹ بولتے ہیں امیرالمؤمنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

حقیقی مسلمان وہ ہے جو سچ بولنے کو۔خواہ اس کے نقصان میں ہو۔جھوٹ بولنے پر ترجیح دیتا

ہے چاہے وہ اس کے لئے مفید ہی کیوں نہ ہواوراس طرح وہ اندرونی سکون حاصل کرتا ہے۔(۱)

جھوٹ

جھوٹ اسلام میں گناہ کبیرہ ہے،جس کے لئے خدائے متعال کے کلام میں یقینی عذاب کا وعدہ دیا گیاہے۔

جھوٹ،صرف شرع میں ہی گناہ اور برا عمل نہیں ہے بلکہ عقل کی رو سے بھی اس کی برائی

....

۱۔نہج البلاغہ صالح،کلمات قصار نمبر ۴۵۸ ڈھوڑے سے اختلاف کے ساتھ۔

واضح ہے ۔یہ ناپسندیدہ عمل ،معاشرے میں پھیلنے سے،تھوڑی ہی مدت میں لوگوں کے اجتماعی رابطہ یعنی اعتماد کوختم کر دیتا ہے،اوراس قسم کے رابطہ کے ختم ہونے سے،لوگوں کا ایک دوسرے پر اعتماد نہیں ہوتا لہذا ،انفرادی طور پر زندگی گزارتے ہیں ،اگر چہ بظاہر اجتماعی صورت دکھائی دیتی ہے۔

جھوٹ کے نقصانات

سچ بولنے کے بارے میں مذکورہ بیان سے جھوٹ بولنے کے نقصانات بھی واضح ہوجاتے ہیں۔جھوٹ بولنے والا انسانی معاشرے کا نابکار دشمن ہوتا ہے اوراپنے جھوٹ سے، جوایک بڑا جرم ہے ،معاشرے کوخراب کرڈالتا ہے ،کیونکہ جھوٹ،نشہ آورچیز کے مانند ہے جومعاشرے کی عقل وشعور کی طاقت کونابود کرکے حقائق پر پردہ پوشی کرتا ہے یا شراب کے مانند ہے جولوگوں کومست کرکے عقل کی طاقت کو برے اور بھلے میں تمیز کرنے سے بیکار بنادیتا ہے۔اسی لئے اسلام نے جھوٹ کوگناہان کبیرہ میں شمارکیا ہے اورجھوٹ بولنے والے کے لئےکسی قسم کی دینی شخصیت کا قائل نہیں ہے۔

پیغمبراکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

تین طائفے منافق ہیں،اگرچہ وہ نماز بھی پڑھیں اورروزہ بھی رکھیں:

جھوٹ بولنے والا،اپنے وعدہ پروفانہ کرنے والا اورامانت میں خیانت کرنے والا ہے۔(۱)

....

۱۔میزان الحکمہ ،ج۱۰،ص۱۵٤۔

امیرالمؤمنین حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

انسان جب ایمان کی لذت کوچکھ لیتا ہے،توجھوٹ کوترک کردیتا ہے اگرچہ مذاق میں بھی ہو۔(۱)

غیبت و تہمت

دوسروں کی بدگوئی کرنا اوران کی سرزنش کرنا، اگر سچ ہوتو غیبت ہے اور اگر جھوٹ ہوتو تہمت ہے کبھی اسے بہتان بھی کہا جاتا ہے۔

البتہ پروردگار عالم نے انسان کو (پیغمبروں اور ائمہ اطہار کے علاوہ) معصوم خلق نہیں کیا ہے اور ہر شخص خود میں موجود نقائص کی وجہ سے خطا و لغزش سے محفوظ نہیں ہے اور عام لوگ اس پردہ کے پیچھے زندگی کرتے ہیں جسے اللہ نے اپنی حکمت سے ان کے اعمال پر کھینچا ہے ۔ چنانچہ اگر ایک لمحہ کے لئے اس الٰہی پردے کو ان کے نقائص اور عیوب سے ہٹا دیا جائے تو سب ایک دوسرے سے متنفر ہوکر بھاگ جائیں گے، اوران کے معاشرے کی عمارت زمین بوس ہوکر ویران ہوجائیگی ۔ اس لئے خدائے متعال نے غیبت کو حرام قرار دیا ہے تاکہ لوگ ایک دوسرے کے پیچھے امان میں رہیں ۔ اوران کی زندگی کا ظاہری ماحول آراستہ ہوجائے تاکہ یہی ظاہری زیبائی تدریجاً باطنی برائی کی اصلاح کرے۔

....

۱۔اصول کافی، ج۲،ص ۳٤٠، ح۱۱۔

خدائے متعال فرماتا ہے:

(...ولا یغتب بعضکم بعضًا ایحبّ احدُ کم ان یا کلَ لحم اخیہ میتاً...)

(حجرات۱۲)

...ایک دوسرے کی غیبت بھی نہ کرو کہ کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے؟..

تہمت کا گناہ اور اس کی برائی غیبت سے زیادہ شدید ہے اور اس کی برائی عقل کی رو سے واضح ہے۔خدائے متعال نے اپنے کلام پاک میں اس کی برائی اور ناجائز ہونے کو مسلم جانا ہے اور بلا چون و چرا ذکر فرماتا ہے:

(انّما یفتری الکذب الّذین لا یؤمنون...) (نحل ۱۰۵)

بیشک جو ایمان نہیں رکھتے ہیں وہ افترا کہتے ہیں...

لوگوں کی عزت پر تجاوز

اسلام میں عصمت دری، گناہان کبیرہ میں سے ہے اور مواقع کے فرق کے مطابق اس جرم کے لئے سخت سزائیں، جیسے کوڑے، سنگسار اور قتل وضع ہوئی ہیں۔

اس برے عمل کی راہ کا کھلا ہونا، اگر چہ طرفین کی رضامندی سے ہی ہو نسلوں کو۔ جسے اسلام نے زیادہ اہمیت دی ہے، متزلزل کر کے رکھ دیتا ہے اور وراثت وغیرہ کے احکام کو معطل کر دیتا ہے اور آخر کار ماں باپ اور فرزند کے پیار کو بے اثر کر کے رکھ دیتا ہے اور معاشرے کے حقیقی ضامن زاد وولد کی فطری دلچسپی کو نابود کر دیتا ہے۔

رشوت

کسی ایسے حکم یا کام کے انجام دینے کے لئے پیسے یا کوئی تحفہ لینا، جبکہ وہ کام پیسے یا تحفہ لینے والے کا فریضہ ہو، تو اس کو رشوت کہتے ہیں۔

اسلام میں رشوت گناہ کبیرہ ہے اور اس کا مرتکب ہونے والا، اجتماعی اور دینی فوائد (عدالت) سے محروم اور عذاب الٰہی کا مستحق ہوتا ہے۔ کتاب وسنت اسکے گواہ ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رشوت دینے اور لینے والے اور ان کے درمیان واسطہ بننے والے، پر لعنت کی ہے۔(۱)

چھٹے امام حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

کسی کی حاجت پورا کر کے رشوت لینا خدا سے کفر کے برابر ہے (۲)

البتہ یہ سب سرزنش اور مذمت اس رشوت کے بارے میں ہے جو حق بجانب حکم اور عادلانہ عمل کے بارے میں لی جائے اور جو رشوت غیر حق بجانب حکم اور ظالمانہ عمل کے لئے لی جائے، اس کا گناہ بہت بڑا اور اس کی سزا اشد ید تر ہے۔

حسن معاشرت

انسان جو سماج میں زندگی بسر کرتا ہے، اس کے لئے لوگوں کے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ بیشک یہ مل جل کر رہنا اس لئے ہے تا کہ انسان اپنی

....

۱۔سفینۃ البحار ج۱،ص ۵۲۳۔

۲۔سفینۃ البحار ج۱،ص ۵۲۳۔

انسان اپنی اجتماعی زندگی کا تحفظ کر سکے اور روز بروز اپنی مادی و معنوی ترقی میں اضافہ کرے اور زندگی کی مشکلات کو بہتر و آسان تر صورت میں حل کرے۔

لہذا، لوگوں سے ایسا برتاؤ کرنا چاہیئے جو محبوبیت کا سبب بنے اور دن بدن انسان کے اجتماعی وزن کو بڑھا وا دے اور اس کے دوستوں میں اضافہ ہو، کیونکہ اگر لوگ کسی سے مل کر سنگینی یا تلخی کا احساس کریں گے تو ان کے دلوں میں نفرت اور تنگی پیدا ہو جائے گی اور آخر کار ایک ایسا دن آئے گا جب سب لوگ اس سے دوری اختیار کریں گے اور ایسا شخص معاشرے میں منفور و مبغوض ہو جائے گا اور اس کو سماج میں ہونے کے باوجود تنہائی کی حالت میں اور اپنے وطن میں ہوتے ہوئے بھی غریب الوطنی کی زندگی بسر کرنا پڑے گی اور یہ حالت انسان کی بدبختی کا تلخ و تاریک ترین نمونہ ہے۔

اس لئے دین مقدس اسلام نے اپنے پیروؤں کے لئے حسن معاشرت کی نصیحت و تاکید کی ہے اور اس کے بارے میں بہترین آداب و رسوم بیان فرمائے ہیں۔منجملہ حکم دیا ہے کہ مسلمانوں کو ملاقات کے وقت ایک دوسرے کو سلام کرنا چاہیئے اور فضیلت اس کے لئے ہے جو سلام کرنے میں سبقت حاصل کرے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ،سلام کرنے میں پہل کرتے تھے حتی عورتوں اور بچوں کو بھی سلام کرتے تھے۔اگر کوئی شخص آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کو سلام کرتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ

اسکا بہترین جواب دیتے تھے۔خدائے متعال فرماتا ہے:

(واذا حیّیتم بتحیة فحیّوا باحسن منہا او ردّوہا ...)

(نسائی ۸۶)

جب تم لوگوں کو سلام کیا جائے، تو تم اس سے بہتر یا ویسا ہی جواب دو

مزید حکم دیا ہے کہ انسان لوگوں سے ملتے وقت تواضع اور انکساری سے پیش آئے اور ہر ایک کا اسکی اجتماعی حیثیت کے مطابق احترام کرے۔خدائے متعال فرماتا ہے:

(وعباد الرّحمن الّذین یمشون علی الارض ہوناً ...)

(فرقان ۶۳)

اور اللہ کے بندے وہی ہیں جو زمین پر آہستہ فروتنی اور انکساری سے چلتے ہیں۔

قابل ذکر نکتہ یہ ہے کہ تواضع اور انکساری کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انسان خود کو لوگوں کے سامنے ذلیل وخوار کرے اور اپنی انسانیت کو نقصان پہنچائے ، بلکہ مقصد یہ ہے کہ اپنی قدرومنزلت اور فخر ومباہات کو لوگوں کے سامنے ظاہر نہ کرے اور دوسرے عظیم فخر ومباہات کو خود سے مخصوص نہ کرے اور لوگوں کو حقیر وناچیز نہ سمجھے۔اسی طرح لوگوں کے احترام کا معنی یہ ہیں کہ لوگوں کا اس حدتک احترام کرے کہ چاپلوسی نہ ہو بلکہ ہرایک کا اس کی دینی واجتماعی قدرومنزلت کی حد میں احترام کرے،بزرگوں کا ان کی بزرگی کے مطابق احترام کرے اور دوسروں کا بھی ان کی انسانیت کے مطابق احترام کرے۔

نیز احترام واکرام کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اگر کسی سے کوئی ناشائستہ کام سرزد ہوتے دیکھے

توآنکھیں بند کر کے گزر جائے یا ایک ایسی محفل میں جہاں پر اہل محفل انسانی شرافت کے خلاف کام انجام دیتے ہوں یا کوئی خلاف شرع عمل انجام دیتے ہوں تو رسوائی سے ڈر کر ان کے ساتھ ہم رنگ و جماعت ہو جائے ۔لوگوں کا احترام حقیقت میں انسانی شرافت اوران کی دینی قدروں کا احترام ہے نہ کہ ان کے جسم اوراعضاء کا احترام ۔اگر کوئی شخص اپنی انسانی شرافت اوردینی ترجیحات کونابود کر دے توکوئی دلیل نہیں بنتی کہ اس کا احترام کیا جائے ۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

دوسروں کی اطاعت کے ذریعہ خدا کی معصیت انجام نہیں دینا چاہئے ۔(۱)

....

۱۔وسائل الشیعہ ،ج۱۱،ص۴۲۲ ۔

نیکوں کی مصاحبت

اس کے باوجود کہ انسان بہت سے لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہتا ہے، مگر وہ زندگی کے تقاضے کے مطابق مجبور ہے کہ کچھ لوگوں کے ساتھ دوسروں کی نسبت زیادہ مل جل کر رہے، یہ وہ لوگ ہیں جو دوست کے نام مشہور ہیں۔

البتہ اس دوستی کا سبب اخلاق، روش، اور پیشہ وغیرہ میں ایک قسم کی یکسانیت ہے جو دو یا چند افراد کے درمیان پائی جاتی ہے اور چونکہ وابستگی اور مصاحبت کے نتیجہ میں رفتہ رفتہ دو ہم نشین افراد کے عادات و اخلاق ایک دوسرے میں منتقل ہوتے ہیں، لہذا انسان کو نیک انسانوں کی دوستی اختیار کرنی چاہئے، کیونکہ اس صورت میں ان کے نیک اخلاق اس میں سرایت کریں گے اس کی بےلوث اور خیرخواہانہ دوستی سے استفادہ کرے گا اور اس کی دوستی کی پائداری سے مطمئن رہے گا۔ اس کے علاوہ لوگوں کی نظروں میں اس کی اجتماعی حیثیت بھی بڑھ جائے گی

۔

امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

خیر الاصحاب من یدلُّک علی الخیر

بہترین دوست وہ ہے جو تجھے نیک کام کی طرف راہنمائی کرے۔

مزید فرماتا ہے:

المرء یوزن بخلیله

مرد اپنے دوست کے ذریعہ تولا جاتا ہے (۱)

تو اول بگو با چہ کس زیستی
کہ تامن بگویم کہ تو کیستی
ہمان قیمت آشنایان تو
بود قیمت وارزش جان تو

تم پہلے یہ بتاو کہ تم کس کے ہم نشیں ہوتا کہ میں بتا سکوں کہ تم کون ہو تیری قدر و قیمت بھی وہی ہوگی جو تیرے دوست کی ہے۔

....

۱۔میزان الحکمۃ ،ج۲،ص ۳۲۷۔

بروں کی مصاحبت

بروں اور گنہگاروں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا بدبختی اور برے انجام کا سبب بنتا ہے۔اس مطلب کی وضاحت کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ اگر ہم مجرموں اور بدکرداروں جیسے چوروں اورڈاکوؤں سے ان کے انحراف وگمراہی کے سبب کے بارے میں پوچھیں تو وہ کسی شک وشبہہ کے بغیر جواب دیں گے کہ برے لوگوں کی مصاحبت اورمعاشرت نے ہمیں اس مصیبت میں گرفتار کیا ہے۔ہزاروں بدکرداروں میں ایک آدمی بھی ایسا نہیں ملے گا کی جس نے خودبخود ناشائستہ راستہ کوانتخاب کیا ہو۔

امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

بروں کی ہم نشنی سے پرہیز کرو، کیونکہ برادوست تم کو اپنے جیسا بنادے گا، اور وہ تمہارے جیسا نہیں بنے گا(۱)

مزید فرماتے ہیں:

اياك ومصادقة الفاجر فانه يبيع مصادقه بالتّافة (۲)

بدکردار کی دوستی سے پرہیز کرو کیونکہ وہ تم کو معمولی چیز کے مقابلہ میں بیچ دے گا.

بابدان کم نشین کہ درمانی

خو پذیر است نفس انسانی

بروں کی ہم نشنی کم اختیار کرو، کیونکہ انسان دوسروں کی عادت کو قبول کرنے والا ہوتا ہے

....

۱۔شرح غرر الحکم، ج۲، ص۲۸۹۔

۲۔غرر الحکم، ح۱۰۷، ص۱۵۹۔

ماں باپ پر اولاد کے حقوق

انسان کو جو کام انجام دینا چاہئے جس کے بارے میں انجام دیتا ہو اور اس کو اس کا نفع ملتا ہو تو اسے حق کہتے ہیں اور جس کے لئے اسے انجام دینا چاہئے اسے فریضہ، حکم اور تکلیف

کہتے ہیں۔ مثلا کوئی شخص کسی کے لئے اجرت پر کوئی کام انجام دیتا ہے،تو اجرت ادا کرنا صاحب کار کا فرض ہےاور مزدور کا حق ہے۔ اگر صاحب کار نے اجرت ادانہ کی تو مزدوراس سے مطالبہ کرسکتا ہے اوراپنے حق کا دفاع کرسکتا ہے، کیونکہ انسان اس طرح خلق کیا گیا ہے کہ اس دنیا میں اس کی زندگی ابدی نہیں ہے اور خواہ نخواہ کچھ مدت کے بعد، رخت سفر باندھتا ہے، خدائے تعالے نے انسان کی نسل کو نابودی سے بچانے کے لئے تناسل وتوالد کی روش کو قرار دیا ہے اور انسان کو تناسل کے وسائل مہیا کئے ہیں اوراس کے باطنی جذبات کواس کام کی طرف متوجہ کیا ہے۔

اسی مکمل آمادگی کا نتیجہ ہے کہ انسان فطری طور پر اپنی اولاد کو اپنے بدن کا ٹکڑا سمجھتا ہے اوراس کی بقا کو اپنی بقا جانتا ہے اوراس کی آسائش وکامیابی کی راہ میں ہرقسم کی تلاش وکوشش کرتا ہے اور گوناگوں رنج والم برداشت کرتا ہے، کیونکہ وہ اس کی ذات یا شخصیت کی نابودی کو اپنی ذات یا شخصیت کی نابودی جانتا ہے۔ حقیقت میں وہ خالق کائنات کے حکم کی تعمیل کرتا ہے جو بشر کی بقا چاہتا ہے۔ لہذا ماں باپ کا فرض ہے کہ جس حکم میں ضمیر وشرع متفق ہیں اس کو اپنے فرزند کے بارے میں نافذ کریں اوراس کی اچھی پرورش کریں تا کہ وہ ایک شائستہ انسان بن جائے، اس کے لئے اسی چیز کا انتخاب کریں جس کو انسانیت کی نگاہ میں اپنے لئے انتخاب کرتے ہیں۔ یہاں پر ہم ان میں سے بعض حقوق کو بیان کرتے ہیں:

۱۔ پہلے ہی دن سے جب بچہ بات یا اشارہ کو سمجھنے لگے، اس کے ضمیر میں پسندیدہ اخلاق او رشائستہ صفات کی بنیاد ڈال کر انھیں مستحکم کریں اور حتی الامکان اسے بیہودہ باتوں کے ذریعہ

نہ ڈرائیں اور اسے بُرے اور عفت کے خلاف کاموں سے روکیں اور خود بھی اس کے سامنے جھوٹ بولنے، گالیاں دینے اور برے الفاظ استعمال کرنے سے پرہیز کریں اور اس کے سامنے پسندیدہ کام انجام دیں تا کہ شریف اور عالی مزاج بن جائے اور اپنی طرف سے سنجیدگی، ہمت اور عدالت کا مظاہرہ کریں تا کہ ان کی عدالت دوستی اور انسان پروری انتقال اخلاق کے قانون کے تحت اس میں منتقل ہوجائے اور زیادتی، حوصلہ شکنی اور خود پرستی سے محفوظ رہے۔

۲۔ جب تک ممیّز نہ ہوجائے کھانے پینے، سونے اور اس کی دوسری ضرورتوں میں اس کا خیال رکھیں اور اس کے جسمی حفظان صحت کی رعایت کریں تا کہ وہ ایک سالم بدن اور قوی دماغ اور اچھا مزاج والا بن کر تعلیم و تربیت کے لئے آمادہ ہوجائے۔

۳۔ جب بچہ میں تعلیم و تربیت کی استعداد پیدا ہوجائے (عام طور پر یہ مرحلہ سات سال کی عمر میں آتا ہے) اسے معلم کے حوالہ کریں اور کوشش کریں کہ ایک شائستہ معلم کی تربیت میں رہے تا کہ جو کچھ اس سے سنے اس کا اس پر اچھا اثر پڑے اور وہ اس کے روح کی شرافت، تزکیہ نفس اور تہذیب اخلاق کا سبب بنے۔

٤۔ جب بچے کی عمر اتنی ہوجائے کہ وہ عام پروگراموں یا خاندانی نشست و برخاست میں شرکت کرسکتا ہو، تو اسے اجتماعی رسومات سے آشنا کرنے کے لئے اپنے ساتھ پروگراموں میں لے جانا چاہئے اور پسندیدہ معاشرتوں کے طرز عمل سے اسے آگاہ کرنا چاہئے۔

اولاد پر ماں باپ کے حقوق

وہ آواز جو ضمیر اور شرع کے منادی کی طرف سے ماں باپ کے کانوں میں پہنچی اور انھیں اولاد کے بارے میں ذمہ دار بنا دیا، اسی طرح ضمیر اور شرع کی آواز نے اولاد کو بھی متوجہ کیا اور اس پر فرض کر دیا کہ اپنے ماں باپ کی نیکیوں کا۔ ہاتھ، زبان یا ہر وسیلہ سے۔ شکریہ بجالائے۔

ماں باپ وہ ہیں جو خدا کے ارادہ سے اپنے فرزند کو وجود میں لائے ہیں اور اپنے آرام وسکون اس کے معنوی اور جسمانی آرام وسکون پر قربان کر کے ایک عمر راتوں کو جاگ کر اور دن میں رنج وغم برداشت کر کے اسے ایک قوی انسان بناتے ہیں۔

کتنی نامردی، پستی اور نمک حرامی ہے کہ انسان اپنے ماں باپ کو اذیت پہنچائے یا ان کے بوڑھاپے اور ناتوانی کے دنوں میں ان کی مدد نہ کرے!!

خدا کی توحید، جو انسان کا پہلا فریضہ ہے، کے بعد دوسرا فریضہ جو اسلام نے انسان کے لئے معین کیا ہے، وہ ماں باپ کے ساتھ اچھا برتاؤ ہے:

(وقضی ربُّك الاّ تعبدوا آلّاا ایّاہ و بالوالدین احساناً...)

(اسرائ/۲۳)

اور آپ کے پروردگار کا فیصلہ ہے کہ تم سب اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا...

اسلام میں مقرر شدہ فریضے کے مطابق، فرزند کو کسی صورت میں یہ حق نہیں ہے کہ اپنے ماں باپ کو ذلیل وخوار سمجھے اور ایک ایسا کام انجام دے جو ان کی رنجیدگی کا سبب بنے، اسے

ہمیشہ اپنے ماں باپ کا احترام کرنا چاہئے اور ان کی نسبت فروتنی اور انکساری اور احسان و نیکی کے ساتھ پیش آنا چاہئے، خاص کر ان کی ضرورت کے وقت ان کی مدد کرنے میں کوتاہی نہ کرے۔لیکن جاننا چاہئے کہ ماں باپ کی مرضی کی رعایت کرنا صرف مستحب اور مباح کاموں میں ہے، واجبات میں ان کی مرضی کے مطابق انجام دینا لازم نہیں ہے۔

بھائیوں اور بہنوں کے باہمی حقوق

قرآن مجید میں، رشتہ داروں کے بارے میں بارہا تاکید کی گئی ہے اور قطع رابطہ سے منع کیا گیا ہے۔ماں باپ اور اولاد کے بعد انسان کے قریبی ترین رشتہ دار بھائی اور بہن ہیں اور ان کے درمیان اجتماعی رابطہ فطری ہے اور یہ رابطہ تمام رابطوں سے مستحکم اور بنیادی تر ہے۔ بھائی بہنوں کا فریضہ ہے، کہ ضرورت پر رشتہ کے ناطوں کو نہ توڑیں اور آپس میں تعاون کر کے حتی الامکان ایک دوسرے کی مدد کریں اور ضرورت پر ایک دوسرے کی دستگیری کریں ۔بڑے، چھوٹوں کے ساتھ مہربانی اور ہمدردی سے پیش آئیں اور چھوٹے بھی بڑوں کا احترام کریں۔

عاق والدین

خاندانی اجتماع میں اولاد کی ماں باپ سے وہی نسبت ہے جو ایک درخت میں شاخوں کی جڑ سے ہوئی ہے، چونکہ جس طرح درخت کی شاخوں کا وجود جڑ پر منحصر ہوتا ہے، اسی طرح فرزند

کی زندگی بنیاد ڈالنے والے اس کے ماں باپ ہوتے ہیں۔ چنانچہ انسانی معاشرہ والدین اوراولاد کے دوگروہ سے تشکیل پاتا ہے،اسلئے معاشرے کی اصلی بنیاد والدین ہی ہیں۔

ماں باپ کے ساتھ براسلوک کرنا اورانھیں اذیت وآزار پہنچانا،نمک حرامی اورنامردی کے علاوہ انسانیت کے انحطاط اورمعاشرے کی نابودی کا سبب بنتا ہے۔ کیوں کہ اولاد کی طرف سے ماں باپ کی بے احترامی، ماں باپ کی طرف سے بھی عدم محبت اور بےتوجہی کی صورت میں ظاہر ہوگی اوردوسرے یہ کہ جواولاد اپنے ماں باپ کوذلیل وخوار اور پست نگاہ سے دیکھتے ہیں وہ اپنی اولاد سے اپنے سے زیادہ توقع نہیں رکھیں گےاوراپنے بوڑھاپےاورناتوانی کے دنوں میں ان کی طرف سے دستگیری اور مدد کی کوئی امید نہیں رکھیں گے اوراسطرح لامحالہ خاندان کی تشکیل سردمہری کا شکار ہوگی،جیسا کہ آج کل بہت سے نوجوانوں میں ایسی حالت کا مشاہدہ ہوتا ہے۔

اس طرز فکر کا عام ہونا قطعی طور پر تناسل اورتوالد کی راہ کومسدود کرتا ہے، کیونکہ کوئی عقل مند اپنی گراں بہا عمر کوایک ایسے پودے کی پرورش میں صرف نہیں کرتا جس کا نہ وہ پھل کھا سکے گا اورنہ اس کے سایہ میں بیٹھ سکے گا اورنہ اس کودیکھنے میں غم واندوہ کے علاوہ اسے کوئی فائدہ ہو گا۔ممکن ہے ہم تصور کریں کہ حکومت مختلف انعامات سے لوگوں کو خاندان کی تشکیل میں تشویق کرے اور اسطرح ،تناسل وتوالد کا مسئلہ حل ہو جائے ،لیکن یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ اجتماعی رسومات میں سے اگرکوئی بھی طریقہ اوررسم فطری پشت پناہی (جیسے ماں باپ اور اولاد کے جذبات) نہ رکھتی ہوتو وہ پائدارنہیں ہے۔

اس کے علاوہ فطری جبلتوں میں سے کسی ایک جبلت کو چھوڑنا انسان کو معنوی لذتوں سے محروم کرتا ہے۔

عزت نفس اور کامیابی

یہ بات مسلم اور یقینی ہے کہ ہر معاشرے میں بے چارے اور نادار، مدد اور دستگیری کے مستحق ہوتے ہیں۔سرمایہ داروں کا فرض ہے کہ ان کی مدد کریں اور ان کے اس مسلم حق کو پامال نہ کریں اور شرع مقدس میں اسلام نے بھی اس حق کی رعایت کے سلسلہ میں تاکید ونصیحت کی ہے، اور دولتمندوں پر ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ ناداروں اور بیچاروں کی مدد کریں۔

خدائے متعال نے قرآن مجید میں خود کو نیکی کرنے والا، بخشش وعطا کرنے والا اور معاف کرنے والا کہا ہے .اور اپنے بندوں کو یہ پسندیدہ صفتیں پیدا کرنے کی ترغیب وتشویق فرماتا ہے۔

خدائے متعال نیک کام انجام دینے والوں کے ساتھ ہے۔(۱)

نیز فرماتا ہے:

جس چیز کو انفاق کرتے ہو وہ خود تمہارے فائدے میں ہے۔(۲)

دوسری جگہ پر فرماتا ہے:

جو کچھ انفاق کرتے ہو، وہ تمھیں پلٹا دیا جاتا ہے اور تم نے کسی قسم کا نقصان نہیں اٹھایا ہے (۳)

احسان اور محتاجوں کی مدد

اجتماعی حالات اور احسان کے فوائد کے بارے میں غور وفکر اور مطالعہ ان آیات کے مضمون کوواضح کردیتا ہے، کیونکہ حقیقت میں تمام اجتماعی توانائیاں سارے افراد کے لئے

....

۱۔(عنکبوت ۶۹)۔

۲۔(بقرہ ۲۷۲)۔

۳۔(انفال ۶۰)۔

کام کرتی ہیں اور جس معاشرے میں کچھ غریب ونادار فقر وتنگ دستی کی وجہ سے کام اور کوشش سے ہاتھ کھینچ لیتے ہیں تو ان کی تعداد کے اعتبار سے مال وثروت کی پیداوار میں کمی واقع ہوتی ہے اور اس کے نامطلوب نتائج تمام لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں اور نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ دولت مند دوسروں سے زیادہ بیچارے ہوجاتے ہیں،لیکن اگر مالدار اپنی نیکی اور بخشش سے ناداروں کی دستگیری کریں تو ان کے حق میں بہت اچھے نتائج نکلتے ہیں کہ من جملہ ان کے:

۱۔اس کام سے دوسروں کے دلوں میں اپنے بارے میں محبت پیدا کرتے ہیں اور ایک گروہ کو اپنا عاشق بناتے ہیں۔

۲۔ایک ناچیز مال سے اپنے لئے زیادہ احترام حاصل کرتے ہیں۔

۳۔تمام لوگوں کی پشت پناہی کو اپنے لئے حاصل کرتے ہیں، کیونکہ لوگ نیکی کرنے والے کی طرف داری کرتے ہیں۔

٤۔اس دن کے خطرے سے محفوظ رہتے ہیں کہ جس دن تمام ناداروں کی ناراضگی جمع ہوکر ہر خشک وتر کو بہادے گی۔

٥۔وہی ناچیز مال جو انفاق کیا ہے،اقتصاد کا پہیہ حرکت میں آنے کا سبب بنتا ہے اور معاشرے کے مال میں اضافہ ہوکر خود ان کی طرف پلٹتا ہے۔

خدا کی راہ میں انفاق کرنے کی فضیلت اور اسکی طرف ترغیب اور تشویق کرنے کے بارے میں بہت سی آیات وروایات موجود ہیں۔

تعاون

احسان ونیکی کا مسئلہ جو بیان ہو چکا،تعاون کے مختلف شعبوں میں سے ایک ہے جو انسانی معاشرے کی بنیاد ہے، کیونکہ سماج کی حقیقت، افراد کا ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دینا ہے تا کہ ایک دوسرے کی مدد سے سبھی کا کام ٹھیک ہوجائے اور سبھی کی زندگی مستحکم اور سبھی کی ضرورتیں پوری ہوجائیں۔لیکن یہ تصور نہیں کرنا چاہئے کہ دین مقدس اسلام نے نیکی کو صرف مال کی صورت میں چاہا ہے، بلکہ ہر بیچارے کی دستگیری، اگر مال کی ضرورت بھی نہ ہو، دین مقدس اسلام کا مقصد ہے اور انسانی ضمیر کا مطلوب بھی ہے۔

ایک جاہل کو علم سکھانا، ایک اندھے کا ہاتھ پکڑنا، ایک گمراہ کی راہنمائی کرنا اور گرے ہوئے کی

مدد کرنا وغیرہ سب احسان اور نیکی کے مصادیق اور اس تعاون میں سے ہیں کہ ہم نے اجتماع کو تشکیل دینے کے پہلے دن اس کے اعتبار کی تصدیق اور تائید کی ہے اور واضح ہے کہ اگر انسان، بعض جزئی کام انجام نہ دے تو وہ بنیادی کام بھی انجام نہیں دے گا، اگر غیر اہم اور جزئی فرائض کی رعایت نہ کرے، تو وہ کلی اور اہم فرائض کو بھی انجام نہیں دے گا۔

خیرات اور نیکیوں کی طرف سبقت کرنا

نیک کام کا پسندیدہ ہونا ان نتائج کی بنا پر ہے جو اس سے حاصل ہوتے ہیں البتہ جس قدر یہ نتائج و آثار عوامی تر اور پائندہ تر ہوں، اسی قدر نیکی بھی پسندیدہ تر و عالی تر ہوگی، ایک بیمار کا علاج کرنا نیک کام اور احسان ہے، لیکن ایک ہسپتال کو تعمیر کرنا اور اسے چالو کرنا جس میں روزانہ سیکڑوں بیماروں کا علاج کیا جائے، اس کے ساتھ قابل موازنہ نہیں ہے۔ ایک طالب علم کی تعلیم پسندیدہ ہے، لیکن ایک ادارہ کی تاسیس کے ساتھ قابل موازنہ نہیں ہے جس میں سالانہ سیکڑوں دانشور علم حاصل کر کے فارغ ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ عام اوقاف اور عوامی سطح کے خیرات و نیکیاں احسان و نیکیوں کے عالی مراتب شمار ہوتے ہیں۔

شرع کی زبان میں ان عمومی خیرات کو صدقہ جاریہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

مرد کی سربلندی کا سبب دو چیزیں ہیں، ایک فرزند صالح اور دوسرے صدقہ جاریہ

چنانچہ کتاب وسنت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب تک صدقہ جاریہ باقی رہتا ہے خدائے متعال

،صدقہ دینے والے کے نام ثواب لکھتا ہے۔

یتیم کا مال کھانا

جس طرح لوگوں کے ساتھ نیکی کرنا عقلاً وشرعاً پسندیدہ ہے اسی طرح خدا کے بندوں کے ساتھ بُرائی کرنا ناروااور قابل مذمت کام ہے،لیکن شرع مقدس اسلام میں ظلم کے چند مواقع کی شدت کے ساتھ نہی کی گئی ہے، کہ ان میں سے ایک مال یتیم میں تفریط ہے۔

اسلام نے یتیم کا مال کھانے کو گناہان کبیر میں شمار کیا ہے اور قرآن مجید میں صراحت سے بیان کیا گیا ہے، کہ جو یتیم کا مال کھاتا ہے، حقیقت میں وہ آگ کھاتا ہے اور اسے جلتی ہوئی آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ چنانچہ ائمہ اطہار علیہم السلام کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قدر تاکید کا سبب یہ ہے کہ اگر کسی بوڑھے انسان سے ظلم کیا جائے تو ممکن ہے وہ مقابلہ کرنے کے لئے اٹھ کر اپنے حق کا دفاع کرے گا، لیکن کم عمر یتیم اپنے حق کا دفاع کرنے سے عاجز ہے۔

کسی کو قتل کرن

ظلم کا ایک اور مقام جسے شرع مقدس اسلام میں بہت ناپسند و قابل مذمت سمجھا گیا ہے وہ قتل نفس اور بے گناہ کو قتل کرنا ہے۔

قتل نفس گناہان کبیرہ میں سے ہے، اور خدائے متعال نے اپنے کلام میں، ایک انسان کو قتل کرنا پوری انسانیت کو قتل کرنے کے برابر جانا ہے، یہ اس لئے ہے کہ انسان کو قتل کرنے والا

انسانیت کے ساتھ سروکار رکھتا ہے اور انسانیت ایک آدمی اور ہزار آدمی میں یکساں ہے۔

رحمتِ خدا سے مایوسی

اسلام میں ایک خطرناک ترین گناہ خدا کی رحمت سے مایوسی ہے خدائے تعالے فرماتا ہے:

(قل یٰعبادی الذین اَسرفُوا علی انفسِھم لاتقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذُّنوب جمیعا انّہ ہو الغفور الرّحیم)

(زمر ۵۳)

پیغمبر! آپ پیغام پہنچادیجئے کہ اے میرے بندوا جنھوں نے اپنے نفس پر زیادتی کی ہے رحمت خدا سے مایوس نہ ہونا اللہ تمام گناہوں کا معاف کرنے والا ہے اور وہ یقینا زیادہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔

ایک دوسری جگہ پر رحمت خدا سے مایوس شخص کو قرآن کافر جانتا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص خدا کی رحمت اور بخشش سے مایوس ہوا، تو پھر اس کے پاس باطنی طور پر تحریک کرنے والا محرک نہیں ہے کہ اچھے اور پسندیدہ کام انجام دے یا گناہان کبیرہ وصغیرہ اور بُرے کردار سے اجتناب کرے، کیونکہ ان دونوں چیزوں میں اصلی محرک عذاب خدا سے بچنے کے لئے رحمت ونجات کی امید ہے۔ اور چونکہ یہ امید اس شخص میں نہیں پائی جاتی ہے لہذا یہ شخص اس کافر سے کسی قسم کا فرق نہیں رکھتا ہے جو کسی دین کا پابند نہیں ہے۔

جہاداوردفاع سے فرار کی سزا

میدان جنگ سے بھاگنے اور دشمن کو پیٹھ دکھانے کے معنی یہ ہیں کہ، بھاگنے والا، اپنی جان کو معاشرے کی زندگی سے زیادہ قیمتی جانتا ہے اور حقیقت میں یہ دشمن کے سامنے دینی مقدسات اور معاشرے کی جان و مال کو پیش کرنے کے مترادف ہے جو اس کی زندگی کی حیثیتیوں کو دھمکاتا ہے۔

اسی لئے جہاداوردفاع سے بھاگنے کو گناہان کبیرہ میں شمار کیا گیا ہے اور خدائے متعال اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے:

(وَمَن یوّلهم یومئذ دبره الامتّحر فا لقتال اومتّحیز االی فئۃفقد باء بغضب من اللہ وماوٰہ جہنم...)

(انفال۱٦)

اور جوآج کے دن پیٹھ دکھائیگا وہ غضب الہیٰ کا حقدار ہوگا اوراس کا ٹھکانا جہنم ہوگا علاوہ ان لوگوں کے جو جنگی حکمت عملی کی بنا پر پیچھے ہٹ جائیں یا کسی دوسرے گروہ کی پناہ لینے کے لئے اپنی جگہ چھوڑ دیں۔

وطن کا دفاع

مذکورہ بیانات کے پیش نظر اسلامی معاشرہ اور مسلمانوں کے گھر بار کا دفاع اہم ترین واجبات میں سے ہے۔ خدائے متعال فرماتا ہے:

(ولاتقولوالمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاءولکن لاتشعرون) (بقرہ۱۵٤)

اور جولوگ راہ خدا میں قتل ہوجاتے ہیں انھیں مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تمھیں ان کی زندگی کا شعور نہیں ہے

اسلام کی ابتداء میں جان ہتھیلی پر لے کر خونین جنگوں میں شرکت کرنے والے مجاہدوں اوراپنے پاک خون میں غلطاں ہونے والے شہیدوں کے بارے میں انتہائی حیرت انگیز اورعبرتناک داستانیں موجود ہیں ، یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے اپنے پاک خون اورٹکرے ٹکڑے ہوئے بدن سے اس دین مقدس اسلام کو مستحکم بنایا ہے۔

حق کا دفاع

ایک دوسرا دفاع جو آب وخاک کے دفاع سے عمیق تر اور وسیع تر ہوتا ہے، وہ حق کا دفاع ہے ۔یہ دین اسلام کا تنہا مقصد ہے۔اس خدائی روش کا بنیادی مقصد حق وحقیقت کو زندہ کرنا ہے ،اسی لئے اس دین پاک کو دین حق کہا گیا ہے۔یعنی وہ دین جو حق کی طرف سے ہے،حق کے سوا کچھ نہیں ہے اور حق کے علاوہ کسی چیز کو اپنا مقصد قرار نہیں دیتا ہے۔

خدائے متعال اپنی کتاب کی توصیف میں، جو تمام حقائق کی جامع کتاب ہے فرماتا ہے:

(...یھدی الی الحق والی طریق مستقیم) (احقاف۳۰)

...قرآن مجید راہنمائی کرتا ہے حق کی طرف اور سیدھے راستہ کی طرف جس میں کسی قسم کا تناقض اور تضاد نہیں پایا جاسکتا ہے

اسلئے ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ حق کی پیروی کرے اور حق بات کہے حق سنے اور اپنی تمام توانائیوں اور ہر ممکن راہ سے حق کا دفاع کرے۔

غیظ وغضب

غیظ وغضب ایک ایسی حالت ہے کہ اگر انسان میں پیدا ہوجائے تو اسے انتقام کی فکر میں ڈالتی ہے اور اس کے باطنی آرام کو انتقام لینے کی صورت میں ظاہر کرتی ہے۔ اگر انسان اس حالت میں اپنے نفس کو قابو میں رکھنے کے سلسلہ میں تھوڑی سی سستی اور کوتاہی کرے تو بلافاصلہ اس کی عقل سلیم غیظ وغضب کے سامنے ہتھیار ڈال دیتی ہے اور ہر برائی اور ناروا و ناشائستہ چیز اسے صحیح نظر آتی ہے اور وہ اس حد تک پہنچتا ہے کہ انتقامی جذبہ کی وجہ سے ہر درندہ سے بڑا درندہ واور ہر آگ سے زیادہ شعلہ ور ہوتا ہے۔

اسلام میں انتقام لینے کے سیلاب کو روکنے کے لئے بہت ہی تاکید ہوئی ہے اور اس کی پیروی کرنے کی زبردست مذمت کی گئی ہے۔ خدائے متعال ان لوگوں پر بہت عنایت کرتا ہے اور انھیں عفو کرتا ہے جو اپنے غیظ وغضب پر قابو پاتے ہیں اور غصہ کی حالت میں بردباری سے

کام لیتے ہیں۔فرماتا ہے:

(...والکاظمین الغیظ و العافین عن النّاس)(آل عمران/۱۳۴)

...اورغصہ کو پی جاتے ہیں اورلوگوں کومعاف کرنے والے ہیں۔

(...و اذاما غضبوا ھم یغفرون) (شوری/۳۷)

...اورجب غصہ آتا ہےتو معاف کرتے ہیں۔

کام کا واجب ہونا اور صنعت وحرفت کی اہمیت

کام اورسرگرمی ،وہ بنیادیں ہیں،جن پر نظام خلقت استوار ہے اور یہ ہرمخلوق کی بقاء کے ضامن ہیں۔خدائے متعال نے اپنی مخلوقات میں سے ہرایک کواس کے حالات کے مطابق کچھ وسائل سے مسلح کیا ہے کہ ان سے استفادہ کرنے پر وہ منافع کو حاصل کرتا ہے اور نقصانات سے بچتا ہے۔

انسان خدا کی مخلوقات میں حیرت انگیز ترین اور پیچیدہ ترین مخلوق ہے، دوسری مخلوقات کی نسبت اس کی حاجتیں زیادہ ہیں اورلہذا زیادہ سرگرمی کی ضرورت ہے تا کہ اس کے ذریعہ، اپنی بے شمارضرورتوں کو پورا کر سکے اوراپنے خاندانی نظام جسے فطرتاً تشکیل دینا چاہئے کوبھی برقرارکرسکے۔

اسلام چونکہ ایک فطری اوراجتماعی دین ہے،لہذا اس نے کاروکسب کوواجب قراردیا ہےاور بیکارانسانوں کی اہمیت کا قائل نہیں ہے۔

اسلام میں، ہر فرد کو اپنے سلیقہ اور شوق کے مطابق صنعت وحرفت جس کی طرف خدائے متعال نے انسانی فکر کی ہدایت کی ہے ان میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنا چاہئے اور اس طریقہ سے اپنی روزی کمائے اور معاشرے کی ذمہ داریوں میں سے کسی ایک کو اپنے ذمہ لے لے اور لوگوں کی آسودگی کے بارے میں کوشش کرے۔ خدائے متعال فرماتا ہے:

(واَن لیس للانسان اِلاّ ماسعی)(نجم ۳۹)

اور یہ کہ انسان کے لئے کوئی فائدہ نہیں ہے، مگر یہ کہ سعی وکوشش کرے۔

بیکاری کے نقصانات

مذکورہ بیانات سے واضح ہوا کہ کاروکوشش ایک راستہ ہے جسے خالق کائنات نے انسان کے اختیار میں قرار دیا ہے تا کہ اسے طے کر کے اپنی زندگی کی سعادت کو پا سکے، البتہ خلقت و فطرت کی راہ سے انحراف چاہے کم ہی کیوں نہ ہو انسان کے لئے نقصان کے علاوہ کوئی فائدہ نہیں دیتا۔ اس صورت میں جس چیز پر نظام زندگی استوار ہے، اس سے انحراف کرنے میں دنیا وآخرت کی بدبختی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

اسی لئے ساتویں امام حضرت موسی بن جعفر علیہ السلام فرماتے ہیں:

کام میں سستی اور تھکاوٹ کا اظہار نہ کرنا ورنہ دنیا وآخرت تیرے ہاتھ سے چلی جائیگی۔(۱)

....

۱۔تحف العقول، ص ٤٠٩۔

خوداعتمادی

عقائد کے باب میں بار ہا یاد دہانی کرائی گئی کہ اسلام کا عام پروگرام یہ ہے کہ انسان خدائے یکتا کے علاوہ کسی کی پرستش نہ کرے اور خالق کائنات کے علاوہ کسی کے سامنے سر تعظیم خم نہ کرے۔

سب خدا کی مخلوق اور اس کی پرورش یافتہ ہیں اور اس کا رزق کھاتے ہیں اور کسی کو کسی پر فضیلت کا حق نہیں ہے، سوائے اس چیز کے جو خدا کی طرف پلٹے۔

ہر مسلمان کو اپنے نفس پر اعتماد کرنا چاہئے اور جو آزادی خدا نے اسے دی ہے اس سے استفادہ کرے، اور جو وسائل اسے فراہم کئے ہیں ان سے بھر پورا فائدہ اٹھائے اور زندگی کی راہ کو طے کرے، نہ یہ کہ دوسروں پر امید باندھ کر ہر روز خدا کے لئے ایک شریک ٹھہرائے اور ایک تازہ بت بنائے۔

نوکر کو جاننا چاہئے کہ وہ اپنی روٹی کھاتا ہے نہ مالک کی۔ مزدور کو جاننا چاہئے کہ وہ اپنی کمائی کی اجرت حاصل کرتا ہے نہ صاحب کار کی مفت میں دی گئی بخشش. ہر ملازم کو ایمان رکھنا چاہئے کہ وہ اپنے کام کی مزدوری حاصل کرتا ہے نہ رئیس یا حکومت مربوطہ ادارہ یا معاشرے کا تحفہ۔

آخرکار آزاد انسان کو خدا کے علاوہ کسی سے امید نہیں باندھنی چاہئے اور کسی کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرنا چاہئے ورنہ اس کے باطن میں وہی پستی اور شرک کی غلامی پیدا ہو جائے گی جس

کے آشکارا طور پر بت پرست شکار ہیں۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے، بیکاری کی عادت کرنے والوں اور اپنا بوجھ دوسروں پر ڈالنے والوں پر لعنت بھیجی ہے۔

دور حاضر میں اجتماعی اور نفسیاتی تحقیقات سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعی برائیوں کا ایک بڑا حصہ بیکاری کی وجہ سے ہے۔ یہی بیکاری ہے جو معاشرے کے اقتصاد اور ثقافت کے پہیے کو چلنے سے روکتی ہے اور ہر قسم کے اخلاقی زوال اور خرافات پرستی کو رواج بخشتی ہے۔

کھیتی باڑی اور اس کے فائدے

کھیتی باڑی جس کے ذریعہ معاشرے کے لئے اناج مہیا کئے جاتے ہیں اپنی اہمیت کے پیش نظر انسان کے پسندیدہ ترین مشغلوں میں شمار ہوتی ہے، اسی لئے اسلام میں اس شغل کو اختیار کرنے کی بہت تاکید کی گئی ہے۔

چھٹے امام، حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

قیامت کے دن کاشت کاروں کا مقام ہر مقام سے بلند تر ہوگا۔(۱)

پانچویں امام حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

کوئی بھی کام کھیتی باڑی سے بہتر اور اس کا فائدہ اس سے زیادہ عمومی نہں ہے۔ کیونکہ نیک وبد، چرندو پرند سب اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور زبان حال سے کسان کے لئے دعا کرتے

ہیں۔(۲)

....

۱۔میزان الحکمۃ،ج٤ ص۲۱۳۔

۲۔میزان الحکمۃ ج٤ ص۲۱۳۔

دوسروں کے سہارے زندگی گزارنے کے نقصانات

طفیلی زندگی یعنی دوسروں کی امید اور پشت پناہی میں زندگی گزارنا۔حقیقت میں ایسی زندگی،انسانی فخر،شرافت اورآزادی کو کھودینے اور تمام اجتماعی برائیوں اور جرم وگناہ کا باعث ہے کہ جس کا سرچشمہ ذلت وخواری ہے۔

جودوسروں کے سہارے ہوتا ہے اس کی نگاہ لوگوں کی دست کرم پر ہوتی ہے،وہ حقیقت میں اپنے ارادہ وضمیر کواس راہ میں بیچ دیتا ہے،اسے کرم فرما کی چاپلوسی کرنی پڑتی ہے وہ اس سے جوکچھ چاہتا ہے خواہ حق ہو یا باطل اچھا ہو یا بُرا وہ اسے انجام دینے پر مجبور ہوتا ہے۔اور ہر ننگ وعار کوقبول کرنے ،اجنبی پرستی ،ہرظلم وبے انصافی پر راضی ہو جانے اورآخر کار،تمام انسانی قواعد وضوابط کو پامال کرنے پربھی مجبور ہوتا ہے۔

اسلام میں ضرورت کے بغیر سوال کرنا حرام ہے،فقراء کی مالی امداد،جواسلامی ضوابط میں ہے ،صرف ان فقیروں سے مربوط ہے کہ جن کی آمدنی ان کے اخراجات کے لئے کافی نہ ہو یا کوئی

کاروبار نہ ہو۔

ناپ تول میں کمی کی سزا

اسلام کی نظر میں ناپ تول میں کمی کرنا گناہ کبیرہ ہے۔خدائے متعال اس گناہ کے مرتکب افراد کی سرزنش اور مذمت کرتے ہوئے فرماتا ہے:

(ویل للمطفّفین ☆ الا یظنّ اولئک انّھم مبعوثون ☆ لیوم عظیم)(مطفّفین ۱۔۵)

ویل ہے ان کے لئے جو ناپ تول میں کمی کرنے والے ہیں...کیا انھیں یہ خیال نہیں ہے کہ یہ ایک روز دوبارہ اٹھائے جانے والے ہیں؟۔

ناپ تول میں کمی کرنے والا،لوگوں پر ظلم کرنے کے علاوہ،ان کے مال کو چوری کے راستہ سے لوٹتا ہے،لوگوں میں اپنے اعتماد کو کھودیتا ہے اور رفتہ رفتہ اپنے گاہکوں اور اس کے بعد اپنے مال سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

ظلم وستم کی برائی

خدائے متعال نے اپنے کلام پاک میں سیکڑوں بار ظلم کا ذکر کیا ہے اور اس بری صفت جو درندوں کی خصلت ہے کی مذمت کی ہے(قرآن مجید کے دو تہائی سوروں میں،جو مجموعاً ۱۱٤ سورے ہیں،ظلم کا ذکر کیا گیا ہے)

ایسا کوئی انسان پایا نہیں جاسکتا کہ جس نے اپنی فطرت سے ظلم کی برائی کو درک نہ کیا ہو،یا کم

ازکم یہ نہ جانتا ہو کہ ظلم وستم نے انسانی معاشرے کے پیکر پر کتنی دردناک مصیبتیں ڈھائی ہیں اور کتنا خون بہایا ہے اور کتنے گھروں کو ویران کیا ہے۔

تجربے سے یقینی طور پر ثابت ہوا ہے کہ ظلم وستم کے محل کتنے ہی مضبوط کیوں نہ ہوں پائدار نہیں ہوتے اور کسی نہ کسی وقت ظالموں کے سروں پر گر کر ڈھیر ہوجاتے ہیں۔ خدائے متعال فرماتا ہے:

(...ان اللّٰہ لا یھدی القوم الظّٰلمین) (انعام/۱۴۴)

...خدائے متعال ہرگز ظالموں کی ہدایت نہیں کرتا ہے.

اولیائے دین فرماتے ہیں:

سلطنت اور ملک، کفر سے باقی رہ سکتا ہے، لیکن ظلم وستم سے باقی نہیں رہ سکتا (۱)

مردم آزاری اور شرارت حرام ہے

یہ دو صفتیں ایک دوسرے کے نزدیک ہیں، کیونکہ اذیت پہنچانا، دوسروں کو زبان سے رنج و تکلیف پہنچانا ہے، جیسے گالی دینا اور ایسی بات کہنا جس سے مخاطب رنجیدہ ہوجائے یا ہاتھ سے کوئی ایسا کام انجام دینا جس سے لوگ ناراض ہوجائیں۔ شرارت ایسا کام انجام دینا جو لوگوں کے لئے شر کا باعث ہو۔

بہرحال یہ دو صفتیں انسان کی ان آرزؤں کے مقابلہ میں قرار پائی ہیں، کہ انسان جن تک پہنچنے کے لئے اجتماع کو وجود میں لایا ہے، کہ وہ زندگی کی آرام وآسائش ہے۔

یہاں پر اسلام کا شرع مقدس، معاشرے کی مصلحت کو پہلے درجہ میں قرار دیتا ہے اور مردم آزاری وشرارت کوحرام قرار دیتا ہے، چنانچہ خدائے متعال فرماتا ہے:

(وَالَّذين يُوذون المؤمنين و المومنات بغير ما اكتسبوا فقد احتملوا بهتنا و اثماً مبيناً) (احزاب۵۸)

اور جولوگ صاحبان ایمان مرد یا عورت کو بغیر کچھ کئے دھرے اذیت دیتے ہیں، انہوں نے بڑے بہتان اور کھلے گناہ کا بوجھ اپنے سر پر اٹھا رکھا ہے۔

....

۱۔امالی شیخ مفید،ص۳۱۰ (حواشی میں آیا ہے)۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

جس شخص نے کسی مسلمان کو اذیت پہنچائی، اس نے مجھے اذیت پہنچائی اور میری اذیت خدا کی اذیت ہے، ایسے شخص پر توریت، انجیل اور قرآن مجید میں لعنت کی گئی ہے۔(۱)

چوری

چوری ایک برا اور نامناسب مشغلہ ہے جو معاشرے کی اقتصادی حیثیت کو خطرہ میں ڈالتا ہے۔ بدیہی ہے کہ انسان کی زندگی کے ابتدائی ضروریات میں سے مال وثروت ہے جسے انسان اپنی عمر کی قیمت پر حاصل کرتا ہے اور اس کی حفاظت کے لئے اس کے گرد ایک حفاظتی دیوار بنا دیتا ہے تاکہ ہر قسم کے تجاوز سے محفوظ رہے اور اس طرح اس کا مال معاشرے کی زند

گی کی ضمانت اوراس کا پشت و پناہ بن جائے۔البتہ اس دیوار کو توڑنا اوراس نظم کو ختم کرنا ایک ایسی عمر کے سرمایہ کو تباہ کرنے کے مترادف ہے کہ جس کو حاصل کرنے میں اس کی پوری عمر خرچ ہوئی ہےاور لوگوں کی سرگرمیوں کے ایک بڑے حصہ کو معطل کرنا لوگوں کے ہاتھ کاٹنے کے برابر ہے۔

اسی لئے اسلام نے اس نفرت انگیز عمل کے لئے کہ خود چور کا ضمیر بھی اس کے جرم ہونے کی گواہی دیتا ہے، یہ سزا مقرر کی ہے کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔(یعنی دائیں ہاتھ کی چار انگلیاں کاٹ دی جائیں)خدائے متعال فرماتا ہے:

....

١۔الغدیر،ج١٠،ص٣٦٨۔

(والسّارق والسّارقۃ فاقطعوا ایدیھما جزائً بما کسبا...)

(مائدہ٣٨)

چور مرد اور چور عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ دو کہ یہ ان کے لئے بدلہ اور خدا کی طرف سے ایک سزا ہے...

فرض شناسی

زندگی کے یہ بے شمار وسائل جو آج کل ہم انسانوں کے اختیار میں ہیں اور ہم ان کو حاصل کرنے اور ان سے استفادہ کرنے کے لئے دن رات کوشش کرتے ہیں، ابتداء میں انسان کے اختیار میں نہیں تھے، بلکہ انسان کی سرگرمیوں کے نتیجہ میں تدریجاً وجود میں آئے ہیں اور ان سے استفادہ کیا جارہا ہے۔لیکن بہرصورت ابتدائی بشر سے لیکر آج کے متمدن انسان تک ہرگز کاروکوشش کا سلسلہ نہیں رکا ہے بلکہ انسان نے اپنی خداداد فطرت کے ذریعہ اپنی زندگی کے وسائل فراہم کرنے کی کوشش کی ہے، کیونکہ جس انسان کی وجودی توانائی کی سرگرمی ٹھپ ہو جاتی ہے تو اس کو مسلح کرنے کے داخلی و خارجی وسائل، آنکھ، کان، منہ، ہاتھ، پاؤں، دماغ، دل، پھیپھڑے اور جگر وغیرہ بے کار ہو جائیں گے، اور وہ مردہ کے علاوہ کچھ نہیں ہوگا۔ اسی لئے انسان نہ صرف مجبور ہو کر کام کرتا ہے، بلکہ اس جہت سے بھی کہ وہ انسان ہے لہذا گوناگوں سرگرمیاں انجام دیتا ہے، کیونکہ وہ اپنے انسانی شعور سے درک کرتا ہے کہ جس راہ سے بھی ممکن ہو، وہ اپنی زندگی کی سعادت اور خوشبختی کو حاصل کرے، اس لئے کاروکوشش میں لگ جاتا ہے اور اپنے مطالبات کی راہ میں قدم رکھتا ہے، لہذا انسان جس ماحول اور جس روش پر زندگی گزارتا ہے خواہ: دینی ہو یا غیر دینی، قانونی ہو یا استبدادی اور شہری ہو یا خانہ بدوشی کی، اس میں اپنے لئے کچھ تکالیف وفرائض (وہ کام جن کا زندگی میں انجام دینا لازم جانتا ہے) کا احساس کرتا ہے کہ ان کو انجام دینے میں انسان کی حقیقی آرزوؤں کو پورا کرسکتا ہے

اوراس کے لئے خوشحالی کی اورآسودہ وسعادتمندانہ زندگی فراہم کرسکتا ہے۔

البتہ ان تکالیف اورفرائض، جوسعادتمندی کی تنہاراہ ہے، کی قدروقیمت خودانسانیت کی قدرو قیمت ہے کہ ہم اس سے زیادہ گراں بہا کسی چیز کا تصورنہیں کرسکتے اوراسے کسی دوسری چیز سے بدل نہیں سکتے۔

اس بناپر فرض شناسی اوراسکا انجام دیناعمل کے میدان میں اہم ترین مسئلہ ہے کہ اس کا سروکارانسان کی زندگی سے ہے، کیونکہ اس کی اہمیت خودانسان کی اہمیت ہے، جوشخص اپنے مسلمہ فرائض کوانجام دینے میں پہلوتہی کرتا ہے، یاکبھی کوتاہی کرتا ہے،تو وہ اسی کے مطابق انسانیت کی بلندی سے گرجاتا ہےاورفطری طور پراپنی پستی اوربےقیمتی کااعتراف کرتا ہے یا جوبھی خلاف ورزی کرتاہے، وہ اپنے معاشرے کے پیکر پر بلکہ حقیقت میں اپنے پیکر پرایک کاری ضرب لگاتا ہے۔

خدائے متعال فرماتا ہے:

(والعصر٭انّ الانسٰن لفی خسر٭الا الّذین آمنوا وعملواالصّٰلحت وتواصوا بالحق وتواصوابالصّبر)

(عصر۱۔۳)

قسم ہےعصر کی بیشک انسان خسارہ میں ہے۔ علاوہ ان لوگوں کے جوایمان لائے اورانہوں نے نیک اعمال انجام دئے اورایک دوسرے کوحق اورصبر کی وصیت ونصیحت کی۔

نیزفرماتا ہے:

(ظهر الفساد فی البرّ والبحر بما کسبت ایدی النّاس...)

(روم ۴۱)

لوگوں کے ہاتھوں کی کمائی کی بنا پر فساد خشکی اور تری ہر جگہ غالب آ گیا ہے۔

فریضہ کی تعیین میں مختلف روشوں کا اختلاف

عالم انسانیت میں فریضہ کو پہچاننے اور اس پر عمل کرنے کی اہمیت بذات خود ایک پائدار و مسلم فریضہ ہے اور ہرگز کوئی ایسا انسان نہیں پایا جا سکتا جو اپنی انسانی فطرت سے اس حقیقت کا منکر ہو۔

جی ہاں، چونکہ انسانی فرائض انسان کی زندگی کی سعادت سے مکمل رابطہ رکھتے ہیں اور دین انسانی زندگی کے بارے میں غیر دینی طریقوں سے نظریاتی اختلاف رکھتا ہے لہذا دینی فرائض، دوسرے فرائض کی روشوں سے اختلاف رکھیں گے۔

دین کا عقیدہ ہے کہ انسان کی زندگی ایک لامحدود اور ابدی ہے، جو موت سے ختم نہیں ہوتی اور موت کے بعد اس ابدی زندگی کا سرمایہ وہی صحیح عقائد، پسندیدہ اخلاق اور اعمال صالحہ ہیں جنھیں انسان نے دنیا میں حاصل کیا ہے۔

اس لحاظ سے دین نے جو فرائض اور تکالیف فرد اور معاشرہ کے لئے مرتب کئے ہیں، ان میں اس ابدی دنیا کی زندگی کو بھی مدنظر رکھا ہے۔

دین اپنے قوانین کو خدا شناسی اور خدا کی عبادت و بندگی کی روشنی میں مقرر کرتا ہے جس کا واضح

اثر موت کے بعد قیامت کے دن ظاہر ہوگا۔

غیر دینی طریقے (جوبھی ہوں) صرف اس دنیا کی چند روزہ زندگی کو مدنظر رکھتے ہیں اور انسان کے لئے کچھ فرائض وضع کرتے ہیں تاکہ ان کے ذریعہ مادی زندگی اورجسمانی قوای جوتمام حیوانوں میں مشترک ہیں سے بہتر استفادہ کریں۔حقیقت میں یہ طریقے ایک حیوانی زندگی کوانسان کے لئے مرتب کرتے ہیں کہ جس کی منطق کا سرچشمہ چرندوں اور درندوں کے جذبات ہوتے ہیں اور انسان کی حقیقت پسندی اوراس کی معنویات سے بھری ابدی زندگی کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے۔

یہی وجہ ہے کہ انسانیت کے بلند اخلاق (جیسا کہ قطعی تجربہ بات سے ثابت ہے) غیر دینی معاشروں سے رفتہ رفتہ ختم ہورہے ہیں اور روز بروز ان کا اخلاقی انحطاط واضح وآشکارتر ہوتا جارہا ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں: دین کی بنیاد، تقلید پر ہے، یعنی چون و چرا کے بغیر فرائض اورقوانین کے ایک سلسلہ کوقبول کرنا،لیکن اجتماعی طریقے وقت کی منطق کے ساتھ قابل مطابقت ہیں۔

جنہوں نے یہ بات کہی ہے، انہوں نے اس نکتہ سے غفلت کی ہے کہ جوقوانین وضوابط معاشرے میں نافذ ہوتے ہیں،ان کو بلا چون وچرا نافذ ہونا چاہئے۔

ہرگز یہ نہ دیکھا گیا ہےاور نہ ہی سنا گیا ہے کہ کسی ملک میں لوگ ملک میں لاگوقوانین پر مناظرہ اور بحث وگفتگو کے بعدان پرعمل کرتے ہوں اور جوبھی ان قوانین کے فلسفہ کونہ سمجھ سکا وہ اس پرعمل کرنے سے معاف ہواوران کوقبول کرنے میں مختار ہو،اس سلسلہ میں دینی اورغیر دینی

روش میں کوئی فرق نہیں ہے۔

لیکن کسی ملک کے فطری اور اجتماعی حالات کا مطالعہ اور اس کی عام روش میں جستجو کر کے اس ملک کے قوانین کے کلیات کی حکمت کے کچھ جز ئیات معلوم کئے جا سکتے ہیں۔

دینی قوانین میں بھی یہی خاصیت پائی جاتی ہے۔حقیقت پسندانہ راہ سے اور خلقت اور انسان کی فطری ضرورتوں کے بارے میں جستجو کر کے دین کے قوانین کے کلیات جو فطری روش ہے کے بارے میں بعض جز ئیات کو معلوم کیا جا سکتا ہے۔

قرآن مجید اور بہت سی روایتیں انسان کو سوچنے ،غور وفکر اور تدبر کی دعوت دیتی ہیں اور بعض احکام میں اجمالی مصلحت کے بارے میں حکم یا اشارہ کیا جا تا ہے، چنانچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیت اطہار علیہم السلام سے احکام کے فلسفہ کے بارے میں بہت سی روایتیں نقل ہوئی ہیں اور درست ہیں۔

دفاع کی اہمیت

جس طرح ایک انسان اپنی زندگی میں خوشبختی اور سعادت کا شیدائی ہوتا ہے اور ان کو حاصل کرنے میں سرگرم عمل ہوتا ہے، اسی طرح وہ ہر طرف سے بے شمار خطرات سے بھی دو چار ہوتا ہے۔ان میں سے بعض خطرے اس کے اصل وجود کو اور بعض اس کی زندگی کی سعادت وخوشبختی کو نشانہ بناتے ہیں،اس لئے انسان ان کو دور کرنے کے لئے مقابلہ اور دفاع کرنے پر مجبور ہے۔

انسان کی خلقت میں بھی ان ہی دو مرحلوں جذب و دفع کی پیشنگوئی کی گئی ہے، اور اس کے وجود کی عمارت میں مناسب وسائل استعمال ہوئے ہیں۔ اسی طرح معاشرہ کے کچھ فوائد ہیں کہ جنھیں حاصل کرنا چاہئے اور بعض خطرات سے بھی دو چار ہے کہ بہر حال ان کے مقابلہ میں کھڑے ہوکر اپنی زندگی کے مقدسات کا دفاع کرنا چاہئے۔

جس نے لوگوں کی جانوں کو ختم کرنے، آزادی کے پرچم کو سرنگوں کرنے یا ان کی آزادی کو ختم کرنے کو اپنا مقصد قرار دیا ہے، وہ معاشرے کا دشمن ہے۔ انسان کا فقر و ایمان کی کمزوری اور نادانی معاشرے کے دشمن ہیں، جو اپنے معاشرے، یعنی زندگی کی سعادت اور انسانی حقیقت کا پابند ہے، اسے اپنے ان خطرناک دشمنوں کے مقابلہ میں دفاع کرنا چاہئے۔

بخش دین

اس میں کوئی شک وشبہہ نہیں ہے کہ انسان کے ضمیر میں، اصل زندگی اور شرافت مندانہ زندگی کی ایک ہی بنیاد ہے اور جو زندگی شرافت کے ساتھ ہو لیکن انسان کی سعادت اس میں نہ ہو، تو وہ حقیقت میں زندگی نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی موت ہے جو طبیعی موت سے تلخ و ناگوار ہے، جو انسان اپنی شرافت و سعادت کی اہمیت کا قائل ہے، اسے اس پست زندگی سے موت کی طرح فرار کرنا چاہئے۔

انسان جس ماحول میں بھی رہ رہا ہو اور جس روش کی طرف بھی مائل ہو، وہ اپنی خداداد فطرت سے سمجھتا ہے کہ محترم و مقدس میں موت، بذات خود ایک سعادت ہے، دین کی منطق میں یہ

مسئلہ دوسری ہر منطق سے زیادہ واضح اوروہم وگمان کے خرافات سے نہایت دور ہے، جو شخص دین کے حکم سے اپنے دینی معاشرے کا دفاع کرتے ہوئے اپنی جان نچھاور کردے، وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ کسی چیز سے محروم نہیں ہوا ہے بلکہ اس نے اپنی چندروزہ زندگی کوخدا کی راہ میں پیش کر کے ایک نہایت شیرین، گراں بہا اور ابدی زندگی کو حاصل کیا ہے اور یقیناً اس کی سعادت نا قابل زوال ہے۔ چنانچہ خدائے متعال اپنے کلام میں فرماتا ہے:

(ولا تحسبن الّذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتاً بل احیاء عند ربّھم یرزقون)

(آل عمران ۱۶۹)

اورخبر دار راہ خدا میں قتل ہونے والوں کو مردہ خیال نہ کرنا وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے یہاں رزق پا رہے ہیں

لیکن غیر دینی طریقے، جوانسان کی زندگی کو اسی دنیا کی چندروزہ زندگی تک محدود جانتے ہیں، ہرگز نہیں کہہ سکتیں کہ انسان مرنے کے بعد بھی زندہ ہوتا ہے یا سعادت وخوشبختی حاصل کرتا ہے، مگر یہ کہ وہم وگمان اور خرافات سے سمجھ میں آجائے کہ جو وطن یا قومی مقدسات کی راہ میں قتل ہو جاتا ہے، اس کا نام جاں نثاروں اور قوم کے فداکاروں کی فہرست میں قرار پاسکتا ہے اور تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھا جاسکتا ہے اور ہمیشہ کے لئے زندہ وجاوید رہ سکتا ہے۔

لیکن جوتمجید اور تعظیم اسلام میں خدا کی راہ میں شہید ہونے اور قتل کئے جانے کے سلسلے میں کی گئی ہے، وہ کسی اور صالح عمل کے لئے نہیں کی گئی ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

فرماتے ہیں:

ہر نیکی سے بالاتر ایک نیکی ہے یہاں تک کہ راہ خدا میں شہید ہو جائے، اس کے بعد کوئی نیکی نہیں ہے۔(۱)

صدر اسلام کے مسلمان پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے استغفار کی درخواست کرتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا کے نتیجہ میں شہادت کے اعلی درجہ پر فائز ہوتے تھے اور شہادت کے ذریعہ دنیا سے چلے جانیوالوں کے لئے گریہ نہیں کرتے تھے، کیونکہ وہ زندہ ہیں اور نہیں مرے ہیں۔

مال کی زکوۃ

مال سے انسان کی زندگی میں جو اعتدال پیدا ہوتا ہے، وہ محتاج بیان نہیں ہے۔اسکی اہمیت کا عالم یہ ہے کہ بہت سے لوگ زندگی مال کو ہی جانتے ہیں اور انسان کے لئے مال و دولت کے علاوہ کسی فضیلت و شرافت کے قائل نہیں ہیں ۔اور اپنی تمام سرگرمیوں کو پیسے جمع کرنے اور مال ذخیرہ کرنے میں صرف کرتے ہیں اور نتیجہ میں مال سے یہی دلبستگی اور حرص ان کو بخل کی صفت میں مبتلا کر دیتی ہے کہ جس کی بنا پر وہ دوسروں کو ان کے حق سے محروم کرتے ہیں اور کبھی اس سے بلندتر قدم اٹھا کر پستی اور بخل کے سامنے تسلیم ہو کر خود

....

۱۔میزان الحکمۃ ج۱،ص۴۰۰۔

بھی اس مال سے بہرہ مند ہونے سے محروم ہوجاتے ہیں،اس طرح نہ خود کھاتے ہیں اور نہ دوسروں کوکھلاتے ہیں اورصرف پیسے جمع کرنے میں لذت محسوس کرتے ہیں۔

جوافراد بخل کی ناپسندیدہ صفت میں مبتلا ہیں (البتہ کنجوسی میں مبتلا ہونے والے ان لوگوں سے پست ہیں)وہ انسانی فطرت سے گرجاتے ہیں اورزندگی کے بازار میں دیوالیہ ہوتے ہیں، کیونکہ:

۱۔زندگی میں،صرف اپنی سعادت،خوشبختی اورآسودگی کو چاہتے ہیں اورانفرادی زندگی کے قائل ہوتے ہیں،جبکہ انسان کی فطرت نے اجتماعی زندگی کو ہمارے لئے زندگی کے عنوان سے پہنچوایا ہےاورانفرادی زندگی جس راہ سے بھی ہو،اس کاانجام ناکامی ہے۔

۲۔اپنی قدرت کا دوسروں کے سامنے مظاہرہ کرکے محتاجوں اورناداروں کی خاطر وتواضع کو اپنی طرف جذب کرتے ہیں اور باوجودیکہ محتاجوں کی کوئی مدد نہیں کرتے لیکن پھر بھی ان سے ہمیشہ اپنی تعظیم کرانا چاہتے ہیں،ان کے ساتھ غلاموں کا سلوک کرتے ہیں اور بت پرستی کا جذبہ زندہ رکھتے ہیں جس کے نتیجہ میں معاشرے سے ہرقسم کی شہامت،شجاعت،فطرت کی بلندی اورانسانی فخرومباہات ختم ہوجاتے ہیں۔

۳۔اس کے علاوہ کہ وہ خود پاک جذبات،محبت،مودت،انسان دوستی،خیرخواہی اورانسانی ہمدردی کو پامال کرتے ہیں،معاشرے میں جرم وخیانت اور ہرقسم کی پستی ورذالت کوترویج دیتے ہیں، کیونکہ جرم وجفا،جیسے:بدگوئی،بےحیائی،چوری،ڈاکہ زنی اورآدم کشی کا قوی ترین طبیعی عامل محتاجوں کے طبقہ میں موجودفقروفاقہ غیظ وغضب اورکینہ وہ انتقامی جذبہ ہے

جو مالداروں کے بارے میں ناداروں اور بیچاروں کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے، کہ اس کے بخیل اور کنجوس مال دار اس کے باعث ہوتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ معاشرے میں بخیل شخص درحقیقت معاشرہ کا سب سے بڑا دشمن ہوتا ہے، بہرحال وہ خدا کے غضب وسخت سزااور لوگوں کی نفرت میں گرفتار ہوگا۔

قرآن مجید میں بخل اور کنجوسی کی ناپسند صفتوں کی مذمت اور سرزنش میں اور اس کے برعکس جود وسخاوت، اور خدا کی راہ میں انفاق اور ناداروں و بے چاروں کی دستگیری کرنے والوں کی مدح وثناء میں بہت سی آیتیں نازل ہوئی ہیں۔

خدائے متعال اپنے کلام پاک میں وعدہ کیا ہے کہ، جو مال انفاق کیا جاتا ہے، اس کے عوض دس اور بعض مواقع میں ستّر بلکہ سات سو سے بیش تر تک اضافہ کر کے انفاق کرنے والے کو واپس بھیجا جاتا ہے۔

تجربہ سے بھی ثابت ہوا ہے کہ سخی لوگ جب جوانمردی کے ساتھ حاجتمندوں کی مدد کرتے ہیں اور انسانی معاشرے کی مشکلات کو دور کرتے ہیں تو روز بہ روز ان کی دولت اور نعمتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔

کار گرہ گشا نشود در زمانہ بند
ہرگرکسی ندید در انگشت شانہ بند

اگر لوگ کسی دن مشکلات سے دوچار ہو جائیں تو تمام دل ان کے ساتھ ہوں گے، انہوں نے

جو دوسروں کے حق میں مدد کی ہے وہ اجتماعی صورت میں ان کے حق میں لوٹے گی ۔ اوراس کے علاوہ انہوں نے اپنے اچھے کردار سے ایک شریف انسان کے مانند اپنے ضمیر کو آرام بخشا ہے، واجب اور مستحب حقوق کے بارے میں ندائے آسمانی کو لبیک کہا ہے اور انسانیت کے پاک جذبات سے مہربانی ،شفقت، انسان دوستی اور خیر خواہی سے استفادہ کیا ہے، اس طرح عام محبوبیت اور خالص احترام کے مستحق ہوئے اور آخر کار خدا کی خوشنودی اور ابدی سعادت کو کم ترین قیمت پر خرید لیا۔

علم کی زکوۃ

علم اور ثقافت بے نظیر دولت ہے، جن سے انسان اپنی زندگی میں ہرگز بے نیاز نہیں ہوتا ہے اور ایسا انسان نہیں پایا جا سکتا، جو اپنی انسانی فطرت سے جہل پر علم کی برتری کو درک نہ کرتا ہو یا علماء اور دانشوروں کے احترام میں ان کے حق میں فیصلہ نہ دیتا ہو۔

خدائے متعال اپنے کلام پاک میں عالم و جاہل میں فرق کے بارے میں زندہ و مردہ اور بینا و اور نابینا کی مثال دیتا ہے۔ اور اسلام میں علم و دانش کو جو اہمیت دی گئی ہے، وہ اہمیت کسی اور دین میں نہیں پائی جاتی، یہاں تک کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے (۱)

نیز فرماتے ہیں:

گہوارہ سے قبر تک علم حاصل کرو چاہے دنیا کے اس پار بھی ہو۔ (۲)

اسی کے پیش نظر اسلام نے بخل اور کنجوسی کی نہی کی ہے۔علم کو چھپانے کی مذمت کی ہے، بلکہ دینی علوم کو چھپانا حرام قرار دیا ہے اور عالم کو جاہل کی تربیت کرنے کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔

....

۱۔اصول کافی، ج۱،ص۳۰، ح۱۔

۲۔نہج الفصاحہ،ص۶۴، ج۳۲۶،۳۲۷۔

معاشرے کے اندرونی دشمنوں سے مقابلہ

چنانچہ،فطرت کے حکم سے،معاشرے کے بیرونی دشمنوں سے جنگ کرنی چاہئے اور معاشرہ کو نقصان سے بچانا چائے اور، اسی طرح معاشرے کے اندرونی دشمنوں سے بھی جنگ او رمقابلہ کرنا چاہئے۔ معاشرے کا اندرونی دشمن وہ ہے جو عام روش او رجاری قوانین کی مخالفت کرتا ہے اوراس طرح معاشرے کی زندگی کے ناطے کوتوڑ دیتا ہے اور جاری نظام کو درہم و برہم کر دیتا ہے، اس لئے نظم ونسق ،امور کی حفاظت اور معاشرے میں امن و امان برقرار رکھنے کے لئے کچھ افراد پر مشتمل پلیس وغیرہ کا نظام تشکیل دیا جاتا ہے اورخلاف ورزی کرنے والوں کے لئے مختلف سزائیں مقرر کی جاتی ہیں۔

اسلام نے بھی قوانے نافذہ کے علاوہ، معاشرے کے افراد کے لئے مختلف سزائیں اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کوواجب قرار دیا ہے اوراس طرح مقابلہ کومزید عوامی اور موثر تر بنا دیا ہے۔

اسلام اور معاشرے کی دوسری روشوں کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ دوسری روشیں صرف لوگوں کے افعال و اعمال کی اصلاح کی طرف توجہ کرتی ہیں، لیکن اسلام لوگوں کے افعال کے علاوہ ان کے اخلاق کی طرف بھی توجہ کر کے دونوں مرحلوں میں فساد کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے۔

جن اعمال کو اسلام نے گناہ اور معصیت کے طور پر حرام قرار دیا ہے، وہ ایسے اعمال ہیں جن سے معاشرے میں بُرے اثرات اور منحوس نتائج برآمد ہوتے ہیں، اس توصیف کے پیش نظر ان میں سے بعض اعمال براہ راست مرتکب ہونے والے ایک فرد یا تمام افراد کو برباد کر دیتے ہیں کہ جس کی وجہ سے انسان کے کسی عضو میں زخم کے مانند معاشرے میں رخنہ ڈالتا ہے۔ اکثر گناہ جو انسان کی بندگی کی حالت میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں اور الٰہی حقوق کو ضرر پہنچاتے ہیں، ان کی بھی یہی حالت ہے، جیسے نماز نہ پڑھنا اور روزہ نہ رکھنا وغیرہ۔

ان میں سے بعض اعمال اجتماعی زندگی کے لئے بالواسطہ خطرہ بنتے ہیں، معاشرے کے پیکر کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔ ان کی مثال ان بیماریوں کی سی ہے جو براہ راست انسان کی زندگی سے سروکار رکھتی ہیں اور زندگی کے رشتہ کو توڑ دیتی ہیں جیسے جھوٹ بولنا اور تہمت لگانا اسلام کی نظر میں ماں باپ کے حقوق، غیبت اور لوگوں پر تجاوز کا بھی یہی حکم ہے۔

اسلام میں گناہان کبیرہ کی عام سزا

مذکورہ بُرے اعمال، اسلام میں گناہان کبیرہ کہے جاتے ہیں اور خدائے متعال نے اپنے کلام پاک میں واضح طور پر ان گناہوں کے مرتکب لوگوں کے لئے عذاب کا وعدہ دیا ہے۔

اس کے علاوہ ان میں سے بعض کے بارے میں سخت سزائیں مقرّر کی ہیں۔کلی طور پر ان گناہوں کے مرتکب لوگ (اگر ایک ہی بار بھی انجام دیں) عدل وانصاف کا خاتمہ کرتے ہیں،یعنی معاشرے کے ایک صالح عضو سے اس کی شرافت کو سلب کرتے ہیں۔

جوشخص گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے وہ اپنی عدالت کو کھودیتا ہے اور وہ ان اختیارات سے بہرہ مند نہیں ہوسکتا، جن سے معاشرے کا ایک صالح عضو بہرہ مند ہوتا ہے۔ وہ اسلامی حکومت میں کوئی ذمہ داری نہیں سنبھال سکتا، خلافت کے عہدہ پر فائز نہیں ہوسکتا، امام جماعت نہیں بن سکتا، اور کسی کے حق میں یا مخالفت میں اس کی گواہی قابل قبول نہیں ہے اور وہ اسی حالت میں رہے گا جب تک کہ توبہ نہ کرلے اور مسلسل تقوی و پرہیزگاری سے دوبارہ عدالت کی صفت کا مالک بن جائے۔

احکام کے بارے میں چند سبق

اجتہاد اور تقلید

انسان کی زندگی میں پائی جانے والی حاجتیں اوران کو پورا کرنے کے لئے ان کی سرگرمیاں،اتنی زیادہ ہیں کہ ایک معمولی انسان ان کو گننے اورشمار کرنے کی طاقت نہیں رکھتا،ان سب کے بارے میں اورمہارت حاصل کرکے کافی مقدار میں معلومات حاصل کرنے کی بات ہی نہیں!

دوسرے یہ کہ انسان اپنے کام کوفکروارادہ سے انجام دیتاہےاور جہاں پراسے کوئی فیصلہ کرنا ہو،تو اس کے بارے میں اس کے پاس کافی معلومات ہونا چاہیئے ورنہ وہ کوئی فیصلہ نہیں کرسکتااس کواپنے انجام دینے والے کاموں میں خود ماہرہونا چاہیئے یاکسی ماہرسے پوچھے اوراس کے حکم کے مطابق اس کام کوانجام دے۔ چنانچہ فطری طور پرہم مریضوں کاعلاج کرنے کے لئے طبیب سے،مکان کانقشہ بنانے کے سلسلہ میں انجینئر سے،معماری میں معمار سے رجوع کرتے ہیں اوردروازے اورکھڑکیاں بنانے میں نجّار پراعتماد کرتے ہیں۔

پس ہم ہمیشہ بہت کم کاموں کےعلاوہ اپنے دوسرے تمام مسائل میں تقلید کرتے ہیں۔جو یہ کہتاہے کہ: میں اپنی زندگی میں تقلید کے سامنے ہتھیارنہیں ڈالتا ہوں وہ شخص یااپنی بات کے معنی کونہیں سمجھاہے یاایک فکری آفت میں مبتلا ہواہے۔

چونکہ اسلام نے اپنی شریعت کی بنیادانسانی فطرت پرڈالی ہے،لہذااسی روش کاانتخاب

کیاہے۔اسلام نے اپنے پیروؤں کوحکم دیا ہے کہ دینی معارف اوراحکام کوسیکھیں ان معارف کا سر چشمہ کتاب خدااور پیغمبراکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وآئمہ ھدی علیہم السلام کی سنت کے علاوہ کوئی اور چیزنہیں ہے۔

بدیہی ہے کہ تمام دینی معارف کو کتاب وسنت سے حاصل کرنا، ہرایک کے بس کی بات نہیں ہےاور یہ کام مسلمانوں کے ایک خاص گروہ کے علاوہ تمام مسلمانوں کے لئےممکن نہیں ہے۔

اس لئے خود بخود دین کاحکم اس صورت میں نکلتا ہے کہ مسلمانوں میں سے وہ لوگ جودینی معارف واحکام کواستدلال کی راہ سے حاصل نہیں کرسکتے،انھیں ان لوگوں کی طرف رجوع کرنا چاہئے جودینی احکام کودلیل سے حاصل کرچکے ہوں اوراسطرح اپنے فریضہ پرعمل کریں۔

جوعالم دینی احکام کواستدلال کی راہ سے حاصل کرتا ہے،اس کومجتہد اوراس کے کام کواجتہاد کہا جاتاہےاور جومجتہد کی طرف رجوع کرتاہےاس کو مقلد اوراس کےاس کام کوتقلید کہتے ہیں۔

البتہ اس نکتہ کوجاننا چاہئے کہ تقلید،عبادت،معاملات اور دین کے دوسرے عملی احکام میں جائز ہے لیکن اصول دین میں،جواعتقادی مسئلہ ہے،کسی صورت میں کسی کی تقلیدنہیں کی جاسکتی ہے۔کیونکہ اصول دین میں ایمان وعقیدہ ضروری ہے نہ عمل،اس لئے دوسروں کے ایمان کواپناایمان فرض نہیں کیاجاسکتاہے،یعنی یہ نہیں کہاجاسکتاہے کہ خداایک ہےاس دلیل پرکہ ہمارے والدین یاعالم ایسا کہتے ہیں۔یامرنے کے بعدزندگی حق ہے،کیونکہ تمام مسلمان اس کاعقیدہ رکھتے ہیں۔

اس لئے ہرمسلمان پرواجب ہے کہ اپنے اصول دین کودلیل کی راہ سے جانے اگرچہ سادہ طریقہ سے ہی ہو۔

نجاسات

نجاسات(نجس چیزیں)چند چیزیں ہیں:

۱و۲: پیشاپ اور پاخانہ۔(۱)

اس حرام گوشت حیوان کا پیشاب اور پاخانہ نجس ہے جو خون جہندہ رکھتا ہو یعنی وہ حیوان جس کی رگ کاٹنے پر خون اچھل کر نکلے ،جیسے: بلی ،لومڑی ،خرگوش وغیرہ ، بلکہ اگر مرغی یا کوئی دوسرا حیوان ، جو نجاست کھانے کی وجہ سے حرام گوشت بن چکا ہو، تو اس کا بھی پیشاب و پاخانہ نجس ہے۔

۳۔خون جہندہ رکھنے والے حیوانوں کا مردار،خواہ حلال گوشت ہوں یا حرام گوشت،لیکن حرام گوشت حیوان کے بعض اجزاء جیسے،اون،بال اور ناخن جو جان نہیں رکھتے ہیں پاک ہیں۔

٤۔خون جہندہ رکھنے والے حیوانوں کا خون،خواہ حلال گوشت ہوں یا حرام گوشت۔

....

۱۔پیشاب نکلنے کی جگہ صرف پانی سے پاک ہوتی ہے اور پاخانہ نکلنے کی جگہ کو پانی سے دھو یا جاسکتا ہے یا پتھر یا اسکے مانند تین ٹکڑوں سے پاک کیا جاسکتا ہے ۔البتہ یہ اس صورت میں ہے کہ پاخانہ اپنی جگہ سے باہر نہ پھیلا ہو ورنہ پانی کے بغیر پاک نہیں ہوگا۔ضمناً یاد دہانی کی جاتی ہے کہ اگر پاخانہ تین پتھر سے صاف نہ ہوا تو اس سے زیادہ پتّھر سے پاک کیا جائے۔

۵ و ۶۔ خشکی میں رہنے والے کتے اور سور، ان کے تمام اجزاء یہاں تک کہ ان کے بال بھی نجس ہیں۔

۷۔ شراب اور مست کرنے والی ہر سیال چیز۔

۸۔ آب جو۔

مطہّرات

(پاک کرنے والی چیزیں)

ہر وہ چیز جس سے نجاست پاک کی جاتی ہے، اسے (مطہر) کہتے ہیں اور مطہرات درج ذیل ہیں:

۱۔ پانی،

یہ ہر نجس ہوئی چیز کو پاک کرتا ہے، لیکن یہ اس صورت میں ہے کہ پانی مطلق ہو۔ اسلئے مضاف پانی، جیسے ہندوانہ اور گلاب کے پانی سے نجاست پاک نہیں ہوتی اور ان سے وضوو غسل بھی صحیح نہیں ہے۔(۱)

۲۔ زمین،

یہ جوتے کی تہ اور پاؤں کے تلوے کو پاک کرتی ہے۔

۳۔آفتاب،

یہ نجس زمین اور چٹائی وغیرہ کو اپنی گرمی سے خشک کر کے پاک کرتا ہے۔

٤۔استحالہ،

یعنی نجس چیز اپنی جنس بدل کر ایک پاک چیز کی صورت میں ظاہر ہو جائے۔ جیسے کتّا نمک کی کان میں گر کر نمک میں تبدیل ہو جائے۔

١۔ پانی کی دو قسمیں ہیں : کرُ اور قلیل۔ کرُ پانی: بیس مثقال کم ١٢٨ من تبریزی ہے ، جو تقریباً ٣٨٤ کلوگرام ہوتا ہے اور اگر کوئی نجاست اس سے مل جائے، تو نجس نہیں ہوتا، قلیل پانی: وہ پانی جو کرُ سے کم ہو، اگر اس سے کوئی نجاست مل جائے تو وہ نجس ہو جا تا ہے اور اس کا پاک ہونا اس طرح ہے کہ جاری یا بارش کے پانی سے متصل ہو جائے یا اس پر ایک کرُ کا اضافہ کیا جائے۔

٥۔انتقال،

یعنی انسان کے بدن کا خون یا خون جہندہ رکھنے والے کسی حیوان کا خون ایک ایسے حیوان کے بدن میں منتقل ہو جائے جو خون جہندہ نہ رکھتا ہو۔ جیسے انسان کے بدن کا خون مچھر یا مکھی

وغیرہ کے بدن میں منتقل ہوجائے۔

٦۔عین نجاست کا زائل ہوجانا،

یعنی حیوان کے ظاہراور انسان کے باطن،مثلاً اگرحیوان کی پشت یاانسان کی ناک کے اندر کا حصہ خون آلود ہوجائے،توخون کے زائل ہونے کے بعد پاک ہوجاتا ہےاوراسے پانی سے دھونے کی ضرورت نہیں ہے۔

٧۔تبعیّت،

تبعیت سے مراد یہ ہے کہ ایک نجس چیز دوسری نجس چیز کے پاک ہونے سے پاک ہوجاتی ہے،جیسے کافر کے مسلمان ہونے سے اس کا فرزند باپ کی تبعیت میں پاک ہوجاتا ہے۔

٨۔کم ہونا،

یعنی انگور کا پانی ابالنے سے نجس ہوجاتا ہے،لیکن اگر ابالنے کے ذریعہ دوتہائی پانی بھاپ میں تبدیل ہوکرکم ہوجائے تو باقی پانی پاک ہوجاتا ہے۔

غسل

غسل دوطریقہ سے انجام دیا جاسکتا ہے: (ترتیبی اورارتماسی)
غسل ترتیبی سے مراد یہ ہے کہ سروگردن اوردائیں وبائیں طرف کوترتیب سے دھویا جائے۔
غسل ارتماسی یہ ہے کہ انسان یکبارگی پورے بدن کو پانی میں ڈبودے۔غسل کی دوقسمیں ہیں: واجب اورمستحب۔دین اسلام میں مستحب غسل بہت زیادہ ہیں اورواجب غسل سات ہیں:

۱۔غسل جنابت

۲۔غسل میت

۳۔غسل مس میت،یعنی اگرانسان مردہ کے بدن کوسرد ہونے کے بعداورغسل میت دینے سے پہلے مس کرے،یعنی اپنے بدن کا کوئی حصہ اس کے بدن سے ملائے،تواسے غسل کرنا چاہئے۔

٤۔نذریاعہدکیاہویاقسم کھائی ہوکہ غسل کرے گا۔

٥۔غسل حیض

٦۔غسل نفاس

۷۔غسل استحاضہ

پہلے چارغسل مردوں اورعورتوں میں مشترک ہیں اورآخری تین غسل صرف عورتوں سے مخصوص ہیں۔

شخص مجنب پر جو چیزیں حرام ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔اپنے بدن کے کسی حصہ کو قرآن مجید کے الفاظ، خدا کے نام اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وائمہ اطہار علیہم السلام کے ناموں سے مس کرنا۔

۲۔مسجد الحرام اور مسجد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ میں داخل ہونا۔

۳۔دوسری تمام مساجد میں رُکنا اور کوئی چیز ان میں رکھنا۔

٤۔قرآن مجید کے ان چار سوروں میں سے کسی ایک کی تلاوت کرنا کہ جن پر سجدہ واجب ہے۔یعنی سورہ نجم، اقرائ، الم تنزیل اور حم سجدہ۔

جنابت، حیض، نفاس اور استحاضہ کے تمام احکام کو توضیح المسائل سے حاصل کرنا چاہیئے۔

نوٹ۔غسل میں بھی وضو کی طرح نیت کرنا لازم ہے اور غسل سے پہلے بدن پاک ہونا چاہیئے اور بدن تک پانی پہنچنے میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں ہونی چاہیئے۔

وضو اور اس کے احکام

انسان کے لئے وضو سے پہلے مسواک کرنا اور کلّی کرنا مستحب ہے یعنی پاک پانی منہ میں ڈالے اور کلّی کرے۔اس کے علاوہ استنشاق یعنی ناک میں پانی ڈالنا بھی مستحب ہے۔

وضو کی کیفیت اور اس کے شرائط

وضو میں چہرے کو سر کے بال اگنے کی جگہ سے ٹھوڑی تک اور ہاتھوں کو کہنی سے انگلیوں کے

سرے تک دھونا چاہئے اور سر کے اگلے حصہ پر اور پیروں کے اوپری حصہ پر مسح کرنا چاہئے ۔وضو میں مندرجہ ذیل چیزوں کا خیال رکھنا ضروری ہے:

۱۔وضو کے اعضاء پاک ہوں۔

۲۔وضو کا پانی پاک، مطلق اور مباح ہو۔(۱)

۳۔نیت: یعنی وضو کو رضائے الٰہی کے لئے انجام دینا چاہئے ،لہذا اگر ٹھنڈک حاصل کرنے یا کسی دوسرے مقصد سے وضو کرے، تو صحیح نہیں ہے۔

٤۔ترتیب: یعنی پہلے چہرہ پھر دایاں ہاتھ اس کے بعد بایاں ہاتھ دھونا چاہئے، اس کے بعد سر پھر پاؤں کا مسح کرنا چاہئے۔

....

۱۔یعنی پانی انسان کا اپنا ہونا چاہئے یا اس کا مالک اس سے وضو کرنے پر راضی ہو۔

٥۔مولات: یعنی وضو کے افعال یکے بعد دیگرے انجام دے اور ان کے درمیان اتنا فاصلہ نہ ہو کہ کسی عضو کو دھونے یا مسح کرنے کے وقت اس سے پہلا والا عضو خشک ہو جائے، لیکن اگر وضو کے افعال پے در پے انجام پانے کے باوجود ہوا گرم ہونے یا بدن کی گرمی وغیرہ کی وجہ سے وضو کی رطوبت خشک ہو جائے تو وضو صحیح ہے۔

نوٹ: یہ ضروری نہیں ہے کہ سر کا مسح سر کی کھال پر ہو بلکہ سر کے اگلے حصہ کے بالوں پر بھی صحیح ہے ،لیکن اگر سر کے دوسرے حصوں کے بال اگلے حصہ پر جمع ہوئے ہوں تو پہلے انھیں ہٹانا چاہئے اور اگر سر کے اگلے حصہ کے بال اس قدر لمبے ہوں کہ کنگھی کرنے سے

چہرے پر آئیں تو اس صورت میں بالوں کی جڑ پر مسح کرنا چاہئے یا مانگ نکال کر کھال پر مسح کرنا چاہئے۔

مبطلات وضو

جو چیزیں وضو کو باطل کرتی ہیں انھیں مبطلات کہتے ہیں اور وہ آٹھ ہیں:

۱۔ پیشاب

۲۔ پاخانہ

۳۔ ریاح (یہ اس صورت میں ہے کہ جب ہوا پاخانہ کے مقام سے خارج ہو یا بیماری اور آپریشن کی وجہ سے، مخرج دوسری جگہ ہو گیا ہو)

٤۔ بیہوشی

٥۔ مستی

٦۔ وہ نیند، جس میں آنکھیں نہ دیکھ سکیں اور کان نہ سن سکیں، اس بنا پر اگر آنکھیں نہ دیکھیں لیکن کان سنیں تو وضو باطل نہیں ہوتا ہے۔

۷۔ دیوانگی

۸۔ جنابت اور وہ اسباب جن کے لئے غسل کیا جاتا ہے نیز استحاضہ جسے عورتیں بعض اوقات دیکھتی ہیں، وضو کو باطل کرتا ہے۔

تیمم

اگر انسان وقت کی تنگی، بیماری یا پانی نہ ہونے یا اسی طرح کی کسی اور چیز کی وجہ سے نماز اور اس کے مانند دوسرے اعمال کے لئے وضو یا غسل نہ کر سکے تو اسے تیمم کرنا چاہیئے۔

تیمم کا طریقہ

تیمم میں چار چیزیں واجب ہیں:

۱۔نیت

۲۔دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو مٹی یا اس چیز پر مارنا جس پر تیمم کرنا صحیح ہے۔

۳۔دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو سر کے بال اگنے کی جگہ سے بھوؤں اور ناک کے اوپر پوری پیشانی پر پھیرنا۔بہتر ہے کہ ہاتھوں کو بھوؤں پر بھی پھیرا جائے۔

٤۔بائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو دائیں ہاتھ کی پوری پشت پر اور اس کے بعد دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو بائیں ہاتھ کی پوری پشت پر کھینچنا۔

وضو کے بدلے کئے جانے والے تیمم میں اتنی ہی مقدار کافی ہے لیکن اگر تیمم غسل کے بدلے ہو، تو ایک بار پھر ہاتھوں کو زمین پر مار کر صرف ہاتھوں کی پشت پر مسح کرے۔

تیمم کے احکام

۱۔اگر مٹی نہ ملے تو ریت پر، اور اگر ریت نہ ملے تو ڈھیلے پر، اور اگر وہ بھی نہ ملے تو پتھر پر تیمم

کرنا چاہئے اور جب ان میں سے کوئی بھی چیز نہ ملے تو کہیں پر جمع ہوئی گرد وغبار پر تیمم کرنا چاہئے۔

۲۔چونے اور دوسری معدنی چیزوں پر تیمم کرنا صحیح ہے۔

۳۔اگر پانی کو مہنگا بیچا جارہا ہو،لیکن انسان اسے خرید سکتا ہوتو تیمم نہیں کرسکتا ہے بلکہ اسے پانی خرید کر وضو اور غسل کرنا چاہئے۔

نماز

خدائے متعال فرماتا ہے:

(ماسلککم فی سقر،قالوا لم نك من المصلّین)

(مدثر۴۲،۴۳)

جب اہل جہنم سے پوچھا جائے گا آخر تمھیں کس چیز نے جہنم میں پہنچا دیا ہے؟ تو وہ کہیں گے ہم نماز گزار نہیں تھے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

نماز دین کا ستون ہے،اگر بارگاہ الٰہی میں یہ قبول ہو جائے گی تو دوسری عبادتیں بھی قبول ہوں گی اور اگر یہ قبول نہ ہوئی،تو دوسری عبادتیں بھی قبول نہیں ہوں گی

جس طرح ایک انسان،دن رات میں پانچ بار ایک نہر میں نہائے تو اس کے بدن میں کسی قسم

کا میل کچیل باقی نہیں رہے گا، اسی طرح پانچ وقت کی نمازیں بھی انسان کو گناہوں سے پاک کرتی ہیں، جاننا چاہئے کہ جو نماز پڑھتا ہے لیکن اسے اہمیت نہیں دیتا، وہ اس شخص کے مانند ہے، جو اصلاً نماز نہیں پڑھتا ہے۔ خدائے متعال قرآن مجید میں فرماتا ہے:

(فویل للمصلّین، الّذین هم عن صلاتهم ساهون)(ماعون[۵۴])

تو تباہی ہے ان نمازیوں کے لئے جو اپنی نمازوں سے غافل رہتے ہیں۔

ایک دن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں داخل ہوئے، اور دیکھا کہ ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے، لیکن رکوع وسجود کو مکمل طور پر بجا نہیں لا رہا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

یہ شخص جس طرح نماز پڑھ رہا ہے اگر اسی حالت میں اس دنیا سے گزر گیا تو مسلمان کی حیثیت سے دنیا سے نہیں گیا ہے۔

اس بنا پر نماز کو خضوع وخشوع کی حالت میں پڑھنا چاہئے اور نماز پڑھتے وقت اس بات کا خیال رکھے کہ کس ذات سے محو گفتگو ہے اور رکوع وسجود اور دوسرے تمام اعمال کو صحیح طور پر انجام دے تاکہ نماز کے عالی نتائج سے بہرہ مند ہو جائے۔ خدائے متعال قرآن مجید میں نماز کے بارے میں فرماتا ہے:

(انَّ الصَّلوة تنهیٰ عن الفحشاء والمنکر...)(عنکبوت[۴۵])

...نماز ہر برائی اور بدکاری سے روکتی ہے...

یقیناً ایسا ہی ہے، کیونکہ نماز کے آداب اس طرح ہیں کہ اگر نماز گزاران کا لحاظ رکھے تو کبھی

برائی کے پیچھے نہیں جائے گا۔ مثلاً آداب نماز میں سے ایک یہ ہے کہ نماز گزار کی جگہ اور لباس غصبی نہ ہوں، اگر اس کے لباس میں حتی ایک دھاگا بھی غصبی ہو تو اس کی نماز صحیح نہیں ہے۔ تو جو نماز گزار اس حد تک حرام سے پرہیز کرنے پر مجبور ہے تو ممکن نہیں ہے کہ وہ حرام مال کو استعمال کرے یا کسی کا حق ضائع کرے!

نیز نماز اس صورت میں قبول ہوتی ہے کہ انسان، حرص، حسد اور دوسری بری صفتوں سے دور رہے اور مسلّم ہے کہ تمام برائیوں کا سرچشمہ یہی بری اور ناشائستہ صفتیں ہیں اور نمازی جب اپنے آپ کو ان صفتوں سے دور رکھے گا، تو وہ یقیناً تمام برائیوں سے دور رہے گا۔

اگر بعض لوگ نماز پڑھنے کے باوجود ناپسند کاموں کے مرتکب ہوتے ہیں، تو اس کا سبب یہ ہے کہ وہ نماز کے ضروری احکام کے مطابق عمل نہیں کرتے اور نتیجہ میں ان کی نماز قبول نہیں ہوتی ہے اور وہ اس کے عالی نتائج سے محروم رہتے ہیں۔

دین اسلام کے شارع مقدس نے نماز کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ، ہر حال میں حتی جان کنی کی حالت میں بھی انسان پر نماز کو واجب قرار دیا ہے، اگر وہ نماز کو زبان پر جاری نہیں کر سکتا ہے تو دل پر جاری کرنا چاہیے اور اگر جنگ، دشمن کے خوف یا اضطرار اور مجبوری کی وجہ سے قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز نہ پڑھ سکے تو اس کے لئے قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا واجب نہیں ہے اور جس طرف بھی ممکن ہو نماز پڑھے۔

واجب نمازیں

واجب نمازیں چھ ہیں:

١۔پنجگانہ نمازیں(١)

٢۔نماز آیات

٣۔نماز میت

٤۔واجب طواف کی نماز

٥۔ماں باپ کی قضا نمازیں جو بڑے بیٹے پر واجب ہوتی ہیں۔

٦۔وہ نمازیں جو اجارہ،نذر،قسم اور عہد کی وجہ سے واجب ہوتی ہیں۔

....

١۔یومیہ نمازوں سے مراد: صبح کی دو رکعتیں،ظہر وعصر کی چار چار رکعتیں،مغرب کی تین رکعتیں اور عشا کی چار رکعتیں ہیں۔

مقدمات نماز

نماز بجالانے،یعنی پروردگار عالم کی خدمت میں حاضر ہونے اور ذات مقدس الٰہی کی اظہار بندگی اور پرستش، کے لئے کچھ مقدمات ضروری ہیں ۔ جب تک یہ مقدمات فراہم نہ ہو جائیں نماز صحیح نہیں ہے اور یہ مقدمات حسب ذیل ہیں:

۱۔طہارت

۲۔وقت

۳۔لباس

٤۔مکان

٥۔قبلہ

ان مقدمات کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔طہارت

نمازی کو نماز کی حالت میں باطہارت ہونا چاہئے، اپنے فریضہ کے مطابق نماز کو باوضو یا غسل یا تیمم کے ذریعہ بجالائے اور اس کا بدن اور لباس نجاست سے آلودہ نہ ہوں۔

۲۔وقت

نماز ظہر و عصر میں سے ہر ایک کا ایک مخصوص وقت اور مشترک وقت ہے، نماز ظہر کا مخصوص وقت اول ظہر (۱) سے نماز ظہر پڑھنے کا وقت گزرنے تک ہے۔ اگر کوئی شخص اس وقت میں سہواً بھی نماز عصر پڑھے، تو اس کی نماز باطل ہے۔

نماز عصر کا مخصوص وقت، اس وقت ہوتا ہے جب مغرب سے پہلے صرف نماز عصر پڑھنے کے برابر وقت بچا ہو۔ اگر کسی نے اس وقت تک ظہر کی نماز نہ پڑھی ہو تو اس کی نماز ظہر قضا ہو

جائے گی۔اسی طرح نماز ظہر کے مخصوص وقت اور نماز عصر کے مخصوص وقت کے درمیان کا وقت نماز ظہر وعصر کا مشترک وقت ہے۔اگر کوئی شخص غلطی سے اس وقت کے اندر نماز عصر کو نماز ظہر سے پہلے پڑھے تو اس کی نماز صحیح ہے اور اسے ظہر کی نماز اس کے بعد پڑھنی چاہئے۔

....

۱۔اگر ایک لکڑی یا اس کے مانند کوئی چیز سیدھی زمین میں نصب کی جائے تو،سورج چڑھنے پر اس کا سایہ مغرب کی طرف پڑے گا جس قدر سورج او پر چڑھے گا، یہ سایہ کم ہوتا جائے گا اور اول ظہر میں اس کی کمی آخری مرحلہ پر پہنچ جائے گی، جب ظہر کا وقت گزرے گا تو سایہ مشرق کی طرف پلٹ جاتا ہے اور سورج جس قدر مغرب کی طرف بڑھے گا سایہ زیادہ ہوتا جائے گا۔اس بنا پر جب سایہ کم ہوتے ہوئے کمی کے آخری درجہ پر پہنچ جائے اور پھر سے بڑھنا شروع ہو جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ظہر کا وقت ہے۔لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ بعض شہروں جیسے مکہ مکرمہ میں ظہر کے وقت سایہ بالکل غائب ہوتا ہے، ایسے شہروں میں سایہ کے دوبارہ نمودار ہونے پر ظہر کا وقت ہوتا ہے۔

نماز مغرب کا مخصوص وقت(۱)اول مغرب سے تین رکعت نماز پڑھنے کے وقت کے برابر ہے۔نماز عشا کا مخصوص وقت وہ وقت ہے جب نصف شب(۲) سے پہلے نماز عشا پڑھنے کے برابر وقت بچا ہو۔اگر کسی نے اس وقت تک نماز مغرب نہیں پڑھی ہے تو اسے پہلے نماز عشا پڑھنی چاہئے پھر اس کے بعد نماز مغرب پڑھے۔

نماز مغرب کے مخصوص وقت اور نماز عشاء کے مخصوص وقت کے درمیان نماز مغرب وعشا کا

مشترک وقت ہے۔ اگر کوئی شخص اس وقت میں غلطی سے نماز مغرب سے پہلے نماز عشا کو پڑھے تو اس کی نماز صحیح ہے اور اسے نماز مغرب کو اس کے بعد بجالانا چاہیئے۔
نماز صبح کا وقت اول فجر (۳) صادق سے سورج نکلنے تک ہے۔

....

۱۔سورج ڈوبنے کے تقریباً پندرہ منٹ بعد مغرب ہوتی ہے۔اس کی علامت یہ ہے کہ سورج ڈوبنے کے بعد مشرق کی طرف رونما ہونے والی سرخی غائب ہوجائے۔
۲۔نصف شب، شرعی ظہر کے بعد گیارہ گھنٹے اور پندرہ منٹ گزرنے کے بعد ہوتی ہے۔
۳۔فجر کی اذان کے قریب مشرق کی طرف ایک سفیدی اوپر کی طرف بڑھتی ہے اسے فجر اول یا فجر کاذب کہتے ہیں۔ جب یہ سفیدی پھیل جاتی ہے، تو فجر دوم یعنی فجر صادق ہے اور صبح کی اذان کا وقت ہے۔

۳۔لباس

نمازی کے لباس میں چند چیزیں شرط ہیں:
۱۔لباس مباح ہو، یعنی نمازی کا اپنا لباس ہو یا اگر اپنا لباس نہ ہو تو اس لباس کا مالک اس میں نماز پڑھنے پر راضی ہو۔
۲۔لباس نجس نہ ہو۔ ۳۔مردار کی کھال کا نہ ہو، خواہ حلال گوشت حیوان کی کھال ہو یا حرام گوشت کی۔

٤۔حرام گوشت حیوان کے اون یا بالوں کا نہ ہو۔لیکن سمور کے کھال سے بنے ہوئے لباس میں نماز پڑھ سکتے ہیں۔

٥۔اگر نمازی مرد ہے تو ریشمی اور زر باف لباس نہیں ہونا چاہئے اور خود کو بھی سونے سے زینت نہ کرے۔نماز کے علاوہ بھی مردوں کے لئے ریشمی لباس پہننا اور سونے سے زینت کرنا حرام ہے۔

٤۔مکان

نمازی کے مکان۔یعنی وہ جگہ جہاں پر وہ نماز پڑھتا ہے۔کے کچھ شرائط ہیں:

١۔مباح ہو۔

٢۔ساکن ہو۔اگر ایک ایسی جگہ جو متحرک ہو، جیسے گاڑی میں اور متحرک کشتی میں نماز پڑھنے پر مجبور ہو تو کوئی حرج نہیں ہے، البتہ گاڑی وغیرہ قبلہ کے مخالف سمت میں چل رہی ہوں تو نمازی کو قبلہ کی طرف گھومنا چاہئے۔

٣۔اگر مکان نجس ہو تو اس قدر تر نہ ہو کہ اس کی رطوبت نمازی کے بدن یا لباس تک پہنچ جائے۔لیکن پیشانی رکھنے کی جگہ اگر نجس ہو تو خشک ہونے کی صورت میں بھی نماز باطل ہے۔

٤۔پیشانی رکھنے کی جگہ گھٹنوں کی جگہ سے، ملی ہوئی چار انگلیوں سے زیادہ پست یا بلند نہیں ہونی چاہئے۔

۵۔ قبلہ

خانہ کعبہ، جو مکہ مکرمہ میں ہے، قبلہ ہے اور اسی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنی چاہیئے۔ البتہ جو لوگ دور ہیں وہ اگر اس طرح کھڑے ہو جائیں یا بیٹھ جائیں کہ کہا جائے کہ قبلہ کی طرف رخ کئے ہوئے ہیں، تو کافی ہے، اسی طرح دوسری چیزیں جیسے حیوانات کا ذبح کرنا بھی قبلہ کی طرف رخ کر کے انجام دیا جانا چاہیئے۔

جو شخص بیٹھ کر بھی نماز نہ پڑھ سکتا ہو تو اسے دائیں پہلو پر ایسے لیٹ کر نماز پڑھنا چاہیئے کہ اس کے بدن کا اگلا حصہ قبلہ کی طرف ہو، اور اگر ممکن نہ ہو تو بائیں پہلو پر اس طرح لیٹے کہ اس کے بدن کا اگلا حصہ قبلہ کی طرف ہو اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو اسے پشت پر اس طرح لیٹنا چاہیئے کہ اس کے پاؤں کے تلوے قبلہ کی طرف ہوں۔ اگر انسان تحقیق کے بعد نہ سمجھ سکے کہ قبلہ کس طرف ہے تو اسے مسلمانوں کے محرابوں، قبروں یا دوسرے راستوں سے پیدا ہوئے گمان کے مطابق عمل کرنا چاہیئے۔

واجبات نماز

واجبات نماز یعنی وہ چیزیں جو نماز میں واجب ہیں، گیارہ ہیں:

۱۔ نیت

۲۔ تکبیرۃ الاحرام

۳۔قیام

٤۔قرات

٥۔رکوع

٦۔سجود

۷۔تشہد

۸۔سلام

۹۔ترتیب،یعنی نماز کے اجزاء کو معین شدہ دستور کے مطابق پڑھے،آگے پیچھے نہ کرے۔

۱۰۔طمانیت،یعنی نماز کو وقار اور آرام سے پڑھے۔

۱۱۔موالات:یعنی نماز کے اجزاء کو پے در پے بجالائے اور ان کے درمیان فاصلہ نہ ڈالے۔

مذکورہ گیارہ چیزوں میں سے پانچ چیزیں ارکان ہیں کہ اگر عمداً یا سہواً کم وزیاد ہو جائیں،تو نماز باطل ہے اور باقی چیزیں رکن نہیں ہیں،صرف اس صورت میں نماز باطل ہوگی کہ ان میں عمداً کمی وزیادتی کی جائے۔

ارکان نماز

ارکان نماز حسب ذیل ہیں:

۱۔نیت

۲۔تکبیرۃ الاحرام

۳۔قیام۔تکبیرۃ الاحرام کے وقت پر قیام اور متصل بہ رکوع

٤۔رکوع

٥۔دوسجدے

١۔نیت

نیت سے مراد یہ ہے کہ انسان نماز کو قصد قربت سے، یعنی خدائے متعال کے حکم کو بجالانے کے لئے انجام دے۔ضروری نہیں ہے کہ نیت کو دل سے گزارے یا مثلاً زبان سے کہے: میں چار رکعت نماز ظہر پڑھتا ہوں قربۃً الی اللہ

٢۔تکبیرۃ الاحرام

اذان و اقامت کہنے کے بعد، نیت کے ساتھ اللہ اکبر کہنے سے نماز شروع ہوتی ہے اور چونکہ اس تکبیر کے کہنے سے کچھ چیزیں جیسے کھانا، پینا، ہنسنا اور قبلہ کی طرف پشت کرنا، حرام ہو جاتی ہیں، اس لئے اسے تکبیرۃ الاحرام کہتے ہیں۔اور مستحب ہے کہ تکبیرۃ الاحرام کہتے وقت ہاتھوں کو بلند کریں، اس عمل سے خدائے متعال کی بزرگی کو مدنظر رکھ کر غیر خدا کو حقیر سمجھ کر چھوڑ دیں۔

٣۔قیام

تکبیرۃ الاحرام کہتے وقت میں قیام اور قیام متصل بہ رکوع، رکن ہے، لیکن حمد اور سورہ پڑھتے

وقت قیام اور رکوع کے بعد والا قیام رکن نہیں ہے .اس بناء پر اگر کوئی شخص رکوع کو بھول جائے اور سجدے میں پہنچنے سے پہلے اسے یاد آجائے اسے کھڑا ہونے کے بعد رکوع میں جانا چاہئے ،لیکن اگر جھکے ہوئے رکوع کی حالت میں ہی سجدہ کی طرف پلٹے ،تو چونکہ قیام متصل بہ رکوع انجام نہں پایا ہے اس لئے اسکی نماز باطل ہے۔

٤۔رکوع

نمازی کو قرائت کے بعد اس قدر جھکنا چاہئے کہ ہاتھ گھٹنوں تک پہنچ جائیں اور اس عمل کو رکوع کہتے ہیں ۔رکوع میں ایک مرتبہ سبحان ربّی العظیم وبحمدہ یا تین مرتبہ سبحان اللہ کہنا چاہئے ۔رکوع کے بعد مکمل طور پر کھڑا ہونا چاہئے اس کے بعد سجدے میں جانا چاہئے۔

٥۔سجدہ

سجدہ یہ ہے کہ پیشانی ،دونوں ہتھیلیاں ،دونوں گھٹنے اور دونوں پاؤں کے انگوٹھوں کے سرے کو زمین پر رکھے اور ایک مرتبہ سبحان ربّی الاعلی وبحمدہ یا سبحان اللہ تین مرتبہ پڑھے۔اس کے بعد بیٹھے اور سجدہ میں جا کر مذکورہ ذکر پڑھے۔

جس چیز پر پیشانی رکھتا ہے وہ زمین یا زمین سے اگنے والی چیز ہونی چاہئے،کھانے پینے ،پوشاک اور معدنی چیزوں پر سجدہ جائز نہیں ہے۔

تشہد وسلام

اگر نماز دو رکعتی ہے، تو دو سجدے بجالانے کے بعد کھڑا ہو جائے اور حمد وسورہ کے بعد قنوت (۱) بجالائے پھر رکوع اور دو سجدوں کے بعد تشہد (۲) پڑھے پھر سلام (۳) پڑھ کر نماز تمام کرے۔

اگر نماز تین رکعتی ہو تو تشہد کے بعد اٹھے اور صرف ایک بار حمد یا تین مرتبہ

سبحان اللہ و الحمد للّٰہ و لا الٰہ اِلاَّ اللہ و اللہ اکبر

پڑھے، پھر رکوع، دو سجدے، تشہد اور سلام پڑھے۔

اور اگر نماز چار رکعتی ہے تو چوتھی رکعت کو تیسری رکعت کی طرح بجالا کر، تشہد کے بعد سلام پڑھے۔

....

۱۔ حمد وسورہ کے بعد ہاتھوں کو اپنے چہرے کے روبرو بلند کر کے قنوت میں جو بھی ذکر چاہے کہے، مثلاً:

ربنا آتنا فی الدنیا حسنة و فی الاخرة حسنة و قنا عذاب النار

۲۔ تشہد سے مراد یہ ہے کہ ان جملات کو کہے:

اشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له و اشهد ان محمداً عبده و رسوله، اللهم صل علی محمد و آل محمد

۳۔ سلام کو اسطرح بجالائے:

السلام علیك ایّها النّبی و رحمة الله و بركاته، السَّلام علینا و علی عباد الله الصّالحین، السلام علیكم و رحمة الله و بركاته.

نماز آیات

چار چیزوں کی وجہ سے نماز آیات واجب ہوتی ہے:

۱۔سورج گہن

۲۔ چاند گہن۔ چاہے کچھ حصے کو گہن لگا ہو اور کوئی اس سے خوفزدہ بھی نہ ہو۔

۳۔زلزلہ۔اگر چہ کوئی نہ ڈرے۔

٤۔ بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک اور سیاہ وسرخ آندھی وغیرہ،اس صورت میں کہ اکثر لوگ ڈر جائیں۔

نماز آیات پڑھنے کا طریقہ

نماز آیات دو رکعت ہے اور ہر رکعت میں پانچ رکوع ہیں اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ انسان نیت کے بعد تکبیر کہے اور حمد اور ایک مکمل سورہ پڑھے پھر رکوع میں جائے، پھر رکوع سے کھڑا ہو جائے، اور دوبارہ حمد اور ایک سورہ پڑھے پھر رکوع بجالائے یہاں تک کہ پانچ مرتبہ رکوع بجالائے اور پانچویں رکوع سے اٹھنے کے بعد دو سجدے بجالائے پھر کھڑے ہو کر دوسری رکعت کو پہلی رکعت کے مانند بجالا کر تشہد اور سلام کے بعد نماز تمام کرے۔

نماز آیات کا دوسرا طریقہ:

انسان نیت اور تکبیر اور سورہ حمد پڑھنے کے بعد ایک سورہ کی آیات کو پانچ حصوں میں تقسیم کرکے اس کے ایک حصہ کو پڑھ کر رکوع میں جائے، رکوع سے اٹھ کر سورہ حمد پڑھے بغیر سورہ کا دوسرا حصہ پڑھے اور پھر رکوع بجالائے اور اسی طرح پانچویں رکوع سے پہلے سورہ کو ختم کرکے پھر رکوع بجالائے اس کے بعد دوسجدے بجالائے پھر دوسری رکعت کو پہلی رکعت کے مانند بجالا کے نماز کو ختم کرے۔

مسافر کی نماز

مسافر کو چھ شرائط کے ساتھ چار رکعتی نماز کو دو رکعت پڑھنا چاہیئے:

۱۔اس کا سفر آٹھ فرسخ سے کم نہ ہو یا چار فرسخ جائے اور چار فرسخ واپس آئے۔

۲۔ابتداء سے آٹھ فرسخ سفر کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔

۳۔راستہ میں اپنے قصد کو نہ توڑے۔

٤۔اس کا سفر گناہ کے لئے نہ ہو۔

٥۔سفر اس کا پیشہ نہ ہو۔

پس اگر کسی کا پیشہ سفر ہو (جیسے ڈرائیور) تو اسے نماز پوری پڑھنی چاہیئے مگر یہ کہ دس روز اپنے گھر میں رہے، تو اس صورت میں تین بار سفر کرنے پر نماز قصر پڑھے۔

٦۔حد ترخص تک پہنچ جائے، یعنی اپنے وطن یا دس دن تک قیام کی جگہ سے اس قدر دور چلا جائے کہ شہر کی دیواروں کو نہ دیکھ سکے اور اس شہر کی اذان کو نہ سن سکے۔

نماز جماعت

مستحب ہے کہ مسلمان پنجگانہ نمازوں کو جماعت کی صورت میں پڑھے اور نماز جماعت کا ثواب فرادیٰ پڑھی جانے والی نماز کے کئی ہزار گنا ہے۔

نماز جماعت کی شرائط

١۔ امام جماعت بالغ، مؤمن، عادل اور حلال زادہ ہونا چاہیئے، نماز کو صحیح پڑھتا ہو اور اگر ماموم مرد ہے تو امام کو بھی مرد ہونا چاہیئے۔

٢۔ امام اور ماموم کے درمیان پردہ یا کوئی اور چیز حائل نہ ہو جو امام کو دیکھنے میں رکاوٹ بنے، لیکن اگر ماموم عورت ہو تو اس صورت میں پردہ یا اس کے مانند کسی چیز کے ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

٣۔ امام کی جگہ ماموم کی جگہ سے بلند نہ ہو، لیکن اگر بہت کم (چار انگلیوں کے برابر یا اس سے کم) بلند ہو تو کوئی حرج نہیں ہے۔

٤۔ ماموم کو امام سے تھوڑا پیچھے یا اس کے برابر ہونا چاہیئے۔

نماز جماعت کے احکام

۱۔ ماموم حمد وسورہ کے علاوہ ساری چیزیں خود پڑھے، لیکن اگر اس کی پہلی یا دوسری رکعت ہو اور امام کی تیسری یا چوتھی رکعت ہو تو اسے حمد وسورہ کو بھی پڑھنا چاہئے اور اگر سورہ پڑھنے کی وجہ سے امام کے ساتھ رکوع میں نہ پہنچ سکے تو صرف حمد پڑھ کر خود کو رکوع میں امام کے ساتھ پہنچا دے اور اگر نہ پہنچ سکا تو نماز کو فرادی کی نیت سے پڑھے۔

۲۔ ماموم کو رکوع، سجود اور نماز کے دوسرے افعال امام کے ساتھ یا اس سے تھوڑا بعد انجام دینا چاہئے، لیکن تکبیرۃ الاحرام کو قطعاً امام کے بعد کہے۔

۳۔ اگر امام رکوع میں ہو اور اس کی اقتداء کرے اور رکوع میں پہنچ جائے، تو اس کی نماز صحیح ہے اور ایک رکعت حساب ہوگی۔

روزہ

دین مقدس اسلام کے فروع دین میں سے ایک روزہ ہے۔ ہر مکلف پر واجب ہے کہ وہ رمضان المبارک میں روزہ رکھے۔ یعنی پروردگار عالم کے حکم کی اطاعت کرتے ہوئے صبح کی اذان سے مغرب تک، روزہ کو باطل کرنے والی چیزوں (مفطرات روزہ) سے پرہیز کرے۔

روزہ کو باطل کرنے والی چیزیں

چند چیزیں روزہ کو باطل کرتی ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔کھانا اور پینا، اگر چہ اس چیز کا کھانا اور پینا معمول نہ ہو، جیسے مٹی اور درخت رس۔

۲۔خدا، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کے جانشینوں (ائمہ ھدی) کی طرف جھوٹ کی نسبت دینا۔

۳۔غلیظ غبار کو حلق تک پہنچانا۔

٤۔پورے سر کو پانی میں ڈبو دینا۔

٥۔قے کرنا اگر عمداً ہو۔

دوسرے مفطرات روزہ کے بارے میں مراجع کی توضیح المسائل کی طرف رجوع کیا جائے۔

اسلام میں جہاد

جہاد کے کلی مسائل

ہر مخلوق کا اپنی ذات کا دفاع کرنا اور اسی طرح اپنے منافع کا دفاع کرنا ایک عام قانون ہے جو عالم خلقت میں بلا چون و چرا ثابت ہے۔

انسان بھی اپنی حیثیت سے اپنی ہستی اور منافع کا دفاع کرتا ہے اور دوسروں کے مانند دفاع کی توانائیوں سے مسلح ہے تا کہ اپنے دشمن سے مقابلہ کر سکے۔انسان اپنی خدادادجبّلت

اورفطرت سے قائل ہے کہ اسے اپنا دفاع کرنا چاہئے اوراپنے اس دشمن کونابودکردینا چاہے جوکسی بھی وسیلہ سے اس کونابودکرنے سے بازنہیں آرہا ہے۔اسی طرح اگرکوئی شخص اس کے حیاتی منافع پرقبضہ کرنا چاہےتواسے دفاع کی غرض سے اٹھنا چاہئے اور ہرممکن طریقے سے اس کوروکنا چاہئے۔

یہ فطری موضوع جوایک انسان کی فطرت میں ثابت اور پائدارہے ،اسی طرح انسانی معاشروں میں بھی ثابت ومستحکم ہے۔یعنی جودشمن معاشرے کے افراد یامعاشرے کی آزادی کے لئے خطرہ ہو،وہ اس معاشرے کی نظرمیں سزائے موت کا مستحق ہےاور جب سے انسان اورانسانی معاشرے ہیں یہ فکران میں ثابت اوربرقرار ہے کہ ہرفرداورمعاشرہ اپنے جانی دشمن کے بارے میں ہرقسم کا فیصلہ کرسکتا ہےاورردعمل دکھاسکتا ہے۔

اسلام بھی ۔جوایک اجتماعی دین ہے اورتوحید کی بنیاد پراستوار ہے ۔حق اورعدالت کے سامنےتسلیم نہ ہونے والوں کواپنا جانی دشمن جانتا ہے اورانھیں نظام بشریت میں مخل جان کران کے لئےکسی قسم کی قدروقیمت اوراحترام کا قائل نہیں ہےاور چونکہ خودکو عالمی دین جانتاہےاس لئے اپنے پیروؤں کے لئےکسی ملک اورسرحدوں کی محدودیت کا قائل نہیں ہے اورجوبھی شرک کےعقیدہ میں مبتلا ہواورواضح منطق اورحکیمانہ پندونصیحت کوقبول نہ کرتا ہواور حق اوراحکام الٰہی کے سامنےہتھیارنہ ڈالتا ہو،تواسلام اس کے ساتھ جنگ کرتا ہے تاکہ وہ حق وعدالت کےسامنےہتھیارڈال دے۔

مختصر یہ کہ جہاد کے سلسلہ میں اسلام کےقوانین بھی یہی ہیں اوروہ مکمل طور پراس روش کے

مطابق ہیں جو ہر انسانی معاشرہ کی اپنی فطرت کے مطابق اپنے جانی دشمنوں کے بارے میں ہے۔

اسلام، بدخواہ دشمنوں کے پروپیگنڈوں کے باوجود، تلوار کا دین نہیں ہے، کیونکہ اسلام کی روش سلاطین کی روش نہیں ہے کہ جن کی دلیل ومنطق صرف تلوار اور سیاسی حربے ہوتے ہیں، بلکہ اسلام ایک ایسا دین ہے، جس کا بانی خدائے متعال ہے، جو اپنے آسمانی کلام میں لوگوں کے ساتھ منطق وعقل کی بنیاد پر بات کرتا ہے اور اپنی مخلوقات کو اس دین کی طرف دعوت دیتا ہے جو ان کی فطرت کے مطابق ہے۔

جس دین کی عمومی تحیّت، سلام ہو اور اس کا عمومی پروگرام قرآن مجید کے نص کے مطابق والصلح خیر(۱) ہو، وہ ہرگز تلوار کا دین نہیں ہوسکتا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں، جب اسلام کی نورانیت نے تمام حجاز کو

....

۱۔نسائی ۱۲۷۔

منور کر رکھا تھا اور مسلمان اہم جنگوں اور سخت مقابلوں میں مبتلا تھے، تو اس وقت قتل ہونے والے مسلمانوں کی تعداد دوسو سے زیادہ نہ تھی اور قتل ہونے والے کفار کی تعداد ایک ہزار تک نہیں پہنچی تھی۔ کتنی بے انصافی ہے کہ ایسے دین کو تلوار کا دین کہا جائے۔

اسلام میں جنگ کے مواقع

اسلام،جن کے ساتھ جنگ کرتا ہے،وہ حسب ذیل چند گروہ ہیں:

۱۔مشرکین:

مشرکین یعنی وہ لوگ جوتوحید،نبوت اورمعاد کے قائل نہیں ہیں ۔ان کو پہلے اسلام لانے کی دعوت دیتا ہے تاکہ کسی قسم کا شک وشبہ اور بہانہ باقی نہ رہے،دین کے حقائق کوان کیلئے واضح کرکے تشریح کرتا ہے،پس اگرانھوں نے قبول کیا تو دوسرے مسلمانوں کے بھائی اور نفع ونقصان میں برابر ہوں گے ،اور اگر قبول نہ کیا اورحق وحقیقت کے واضح ہونے کے باوجود تسلیم نہ ہوئے تو اسلام ان کے مقابلہ میں اپنا دینی فریضہ جہاد کوانجام دیتا ہے۔

۲۔اہل کتاب:

اہل کتاب یہود،عیسائی اور مجوسی ہیں اسلام ان کوصاحب دین اورصاحب کتاب آسمانی جانتا ہے۔یہ لوگ توحید،نبوت مطلقہ اورمعاد کے قائل ہیں ان لوگوں کے ساتھ بھی مشرکین جیسا سلوک کرنا چاہئے ،لیکن چونکہ اصل توحید پرعقیدہ رکھتے ہیں ،لہذا جزیہ ادا کرکے اسلام کی پناہ میں آسکتے ہیں ،یعنی اسلام کی سرپرستی کوقبول کریں اوراپنی آزادی کی حفاظت کریں اوراپنے دینی احکام پرعمل کریں۔تو دوسرے مسلمانوں کی طرح ان کی جان ،مال اورعزت محترم ہوگی اوراسکے عوض میں اسلامی معاشرہ کوکچھ مال ادا کریں گے،لیکن ان کواسلام کے

خلاف پروپیگنڈے، دین کے دشمنوں کی مدد اور دوسرے ایسے کام انجام نہیں دینا چاہئے جو مسلمانوں کے نقصان میں ہو۔

۳۔بغاوت اور فساد برپا کرنے والے:

بغاوت اور فساد برپا کرنے والے یعنی وہ مسلمان جو اسلام و مسلمین کے خلاف مسلحانہ بغاوت کرکے خونریزی کریں، اسلامی معاشرہ ان کے ساتھ جنگ کرتا ہے تاکہ وہ ہتھیار ڈال کر فساد اور بغاوت سے ہاتھ کھینچ لیں۔

٤۔دین کے دشمن:

دین کے دشمن جو دین کی بنیاد کو ویران کرنے یا حکومت اسلامی کو نابود کرنے کے لئے حملہ کریں، تو تمام مسلمانوں پر واجب ہے کہ دفاع کریں اور ان کے ساتھ کافر حربی کا سلوک کریں۔

اگر اسلام اور مسلمین کی مصلحت کا تقاضا ہو تو اسلامی معاشرہ اسلام کے دشمنوں کے ساتھ وقتی طور پر جنگ بندی کا معاہدہ کرسکتا ہے، لیکن یہ حق نہیں ہے کہ ان کے ساتھ ایسا دوستانہ رابطہ برقرار کرے کہ ان کے گفتار و کردار مسلمانوں کے افکار و اعمال پر منفی اثر ڈال کر انھیں خراب کردیں۔

جہاد کے بارے میں اسلام کا عام طریقہ

اسلامی معاشرہ پر فرض ہے کہ اگر جہاد کے شرائط موجود ہوں تو، اُن کفار سے راہ خدا میں جنگ کریں جن کی سرحد ملی ہوئی ہے، اور ہر مسلمان بالغ، عاقل، صحت منداور جس کے ہاتھ پاؤں اور آنکھ صحیح وسالم نہ ہوں، پر جہاد واجب کفائی ہے۔

اسلام کے لشکر پر فرض ہے کہ جب دشمن کے ساتھ مقابلہ پر آئے، تو دینی حقائق کو ان کے لئے اس طرح بیان اور واضح کرے کہ کوئی ابہام باقی نہ رہے اور ان کو حق کی طرف دعوت دے اور صرف اس صورت میں جنگ کا اقدام کرے کہ حق کے واضح ہونے کے بعد بھی وہ دین کو قبول نہ کریں۔

اسلام کے سپاہی کو دشمنوں پر پانی بند نہیں کرنا چاہئے اور دشمن پر شب خون نہیں مارنا چاہئے دشمن کی عورتوں، بچوں، ناتواں بوڑھوں اور دفاع کی قدرت نہ رکھنے والوں کو قتل نہیں کرنا چاہئے، دشمن کے برابر یا دو گنا ہونے کی صورت میں میدان جنگ سے فرار نہ کرے۔

اگر ہم اسلام کے جنگی طریقہ کو ترقی یافتہ ملتوں کے جنگی طریقوں سے موازنہ کریں، جو ہر خشک وتر کو جلا دیتے ہیں اور کسی کمزور اور بیچارہ کے حال پر رحم نہیں کرتے، تو واضح ہو جائے گا کہ اسلام کس قدر انسانیت کے اصول کا پابند ہے۔

حکومت، قضاوت اور جہاد کیوں مردوں سے مخصوص ہے؟

معاشرے کے حساس ترین اجتماعی امور کہ، جن کی باگ ڈور صرف عقل واستدلال کے سپرد کی جانی چاہئے اوران میں جذبات واحساسات کی کسی صورت میں مداخلت نہیں ہونی چاہئے، وہ حکومت، قضاوت اور جنگ کے شعبے ہیں۔ کیوں کہ مملکت کے امور کو چلانے اور، معاشرے میں پیدا ہونے والی دشمنیوں کو حل کرنے میں ہزاروں نا قابل برداشت واقعات اورطرح طرح کی چہمی گوئیوں اورجان، مال، عزت وابرو کی دھمکیوں جیسے گونا گوں مسائل سے دو چار ہونا پڑتا ہے کہ جس کو نہایت قوی اور مستقل مزاج افراد کے علاوہ کوئی طاقت برداشت نہیں کرسکتی کہ اوران تمام مسائل سے چشم پوشی کر کے صبر نہیں کیا جاسکتا ہے، اور گونا گوں مخالفتوں کے درمیان اجتماعی عدالت کو نافذ نہیں کیا جاسکتا ہے، جو اس عہدہ کا حامل ہو اسے دوست ودشمن، برُے اور بھلے، چاپلوس اور بد گوئی کرنے والے اورعالم وجاہل کو ایک نظر سے دیکھنا چاہئے اوراپنے خواہشات نفسانی کے برعکس حکومت کرنی چاہئے اور فیصلہ دینا چاہئے۔ بدیہی ہے کہ جس کے وجود میں جذبات کا غلبہ ہوتا ہے وہ اس کام کو انجام دینے کی توانائیاں نہیں رکھتا ہے۔ جب جذبات حکومت اور قضاوت سے عاجز ہوں گے تو جنگ کے شعبہ میں بدرجہ اولیٰ نامناسب ہوں گے کیونکہ دوسرے اجتماعی امور کے برعکس جنگ میں ہر خشک وتر کو جلا دیتے ہیں جنگی سپاہی اوردشمن کے شیر خوار بچے کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے۔ اسلام کا جنگی طریقہ عدالت کی بنیاد پر استوار ہے، البتہ اس قسم کی کا طریقہ جذبات کے غلبہ

سے عمل میں نہیں لایا جاسکتا ہے، کیونکہ اگر جنگ کے وقت جذبات اور ہمدردی کی بنا پر قطب موافق کی طرف مائل ہوا تو ضرورت سے زیادہ نرمی اختیار کر کے شکست کھائے گا اور اگر قطب مخالف کی طرف مائل ہوا، تو حد سے تجاوز کر کے، گنہگار اور بے گناہ کو یکساں سمجھ کر انسانی اصول وضوابط کو پامال کرے گا۔

اس سلسلہ میں اسلام کے نظریہ کی حقانیت کی بہترین دلیل یہ ہے کہ مغربی ممالک نے مدتوں سے عورتوں کو معاشرے میں مردوں کے دوش بدوش قرار دیا ہے اور تعلیم وتربیت سے ان کی نشونما کرتے ہیں اور اب تک حکومت کے عہدوں، عدلیہ کے عالی مقامات اور جنگی سرداروں کے عہدوں پر مردوں کے مقابلہ میں عورتوں نے کوئی قابل توجہ ترقی نہیں کی ہے۔ البتہ خانہ داری اور بچوں کی تربیت کے کاموں میں، کہ جن کا سرچشمہ جذبات اور ہمدردی سے ہمیشہ پیش قدم رہی ہیں۔

امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام نے ایک مختصر جملہ میں معاشرے میں عورت کی حیثیت و منزلت کو یوں بیان فرمایا ہے:

فانّ المرۃ ریحانۃ ولیست بقہر مانۃ (۱)

بیشک عورت ایک خوشبودار پھول ہے نہ سورما

اور یہ ایک بہترین جملہ ہے جو اسلامی معاشرے میں عورت کی اجتماعی منزلت کی نشاندہی کرتا ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ عورتوں کے بارے میں نصیحت فرماتے تھے، یہاں تک

کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں جو آخری کلمہ فرمایا اور اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ خاموش ہو گئے وہ یہ تھا:

اللہ اللہ فی النساء (۲)

....

۱۔وسائل الشیعہ ،ج۱۴،ص۱۲۰،باب ۸۷۔

۲۔بحارالانوار،ج۳۲،ص۵۳۰۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور مختلف قسم کی سزائیں

اسلام کی حیات و بقا سے مربوط ضرورتوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے قوانین کی مخالفتوں کو روکا جائے۔اس ضرورت کو دور کرنے کے لئے دو امور سے استفادہ کیا گیا ہے:

۱۔سزا کے لئے قوانین کا وضع کرنا،جن کو اسلامی حکومت کے ذریعہ نافذ ہونا چاہئے اور اس طرح شرعی احکام کی مخالفت کو روکا جا سکتا ہے۔

۲۔امر بالمعروف و نہی عن المنکر،اسلام نے اپنے تمام پیروؤں پر واجب کیا ہے کہ جب دیکھیں کہ کسی قانون پر عمل نہیں ہو رہا ہے،تو وہ آرام سے نہ بیٹھیں بلکہ خلاف ورزی کرنے والے کو اطاعت پر مجبور کریں اور اسے نافرمانی کرنے سے روکیں۔

مسلمانوں کے عام افراد، بادشاہ و رعایا، طاقتور و کمزور، مرد و عورت اور چھوٹے بڑے سب اس دینی فریضہ کو نافذ کرنے پر مامور ہیں اور خاص شرائط کے ساتھ اس کام (امر بالمعروف و نہی عن المنکر) کو انجام دینا چاہیئے۔ یہ اسلام کے شاہکاروں میں سے ایک شاہکار ہے کہ قانون کی خلاف ورزی کو روکنے کے لئے، دنیا کے مختلف کورٹ کچہری اور تھانوں سے بہتر اور قوی تر ہے۔

اسلام میں فیصلہ

مسائل عدلیہ کے کلیات

شرعی طور پر جو صفتیں قاضی میں ہونی چاہئیں، حسب ذیل ہیں:

۱۔ بالغ

۲۔ عاقل

۳۔ اسلام

٤۔ عدالت، یعنی گناہان کبیرہ کو انجام نہ دے اور گناہان صغیرہ پر اصرار نہ کرے۔

٥۔ حلال زادہ

٦۔ علم، یعنی عدلیہ سے مربوط قوانین کو اپنے اجتہاد سے جانتا ہو، اگر دوسرے کے فتوی کے مطابق سنائے تو کافی نہیں ہے۔

۷۔ یادداشت ۔یعنی بھولنے والا فیصلہ نہیں دے سکتا ہے۔

۸۔ بینائی ۔اکثر فقہا کی نظر میں نابینا جج نہیں بن سکتا ہے۔

اگر قاضی میں مذکورہ صفات میں سے کوئی ایک صفت نہیں پائی جاتی ہو تو وہ خودبخود فیصلہ دینے کے منصب سے عزل ہوجاتا ہے۔

قاضی (جج) کے فرائض

اسلام کی مقدس شریعت میں، جو فیصلہ دینے کے منصب پر فائز ہو، اس کے لئے مندرجہ ذیل فرائض کا انجام دینا ضروری ہے:

۱۔ لوگوں کے ایک دوسرے کے خلاف دعووں کے بارے میں فقہ کی کتابوں میں موجود قوانین کے مطابق فیصلہ دینا۔

۲۔ یتیموں اور دیوانوں کی سرپرستی کرنا، اگر ان کے باپ یا دادا نے ان کے لئے کوئی سرپرست معین نہ کیا ہو۔

۳۔ عمومی اوقاف اور مجہول المالک اموال کی حفاظت کرنا۔

٤۔ احمقوں کے مال کی دیکھ بھال کرنا۔

٥۔ دیوانہ پن اور مفلس ہونے کا حکم جاری کرنا اور حکم جاری کرنے کے بعد مفلس کے مال کی حفاظت کرنا۔

٦۔ خیانت کرنے کی صورت میں وصی کو بدل دینا۔

۷۔وصی کے ساتھ ایک امین کو بھی رکھنا، جب وصی اکیلے ہی ذمہ داری کو نبھا نہ سکے۔

۸۔اگر کوئی اپنا قرض ادا نہ کر سکے تو اسے مہلت دینا۔

۹۔ممکن ہونے کے باوجود واجب نفقہ دینے سے اجتناب کرنے والوں پر ذمہ داری عائد کرنا۔

۱۰۔اس کے حوالہ کئے گئے اسناد اور امانتوں کا تحفظ کرنا۔

۱۱۔شرعی حدود جاری کرنا۔

۱۲۔شرعاً معین شدہ افراد کو جیل بھیجنے کا حکم جاری کرنا۔

فیصلہ کرنے کی اہمیت

اسلام میں قاضی کے لئے معین کئے گئے فرائض کی تحقیقات سے فیصلہ کرنے کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اسی لئے قاضی اپنے فیصلہ میں جذبات سے کام نہیں لے سکتا ہے اور رشوت لینے کا، یہاں تک کہ برحق افراد سے بھی، سخت منع کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ اسے ان افراد کے درمیان فرق نہیں کرنا چاہیے جو اس کے پاس رجوع کرتے ہیں۔

امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام مالک اشتر کے نام لکھے گئے ایک حکم نامہ میں فیصلہ کے بارے میں فرماتے ہیں:

لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لئے ایک ایسے شخص کا انتخاب کرنا جو دعویٰ دائر کرنے والوں کے رجوع کرنے سے تھک کر دل تنگ نہ ہو جائے اور کاموں کی رسیدگی میں مکمل طور

پرصبر وتحمل کا مظاہرہ کرتا ہواورامور کے بارے میں فیصلہ دینااس کے لئے مشکل نہ ہو۔دعوی ،کرنے والے اسے خوار اور حقیر نہ سمجھیں امور کے مشکلات کے بارے میں تحقیقات اور دقت کرے اور کسی کام کو سرسری طور پر انجام نہ دے،اگر کیس اس کے لئے واضح ہے تو لوگوں کی چاپلوسی ،دھمکی اور طمع و لالچ دلانے کے اثر میں نہ آئے اور حکم الہیٰ کو کسی شک وشبہہ کے بغیر اظہار کر کے نافذ کرے اور لوگوں کے مال پر طمع کرنے سے پرہیز کرے، چونکہ اس قسم کے لوگ کم پائے جاتے ہیں اسلئے ان کی اہم اور سنجیدہ ذمہ داری کے پیش نظر مناسب تنخواہ معین کرے تا کہ وہ اپنی آبرومندانہ زندگی میں دوسروں کے محتاج نہ رہیں اور رشوت لینے کے لئے کوئی بہانہ باقی نہ رہے اور انھیں فیصلہ سنانے کی آزادی دینا تا کہ دوسروں کی بد گوئی اور چالبازیوں سے محفوظ رہیں۔

گواہی

مرد اور عورت کی گواہی

جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا کہ استدلال کی قدرت مرد میں اور جذبات کی قدرت عورت میں زیادہ ہوتی ہے،اس لئے اسلام میں دوعورتوں کی شہادت ایک مرد کی شہادت کے برابر ہے ۔خدائے متعال اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے:

(...واستشہد وا شہیدین من رجالکم فان لم یکونا رجلین فرجل ومراتان ممّن ترضون من

الشُّہداء ان تضلّ احدٰ ہما فتذ کر احدٰ ہما الاخری...)(بقرہ ۲۸۲)

...اور اپنے مردوں میں سے دو گواہ بناؤ اور دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں تا کہ ایک بہکنے لگے تو دوسری یاد دلا دے۔

گواہی کے کلیات

تنہا وہ عام راستہ کہ جس کے ذریعہ تمام حالات میں حوادث پر قابو پایا جا سکتا ہے، گواہی کو برداشت کرنا اور اس کو انجام دینا ہے اور دوسرے وسائل جیسے لکھنا اور فنی وسائل جو حوادث کو ضبط کرنے اور شکل و اعتراف کو استحکام بخشنے کے لئے فراہم کئے گئے ہیں، عام نہیں ہیں اور انسان کے اختیار میں نہیں ہیں۔

اس لئے، اسلام نے اس بہت سادہ اور طبیعی وسیلہ کو اہمیت دی ہے اور حکم دیا ہے کہ لوگ اس راستہ سے حوادث پر قابو حاصل کریں اور ضرورت کے وقت گواہی دیں۔

گواہ کی شرائط

۱۔ بالغ ہو، اس بنا پر نابالغ بچے کی گواہی قبول نہیں ہے،صرف جو بچہ دس سال کی عمر تک پہنچا ہو، اگر اس نے گناہ نہ کیا ہو، تو وہ زخم لگانے کے بارے میں گواہی دے سکتا ہے۔

۲۔ دیوانہ اور احمق نہ ہو۔

۳۔ مسلمان ہو، لیکن اگر وصیت کرتے وقت مسلمان گواہ تک رسائی ممکن نہ ہو تو کافر ذمی (اہل

کتاب جو اسلام کی پناہ میں ہو) کی گواہی قابل قبول ہے۔

٤۔ عادل ہو، پس فاسق اور جھوٹی گواہی دینے والے کی گواہی قبول نہیں ہے مگر یہ کہ وہ توبہ کرکے اس پر ثابت قدم رہے۔

٥۔ حلال زادہ ہو، اس لحاظ سے حرام زادہ کی گواہی قابل قبول نہیں ہے۔

٦۔ اس پر الزام نہ ہو، اس بنا پر اس شخص کی گواہی پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا ہے جو دعوے کے موضوع میں غرضمند ہو۔

٧۔ یقین رکھتا ہو، اس بنا پر جو حدس و یقین حس کے طریقہ سے حاصل نہ ہوا ہو، اس پر گواہی نہیں دی جا سکتی ہے اور اگر جھوٹی گواہی کی وجہ سے کسی کے نقصان میں کوئی حکم جاری ہوا ہو، تو گواہ ضامن ہے اور اس کی تنبیہ کی جانی چاہیئے اور اس کے جھوٹ کو بھی لوگوں میں اعلان کرنا چاہیئے۔

اقرار

اقرار کی اہمیت

معاشرے میں پامال اور ضائع ہونے والے حقوق کو زندہ کرنے کے بارے میں اقرار کی اہمیت محتاج بیان نہیں ہے۔ کیونکہ عدلیہ جس کا کام انتہائی تلاش و کوشش، دلائل کو جمع کرنے کے لئے محنت و مشقت، قرائن، گواہوں کی گواہی اور حدس و اندازہ سے انجام دیتی ہے، اسے اقرار کے ذریعہ آسان ترین اور واضح ترین صورت میں دو جملوں میں انجام دیا جاتا ہے۔

اسلام میں انفرادی نقطہ نظر سے بھی اقرار کی بہت اہمیت ہے، کیونکہ اقرار کا سرچشمہ وہ فطرت ہے کہ اسلام کی تمام سعی وکوشش اس کو زندہ کرنے اور اسے عملی جامہ پہنانے میں صرف ہوتی ہے اور وہ ایک ایسے انسان کی حق پرستی کی فطرت ہے جس کے مقابلہ میں ہواوہوس پرستی قرار پائی ہے۔

خدائے متعال اپنے کلام پاک میں پیرواں اسلام سے مخاطب ہوکر فرماتا ہے:

(یا ایّھا الّذین آمنوا کونوا قوّامین بالقسط شھداء للّٰہ و لو علی انفسکم او الوالدین و الاقربین) (نساء۱۳۵)

اے ایمان والو! عدل وانصاف کے ساتھ قیام کرواور اللہ کے لئے گواہ بنو چاہے اپنی ذات یا اپنے والدین اوراقرباہی کے خلاف کیوں نہ ہو...

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

حق بات کہوا گر چہ اپنے نقصان میں ہو۔(۱)

....

۱۔میزان الحکمۃ ،ج۲،ص۴٦۸۔

اقرار کے معنی اور اس کی شرائط

اقرار شرع وشریعت میں ایک ایسا قول ہے کہ کہنے والا دوسرے کا حق اپنے اوپر ثابت کرتا ہے، جیسے کہتا ہے: میں ایک ہزار روپئے کا فلاں شخص کا مقروض ہوں۔

اقرار کرنے والے کے لئے بالغ ، عاقل اور صاحب اختیار ہونا شرط ہے، اس بناء پر بچہ، دیوانہ،مست ، بیہوش،سوئے ہوئے اور مجبور شخص کا اقرار صحیح نہیں ہے۔

شفعہ

اگر دو آدمی، دو گھر یا کسی اور ملکیت کے مشترک مالک ہوں اور ان میں سے ایک اپنے حصہ کو کسی تیسرے شخص کے ہاتھ بیچ دے،تو اس کا دوسرا شریک حق رکھتا ہے کہ اسی عقد اور اسی قیمت پر اس کے حصہ کو لے لے،اس حق کو شفعہ کہتے ہیں۔

واضح ہے کہ اسلام میں یہ حق کمپنیوں کے تسویہ اور شرکاء کے تصرفات کی وجہ سے رونما ہونے والے نقصانات اور خرابیوں کو دور کرنے کے لئے وضع کیا گیا ہے۔اکثر یہ اتفاق پیش آتا ہے کہ ملکیت میں تازہ شریک کے تسلط سے صاحب شفعہ کو نقصان پہنچتا ہے، یا سلیقوں میں اختلاف کی وجہ سے اختلافات اور کشیدگیوں کا ایک سلسلہ وجود میں آتا ہے، یا مالکیت میں آزادی (صاحب شفعہ) شریک کے لئے کوئی فائدہ رکھتی ہو بغیر اس کے کہ بیچنے والے شریک کے لئے کوئی نقصان ہو۔

شفعہ،زمین،گھر،باغ اور دیگر غیر منقولہ اموال کے لئے ثابت ہے اور منقولہ اموال میں شفعہ نہیں ہے۔

مرد اور عورت کا طبقہ

خالق کائنات نے نوع بشر کو دوسرے جاندار مخلوقات کے مانند نر و مادہ میں تقسیم کیا ہے اور اس طرح اس نوع کی بقاء کا تنہا ضامن تناسل و توالد کا سلسلہ جاری رکھا ہے۔

مرد اور عورت، اس کے باوجود کہ نسل پھیلانے کے لئے دو مختلف نظاموں سے مسلح ہیں، ان میں سے ہر ایک ،ایک انسان کی مکمل فطری توانائیاں رکھتا ہے اور یہ انسان کی ذاتی خصوصیتوں میں بھی برابر ہیں۔ان دونوں صنفوں کی تنہا خصوصیت جو سماج میں جداگانہ امتیازات کا سرچشمہ ہوسکتی ہے، وہ یہ ہے کہ:

مرد کی صنف میں غور وخوض کی خاصیت زیادہ قوی ہوتی ہے اور عورت کی صنف میں جذبات اور ہمدردیاں زیادہ ہوتی ہیں۔اور انہی خصوصیات کی وجہ سے، معاشرے میں ان دونوں میں سے ہر ایک نے مخصوص فرائض کو اپنے ذمہ لیکر معاشرہ کو چلاتے ہیں۔اگر یہ اپنی ذمہ داریوں سے ہاتھ کھینچ لیں تو معاشرہ ٹھپ ہوکر رہ جائے گا۔

اسلام نے جو احکام ان دو صنفوں کے لئے وضع کئے ہیں، ان میں کلی طور پر ہر ایک کی صفتوں اور خصوصیتوں کو مدنظر رکھا گیا ہے اور مشترک قوانین میں اسی نوعی اشتراک کو مدنظر رکھ کر ان دونوں صنفوں کو حتی الامکان نزدیک لایا گیا ہے۔

یہ جاننے کے لئے کہ اسلام نے اپنی حقیقت بینی کی بنا پر، ان دو صنفوں کے اختلافات کو دور کرنے کے لئے کیسے موثر قدم اٹھائے ہیں اور بالخصوص عورتوں کے حالات میں بہتری اور آسودگی لانے کے لئے کیسے قوانین بنائے ہیں، ہمیں اسلام سے قبل عورتوں کے عام

حالات سے آگاہ ہونا چاہیے اور اس سلسلہ میں ایک تحقیق کریں اور ماضی کے ترقی یافتہ اورغیر ترقی یافتہ معاشروں میں جو برتاؤ عورتوں کے ساتھ ہوتا تھا اسے مدنظر رکھیں پھر عورتوں کے بارے میں اسلام کے وضع کئے گئے قوانین کی تحقیق کریں۔

اسلام سے پہلے معاشرے میں عورت

الف: قبائلی معاشرے میں عورت

قدیم ملتوں میں جب ان کا طرز زندگی قانونی یا دینی نہیں تھا اورصرف قومی آداب ورسوم کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے،تو عورت،انسان شمار نہیں ہوتی تھی بلکہ اس کے ساتھ ایک پالتو جانور جیسا سلوک کیا جاتا تھا۔

انسان جب آغاز سے پالتو جانوروں کو یکے بعد دیگرے اپنا اسیر بنا کر ان کی تعلیم وتربیت کرتا تھا،ان کی حفاظت اوران کی زندگی کے لئے بے پناہ محنت کرتا اور رنج وتکلیف اٹھاتا تھا،تو یہ سب اسلئے نہیں تھا کہ انھیں انسانیت کی حیثیت سے پہچانے یا انھیں اپنے معاشرے کا ایک عضو قرار دے اوران کے لئے کچھ حقوق کا قائل ہو جائے ، بلکہ وہ ان کے گوشت ،کھال،اون،دودھ،سواری،سامان ڈھونے اوردیگر فوائد سے بہرہ مند ہونے کے لئے تھا۔

اس لئے ان جانوروں کی بقاء اورزندگی کے لئے ،کچھ وسائل جیسے خوراک اور رہائش وغیرہ فراہم کرتا تھا،لیکن یہ محنت ومشقّت ان کے ساتھ ہمدردی کی بنا پر نہیں ہوتی تھی بلکہ اپنے

فائدے کے لئے ہوتی تھی۔

انسان ان جانوروں کا دفاع کرتا تھا اور اجازت نہیں دیتا تھا کہ کوئی انھیں مار ڈالے یا انھیں اذیت پہنچائے اور اگر کوئی ان پر تجاوز کرتا، تو وہ اس سے انتقام لیتا تھا، لیکن یہ سب اس لئے تھا کہ خود کو ان کا مالک جانتا تھا اور اپنے حقوق کی حفاظت کرنا چاہتا تھا نہ یہ کہ ان حیوانات کے لئے کسی حق کا قائل تھا۔ عورت کو بھی اسی طرح اپنے استفادہ کے لئے چاہتا تھا۔

عورت کی معاشرے میں رکھوالی کرتا تھا اور اس کا دفاع کرتا تھا، جو اس پر تجاوز کرتا اسے سزا دی جاتی تھی، لیکن نہ اس لئے کہ وہ انسان ہے یا معاشرے کا عضو شمار ہوتی ہے یا کسی حق واحترام کی حقدار ہے، بلکہ اس لئے کہ زندہ رہے اور مرد کے جنسی خواہشات کا کھلونا بنی رہے اور اہل خانہ یعنی مردوں کے لئے کھانا پکائے اور تیار کرے، ساحل نشیں قوموں کے لئے مچھلی پکڑے. سامان ڈھوئے، گھر کا کام کرے اور ضرورت کے وقت بالخصوص قحط سالی اور مہمان نوازی کے موقع پر اس کے گوشت سے غذا تیار کی جائے۔

باپ کے گھر میں بھی عورت کی یہی حالت تھی یہاں تک کہ اسے شوہر کے حوالہ کیا جاتا تھا، لیکن نہ اسکے اپنے اختیار وانتخاب سے، بلکہ ماں باپ کے حکم سے وہ بھی ایک قسم کا بیچنا تھا نہ کہ ازدواج عہد و پیمان۔

عورت، باپ کے گھر میں، باپ کے ماتحت اور شوہر کے گھر میں، شوہر کے ماتحت اور اس کی تابع ہوتی تھی اور ہر حالت میں صاحب خانہ کے زیر نظر اور اسکی مرضی کے مطابق زندگی گزارتی تھی۔

صاحب خانہ اسے بیچ سکتا تھا یا اسے کسی کو بخش سکتا تھا یا دوسرے مقاصد کے لئے جیسے عیاشی یا بچہ پیدا کرنے یا خدمت کرنے کے لئے عاریت، قرض یا کرایہ پر دوسروں کو دے سکتا تھا اگر اس سے کبھی کوئی غلطی سرزد ہوتی تو اسے ہر طرح کی سزا دینے کا حق تھا، یہاں تک کہ قتل تک کرسکتا تھا، اور اس کے بارے میں کسی بھی قسم کی ذمّہ داری کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

ب۔ عورت، ترقی یافتہ سلطنتی معاشرے میں

ترقی یافتہ سلطنتی معاشرہ، جیسے، ایران، مصر، ہندوستان اور چین کہ جو وقت کے بادشاہوں کی مرضی پر چلتا تھا اور اسی طرح متمدن معاشرہ جیسے کلدہ، روم اور یونان جہاں کے لوگ قانونی حکومت کی زندگی بسر کرتے تھے، اگر چہ عورت کی حالت دوسرے معاشروں سے بہتر تھی اور کلی طور پر مالکیت سے محروم قرار نہیں دی جاتی تھی، لیکن پھر بھی مکمل آزادی نہیں رکھتی تھی جس گھر میں عورت زندگی گزارتی تھی اس کا سرپرست جیسے باپ، بڑا بھائی یا شوہر اس پر مطلق حکومت کرتا تھا۔ یعنی اسے حق ہوتا تھا کہ جس کے ساتھ چاہے اس کا عقد کرے یا عاریت و کرایہ پر دیدے یا کسی کو بخش دے اور خاص کر (خطا سرزد ہونے پر) اسے قتل کرسکتا تھا یا گھر سے نکال سکتا تھا۔

بعض ملکوں میں عورت فطری رشتہ داری سے محروم تھی اور مرد اپنی محرم عورتوں سے شادی کرسکتا تھا۔

بعض دوسرے ممالک میں، عورت باضابطہ اور قانونی رشتہ دار شمار نہیں ہوتی تھی، اور میراث

کی حقدار نہیں ہوتی تھی۔

بعض جگہوں پر کئی مرد ایک عورت سے شادی کرتے تھے اور زمانہ جاہلیت میں بعض عرب قومیں اپنی بیٹیوں کو زندہ دفناتے تھے، عورت کو منحوس جانتے تھے۔ اگر اس پر کوئی زیادتی اور ظلم ہوتا تو اسے عدالت میں جا کر شکایت کرنے اور اپنا دفاع کرنے کا حق نہیں تھا اور اسے گواہی دینے کا حق بھی نہیں تھا۔

خلاصہ یہ کہ اس معاشرے میں عورت ایک کمزور عضو شمار ہوتی تھی جسے مرد کی سرپرستی میں زندگی بسر کرنا ہوتی تھی۔ اسے ہرگز اپنے ارادہ سے فیصلہ کرنے، کام اور پیشہ کے انتخاب میں آزادی نہیں تھی۔ بلکہ ایک چھوٹے بچے کے مانند تھی جسے بالغ ہونے تک کسی کی سرپرستی میں زندگی بسر کرنا پڑتی ہے فرق صرف یہ تھا کہ یہ عورت کبھی بالغ نہیں ہوتی تھی!

عورت ایک جنگی اسیر کے مانند تھی کہ جب تک آزاد نہ ہو جائے دشمن کی غلامی میں رہتا ہے اور اس کے کام و کوشش سے استفادہ کیا جاتا ہے، اس کے مکر و فریب سے ہوشیار رہتے ہیں، فرق یہ تھا کہ عورت کو اس اسیری سے آزاد ہونے کی کبھی امید نہیں ہوتی تھی۔

ج: عورت دینی معاشرہ میں

دینی معاشروں میں بھی عورت پر جو کچھ دوسرے معاشروں میں گزرتی تھی۔ کوئی خاص فرق نہیں ہوتا تھا اور اس کے لئے کسی قسم کے حق کے قائل نہ تھے۔

یہودیوں کی موجودہ توریت نے عورت کو موت سے زیادہ تلخ بتایا ہے اور کمال سے مایوس شمار

کیا ہے۔
رسول گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پہلے،فرانس میں عیسائی پادریوں کا ایک اجتماع منعقد ہوا،جس میں عیسائی پادریوں نے عورتوں کی حالت پر مفصل بحث وتحقیق کے بعد حکم صادر کیا کہ:
عورت ایک انسان ہے لیکن مرد کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہے۔!
ان تمام معاشروں میں،اولاد باپ کی تابع ہوتی تھی نہ ماں کی اور ان کے نسب کی بنیاد باپ سے تشکیل پاتی تھی نہ ماں سے ،صرف چین اور ہندوستان کی چند جگہوں پر کئی شوہر کرنے کا رواج تھا، بچے ماں کے تابع ہوتے تھے اور ان کے نسب کی بنیاد مائیں تشکیل دیتی تھیں۔

خلاصہ

اسلام سے پہلے، پوری دنیا میں تاریخ کے مختلف ادوار میں انسانی معاشروں میں،عورت کو معاشرے کا ایک سرگرم عضو شمار نہیں کیا جاتا تھا اور وہ استقلال وآزادی کی مستحق نہیں تھی اور ہمیشہ ایک کمزور اور محکوم مخلوق شمار ہوتی تھی اور وہ خود بھی زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنی انسانی خصلتوں کو کھو کر کے اپنے لئے کسی قسم کی اجتماعی شخصیت کو تصور نہیں کرسکتی تھی۔
لفظ عورت ذلت،خواری،پستی اور بیوقوفی کے معنی دیتا تھا۔ ہر زبان کے ادبیات کے نظم ونثر میں عورت کے بارے میں بہت سی ناشایستہ باتیں اور خرافات پائے جاتے ہیں جو ماضی کے معاشروں میں عورت کے بارے میں روا رکھے جانے والے نظریہ کی عکاسی کرتے ہیں۔

عورت کے بارے میں اسلام کا نظریہ

جس دن اسلام کا سورج بشریت کے افق پر طلوع ہوا، اس وقت عورت کی سماجی حالت وہی تھی جو خلاصہ کے طور پر بیان کی گئی۔

اس زمانہ کی دنیا میں عورت کے بارے میں چند غلط اور خرافات پر مشتمل افکار اور ظالمانہ طرز عمل کے علاوہ کچھ نہیں تھا. لوگ (حتی خود عورت کا طبقہ) عورت کے لئے کسی مقام یا حق کے قائل نہیں تھے اور اسے ایک پست مخلوق سمجھتے تھے جو شریف انسان (مرد) کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہے۔

اسلام نے پوری طاقت کے ساتھ ان افکار کی مخالفت کی اور عورت کے لئے حسب ذیل حقوق مقرر فرمائے:

۱۔ عورت ایک حقیقی انسان ہے اور انسان کے نر و مادہ جوڑے سے پیدا کی گئی ہے اور انسان کی ذاتی خصوصیات کی حامل ہے اور انسانیت کے مفہوم میں مرد کو اس پر کوئی امتیاز حاصل نہیں ہے۔ خدائے متعال اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے:

(یاَیّھا النّاس اِنّا خلقنکم من ذکرٍ و انثی...) (حجرات ۱۳)

انسانو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے...

کئی دوسری آیتوں میں فرماتا ہے:

(بعضکم من بعض) (آل عمران ۱۹۵)

تم سب ہم جنس ہو

۲۔عورت ،مرد کے مانند معاشرہ کا عضو ہے اور قانونی شخصیت کی مالک ہے۔

۳۔عورت چونکہ فطری رشتہ دار ہے اسلئے سرکاری اور قانونی طور پر بھی رشتہ دار ہے۔

٤۔بیٹی ،اولاد ہے جس طرح بیٹا اولاد ہے،اسلئے بیٹیاں ،بیٹوں کی طرح اولاد ہیں ،اس لحاظ سے عورت بھی مرد کی طرح اپنے سببی اور نسبی رشتہ داروں جیسے باپ اور ماں سے میراث پاتی ہے۔

٥۔عورت فکری آزادی کی مالک ہے اور اپنی زندگی میں ہر قسم کا فیصلہ کرسکتی ہے اور شرعی حدود میں اپنی مرضی کے مطابق اپنے لئے شوہر منتخب کرسکتی ہے اور باپ یا شوہر کی ولایت اور سرپرستی میں رہے بغیر آزادی کے ساتھ زندگی گزارسکتی ہے اور ہر جائز پیشہ کو منتخب کرسکتی ہے۔
عورت عمل کے میدان میں مستقل ہے اور اس کا کام اور کوشش محترم ہے اور وہ مالک بن سکتی ہے اور اپنی دولت وثروت کو مرد کی سرپرستی اور مداخلت کے بغیر تصرف کرسکتی ہے اور اپنے انفرادی واجتماعی مال اور حقوق کا دفاع کرسکتی ہے اور دوسروں کے حق میں یا خلاف گواہی دے سکتی ہے۔وہ جنسی آمیزش کے مسئلہ کے علاوہ (جس میں ازدواجی زندگی کے معاہدہ کے مطابق اپنے شوہر کی اطاعت کرنا ضروری ہے)اپنے شوہر کے لئے کوئی دوسرا کام انجام دے تو وہ قابل قدر ہے۔

٦۔مرد کو عورت پر حکم چلانے اور ظلم کرنے کا کوئی حق نہیں ہے اور ہر ظلم جو مردوں کے بارے میں مقدمہ چلا کر قابل سزا ہے وہ عورتوں کے بارے میں بھی مقدمہ چلانے اور سزادینے کے

قابل ہے۔

۷۔عورت معنوی دینی شخصیت کی مالک ہے اوراخروی سعادت سے محروم نہیں ہے،وہ وایسی نہیں ہے جیسا کہ اکثرادیان اورمذاہب عورت کو ایک شیطان کے مانند،رحمت خداوندی سے مایوس تصور کرتے ہیں۔

خدائے متعال اپنے پاک کلام میں فرماتاہے:

(من عمل صٰلحاً من ذکر او انثی و هو مؤمن فلنحیینّه حیٰوة طیّبة ولنجزینّهم اجرهم بأحسنِ ما کانوا یعملون) (نحل۹۷)

جوشخص بھی نیک عمل کرے گا وہ مرد ہو یاعورت بشرطیکہ صاحب ایمان ہو ہم اسے پاکیزہ حیات عطا کریں گے اورانھیں ان اعمال سے بہتر جزادیں گے جو وہ زندگی میں انجام دے رہے ہیں

(...انّی لااضیع عملَ عامل منکم من ذکر اوانثی...)

(آل عمران ۱۹۵)

میں تم میں سے کسی بھی عمل کرنے والے کے عمل کوضائع نہیں کروں گا چاہے وہ مرد ہو یاعورت...

درج ذیل آیہ شریفہ کے مطابق ممکن ہے ایک عورت تقوی اوردین کی بدولت ہزاروں مردوں پرامتیازاورفوقیت حاصل کرے:

(یاایّہا النّاس انّا خلقنٰکم من ذکر وانثیٰ وجعلنٰکم شعوباً وقبائل لتعارفوا انّ اکرمکم عند اللہ اتقٰکم ...)

(حجرات ۱۳)

انسانو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور پھر تم میں شاخیں اور قبیلے قرار دیئے ہیں تا کہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بیشک تم میں سے خدا کے نزدیک زیادہ محترم وہی ہے جو زیادہ پرہیز گار رہے...

نکاح

(ازدواج)

نکاح کے مسائل اور احکام

اسلامی تعلیمات میں نکاح اور ازدواجی زندگی کے موضوع کو کافی اہمیت دی گئی ہے۔ اس کی اہمیت اس حد تک ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

نکاح میری سنت ہے اور جو بھی میری سنت پر عمل نہ کرے، اسے اپنے آپ کو مجھ سے نسبت نہیں دینی چاہیئے اور وہ اپنے آپ کو مسلمان شمار نہ کرے۔(۱)

نکاح کے احکام

دین اسلام میں نکاح کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ دائمی نکاح: یہ وہ نکاح ہے کہ عقد جاری ہونے کے فوراًبعد میاں بیوی کا رشتہ ہمیشہ کے لئے برقرار ہوجا تا ہے۔ یہ رشتہ صرف طلاق کے ذریعہ توڑا جاسکتا ہے۔اس ازدواج میں مرد کومہر کے علاوہ بیوی کی حیثیت کے مطابق اس کی زندگی کے اخراجات ادا کرنے ہوتے ہیں اورکم ازکم چارراتوں میں سے ایک رات کواس کے ساتھ گذارے

....

۱۔بحارالانوار.ج ۱۰۳،ص۲۲۰ ح ۲۳۔

بیوی اس سلسلہ میں شوہر کے تقاضا کومسترد نہیں کرسکتی ہے۔

۲۔موقت نکاح جسے متعہ کہا جا تا ہے۔یہ نکاح،ایک محدوداور معین مدت کے لئے میاں بیوی کے درمیاں رابطہ کو پیدا کرتا ہےاور جوں ہی مدت ختم ہوئی یامرد نے باقی مدت کوبخش دیا تو طلاق کے بغیر میاں بیوی کا رشتہ ٹوٹ جا تا ہے۔

اس ازدواج میں نکاح دائم کے احکام میں سے کوئی حکم نہیں پایا جا تا ہے،مگر یہ کہ عقد کے وقت شرط کی گئی ہو۔

نوٹ

نکاح موقت متعہ اسلام میں جائز ہےاور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں رائج تھا ،یہاں تک کہ دوسرے خلیفہ نے بعض وجوہات کی بنا پراس پر پابندی لگادی،اس لئے اہل سنت اسے جائزنہیں جانتے،لیکن شیعوں کے نزدیک جائز ہےاوراسے اسلام کے شاہکاروں

میں سے ایک جانتے ہیں، کیونکہ معاشرے کی ضرورتوں کے ایک اہم حصہ کو۔ جس کو دوسرے راستہ سے روکنا ممکن نہیں ہے دور کرتا ہے اور عمومی عفت کا بہترین حامی اور ضامن ہے۔

امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

اگر موقت نکاح کو ممنوع نہ قرار دیا گیا ہوتا تو شقی اور بد بخت کے علاوہ کوئی زنا نہ کرتا (۱)

....

۱۔ وسائل الشیعہ، ج۱٤، ص٤٣٦، باب متعہ۔

جن کے ساتھ نکاح کرنا حرام ہے

اسلام میں بعض عورتوں کے ساتھ رشتہ داری اور نسبی رشتہ کی وجہ سے نکاح کرنا حرام اور ممنوع ہے، اور وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ ماں، دادی، نانی اور جتنا سلسلہ اوپر چلا جائے۔

۲۔ بیٹی، نواسی اور جتنا سلسلہ نیچے چلا جائے۔

۳۔ پوتی اور جتنا سلسلہ نیچے چلا جائے۔

٤۔ بہن، بھانجی اور جتنا سلسلہ نیچے چلا جائے۔

٥۔ بھتیجی، بھتیجی کی بیٹی اور جتنا سلسلہ نیچے چلا جائے۔

٦۔ پھوپھی

۷۔ خالہ

نوٹ

جوعورتیں نسبی رشتہ کی وجہ سے مرد پرحرام ہیں وہی عورتیں ایک شیرخوار بچہ کو دودھ پلانے سے حرام ہوجاتی ہیں۔

بعض عورتیں سببی رشتہ (دامادی) کی وجہ سے مرد پرحرام ہوجاتی ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ بیوی کی ماں اوراسکی دادی ونانی اورجتنا سلسلہ اوپر چلا جائے۔
۲۔ بیوی کی بیٹیاں، اگرمرد نے اس بیوی سے ہمبستری کی ہو۔
۳۔ باپ کی بیوی، اگرچہ باپ نے اس کے ساتھ ہمبستری بھی نہ کی ہو۔
٤۔ بیٹے کی بیوی، اگرچہ بیٹے نے اس کے ساتھ ہمبستری بھی نہ کی ہو۔

٥۔ بیوی کی بہن۔ جب تک بیوی زندہ اورمرد کے عقد میں ہو۔
٦۔ بیوی کی بھتیجی اور بھانجی، جبکہ بیوی سے اجازت نہ لی ہو،لیکن بیوی کی اجازت سے حرام نہیں ہیں۔بعض عورتیں دوسرے وجوہات سے مرد پرحرام ہوجاتی ہیں:
۱۔شادی شدہ عورت۔
۲۔ پانچویں عورت،جس مرد کے چاردائمی عقد والی بیویاں ہوں۔

۳۔ کافر عورت، لیکن یہودی اور عیسائی کے مانند اہل کتاب ہو تو اس کے ساتھ موقت عقد کیا جا سکتا ہے۔

عقد کا ولی

دین اسلام میں، مرد اور عورت اگر بالغ ہوں تو اپنا شریک حیات انتخاب کرنے میں آزاد و مستقل ہیں۔ لیکن نابالغ بیٹی اور بیٹے کے ولی ان کے باپ ہیں، اس معنی میں کہ باپ اپنی نابالغ بیٹی کا عقد کسی لڑکے سے کر سکتا ہے اور اپنے نابالغ بیٹے کا عقد کسی لڑکی سے کر سکتا ہے۔

اولاد کے حقوق اور تبعیت

۱۔ اگر شادی شدہ عورت، سے کوئی بچہ پیدا ہو تو یہ بچہ اس کے شوہر کا ہے، چنانچہ وہ بچہ دائمی بیوی ہو تو شوہر اپنا بچہ ہونے سے انکار نہیں کر سکتا ہے۔

۲۔ اگر بچہ اپنی زندگی کا خرچ پورا نہ کر سکتا ہو، تو اسکے ماں باپ کو اس کے اخراجات کو پورا کرنا چاہئے اور چنانچہ ماں باپ اپنے اخراجات پورے نہ کر سکتے ہوں تو ان کے اخراجات ان کے فرزند کے ذمہ ہیں۔

اسلام میں متعدد بیویاں

شریعت اسلام کے مسلمات میں سے ہے کہ مرد ایک ساتھ چار بیویاں رکھ سکتا ہے۔اس حکم کے فلسفہ کو سمجھنے کے لئے درج ذیل نکات پر توجہ کرنا ضروری ہے:

۱۔یہ حکم، اختیاری احکام میں سے ہے اور واجبی وحتمی حکم نہیں ہے، یعنی مسلمان مرد پر واجب نہیں ہے کہ چار بیویاں رکھے بلکہ ایک ہی وقت میں دو یا تین یا چار بیویاں رکھ سکتا ہے۔

اس کے علاوہ، چونکہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے میں شرط یہ ہے کہ ان کے درمیان عدالت کی رعایت کرے اور یہ کام بہت مشکل ہے اور ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔اس لئے اس کام کے لئے قدم اٹھانا اپنے لئے استثناء حالت پیدا کرنا ہے۔

۲۔بشر کی ضرورتوں میں سے ایک تناسل وتوالد اور آبادی بڑھانا ہے۔خالق کائنات نے اسی غرض سے انسان کو مرد اور عورت میں تقسیم کیا ہے.اسلام بھی چونکہ دین فطرت ہے اس لئے اس نے انسان کی ضرورتوں کو مدنظر رکھا ہے اسی لئے ازدواج کا حکم دیا ہے اور چونکہ مرد اور عورت میں تناسل اور توالد صلاحیت کے لحاظ سے، فرق ہے، اس لئے متعدد شادیاں جائز کی ہیں۔

اب ہم اختلاف کی علتیں بیان کرتے ہیں:

الف: کلی طور پر عورت نو سال کی عمر میں ازدواج کی صلاحیت پیدا کرتی ہے جبکہ مرد کے لئے یہ استعداد پندرہ سال میں پیدا ہوتی ہے۔

نتیجہ کے طور پر اگر ہم کسی معین سال کو مدنظر رکھ کر لڑکے اور لڑکیوں کی ولادت کو (اکثرً لڑکیاں

لڑکوں سے زیادہ ہوتی ہیں) درج کریں گے اور بعد والے سالوں کی ولادتوں کو اس پر اضافہ کریں گے تو سولہویں سال ہر لڑکا جواز دواج کی شرعی صلاحیت پیدا کرے گا اس کے مقابلہ میں سات لڑکیاں ازدواج کی صلاحیت پیدا کریں گی۔ اگر لڑکوں کے ازدواج کی عمر جو معمولاً بیس سال سے اوپر ہے، کو مدنظر رکھیں، تو اکیسویں سال میں ہر ایک لڑکے کے مقابلہ میں دو لڑکیاں شادی کے لائق ہوں گی اور پچیسویں سال میں کہ عام طور پر شادی اسی عمر میں کر دی جاتی ہے۔ ہر دس لڑکوں کے مقابلہ میں سولہ لڑکیاں شادی کے لائق ہو جائیں گی۔

ب۔ عورت غالباً پچاس سال کی عمر میں بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت کھو دیتی ہے جبکہ مرد اپنی طبیعی عمر کے آخری دنوں تک یہ صلاحیت رکھتا ہے۔

ج۔ اعداد و شمار کے مطابق نوزاد لڑکوں کی موتیں نوزاد لڑکیوں سے زیادہ ہوتی ہیں اور عورتوں کی اوسط عمر مردوں کی نسبت زیادہ ہے کیونکہ گوناگوں عوامل کی وجہ سے عورتوں کی نسبت مردوں میں موتیں زیادہ ہوتی ہیں۔ اسی طرح (اعداد و شمار کے مطابق) مرد کی عمر غالباً عورت کی عمر سے کم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرہ میں ہمیشہ بیوہ عورتیں، بیوی کے بغیر مردوں سے زیادہ ہوتی ہیں۔

اس بات کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ اسلامی معاشرے میں متعدد شادیوں کی رسم صدیوں تک باقی تھی اور باوجود اس کے کہ بعض لاابالی اور فاقد عدالت مردوں نے بھی یہ کام انجام دیا ہے ،لیکن کبھی کوئی مشکل یا عورتوں کی کمی کا مسئلہ پیش نہیں آیا ہے۔

کہتے ہیں: چونکہ متعدد شادیوں کا مسئلہ عورت کی فطرت کے خلاف ہے، چوں کہ اس کے جذبات کو مجروح کرتا ہے یہاں تک کہ بعض اوقات اسے انتقام لینے پر مجبور کرتا ہے اور مرد کی زندگی خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔

ایسا سوچنے والوں نے اس حقیقت میں غفلت برتی ہے کیوں کہ مذکورہ مخالفت عادت سے مربوط ہے نہ اسکی فطرت اور طبیعت سے، کیونکہ اگر اس کی بنیاد فطرت پر ہوتی تو متعدد شادیوں کا کام عملاً کبھی واقع ہی نہ ہوتا۔ کیونکہ جو عورتیں کسی مرد کی دوسری، تیسری یا چوتھی بیوی بنتی ہیں، وہ عورتوں کے اسی طبقہ سے تعلق رکھتی ہیں جو کہ اپنی مرضی اور رغبت سے شادی شدہ کسی مرد سے شادی کرنے پر آمادہ ہوتی ہیں۔ اگر یہ کام انکی فطری اور طبیعی جذبات کے خلاف ہوتا، تو ہرگز ایسی چیز کو قبول نہ کرتیں، چنانچہ اگر ازدواج میں کسی عورت سے یہ شرط کی جائے کہ اسے تنہا زندگی گزارنا ہوگی اور کسی سے بات نہیں کرے گی، تو چونکہ یہ کام اسکی فطرت کے خلاف ہے، اس لئے ہرگز وہ اس شرط کو قبول نہیں کرے گی۔

اسکے علاوہ دین اسلام میں اس مشکل کو حل کرنے کے لئے ایک راستہ موجود ہے، وہ یہ کہ عورت ازدواج کے وقت، عقد لازم کے ضمن میں شرط رکھ سکتی ہے کہ اس کا شوہر دوسری شادی نہ کرے اور اس طرح اس کا سدباب کر سکتی ہے۔

اولاد کی میراث کا مسئلہ بھی دوسری صورت میں منظم کیا جا سکتا ہے، مثلاً حکومت کو مرد کا وارث قرار دیں اور معاشرے کے فرزندوں اور نوزاد بچوں کی تربیت حکومت کے ذمہ چھوڑ کر بچوں کو پرورش گاہ اور نرسریوں میں پالا جائے۔

اگر چہ یہ طریقہ انسانی معاشروں میں استثنائی طور پر انجام پاتا ہے ،لیکن ایک ناقابل تغیر قانون کی حیثیت سے جاری رہنے کی ہرگز صلاحیت نہیں رکھتا، کیونکہ، یہ طرز عمل،مختصر زمانہ میں ،انسانی جذبات،غمخواری،مہر ومحبت اورقوی خاندانی ہمدردی۔جونسل کی ایجاد کے لئے انسان کا اصلی محرک ہے کونابود کرکے رکھدیتاہے اورنتیجہ کے طور پرنسل بڑھانے کے موضوع کولوگوں میں خاص کرعورتوں میں کہ واقعاً ایام حمل کے دوران ناقابل برداشت تکلیفیں اٹھاتی ہیں ایک بیہودہ عمل دکھاتا ہے اورمہر ومحبت والے خاندان کوایک تاریک زندان میں تبدیل کردیتاہے۔

ایسے حالات کے رونماہونے کی وجہ سے تناسل وتوالدکاراستہ بالکل بندہوجاتا ہے اورخاندان جوحقیقت میں شہری معاشرہ کوتشکیل دیتاہے نابودہوکررہ جاتاہے،اورخاندان کی تشکیل اورتناسل وتوالدفنی وسائل اورسیاسی فریب کاریوں کے ذریعہ انجام پاتے ہیں،جیسے بچہ پیداکرنے والوں کے لئے بڑے بڑے انعامات کااعلان کرنایاسخت قوانین نافذ کرناوغیرہ ۔بدیہی ہے کہ اس قسم کی حالت،جوفطرت کے ساتھ ساز گارنہیں ہوتی، پائدارنہیں ہے۔

اس کے علاوہ واضح ہے کہ اس صورت میں،انسان کی زندگی ایک وحشتناک شکل میں تبدیل ہوکرخشک وبےلذت ہوگی اورحقیقت میں،انسان کی زندگی کاماحول مویشیوں سے زیادہ پست اوردرندوں کے ماحول سے زیادہ خطرناک ہوگا۔

طلاق

(میاں بیوی کی جدائی)

میاں بیوی کے شرعی رابطہ کے ختم ہونے کے بعد، ایک دوسرے سے جدا ہوکر ازدواجی حقوق کے قوانین کی پابندی سے آزاد ہونے کو طلاق کہتے ہیں۔

طلاق کا قانون اسلام کا ایک نا قابل انکار امتیاز ہے جو وہ مسیحیت اور چند دیگر ادیان پر رکھتا ہے اور انسانی معاشرے کی ایک ضرورت کو پورا کرتا ہے، کیونکہ بے شمار ایسے مواقع پیش آتے ہیں کہ میاں اور بیوی کے اخلاق آپس میں سازگار نہیں ہوتے اور پیار و محبت کا ماحول ایک میدان جنگ میں تبدیل ہوجاتا ہے اور ان کے درمیان مصالحت ممکن نہیں ہوتی، اس صورت میں اگر میاں بیوی کا رشتہ توڑنے کے قابل نہ ہوتا تو میاں بیوی کو عمر بھر ایک بدبختانہ زندگی گزارنا پڑتی جو کہ درحقیقت ایک شعلہ ور جہنم ہے اور تلخی و محرومیت کے ساتھ نامناسب جسمانی اذیتیں برداشت کرنا پڑتیں اور اس مطلب کی بہترین مثال یہ ہے کہ عیسائی حکومتیں بھی عام ضرورتوں کے پیش نظر آخر کار طلاق کو قانونی حیثیت دینے پر مجبور ہوئیں۔

اسلام میں طلاق کا اختیار مرد کو دیا گیا ہے، البتہ اس حکم میں مرد اور عورت کی فطری حالت کو مدنظر رکھا گیا ہے، کیوں کہ اگر طلاق کا اختیار عورت کے ہاتھ میں ہوتا، چونکہ عورت مرد سے زیادہ جذبات کی اسیر ہوتی ہے، اسلئے میاں بیوی کا رابطہ ہمیشہ کمزور پڑتا اور تشکیل پایا ہوا خاندان متزلزل ہوکر آسانی کے ساتھ بکھر جاتا۔ اسکے باوجود دین اسلام میں ایسی

راہیں موجود ہیں کہ عورت بھی طلاق کے حق سے استفادہ کرسکتی ہے، اپنے شوہر سے معاشرت کے ضمن میں دوراندیشی کے پیش نظر عقد نکاح کے وقت شرط رکھے کہ اگر احتمالی مشکلات میں سے کوئی مشکل پیش آئے تو طلاق جاری کرنے کی وکالت کا حق ہوگا یا یہ شرط رکھے کہ اگر شوہر بلاوجہ اسے طلاق دے تو اس پر اس کے مشکلات کو حل کرنے کی ذمہ داری ہوگی۔

اسلامی شریعت نے اگرچہ طلاق کو قانونی حیثیت دی ہے، لیکن اس کی غیر معمولی اور زبردست مذمت کی ہے اور بہت نصیحت کی ہے کہ اگر مسئلہ اضطرار کی حد تک نہ پہنچے تو مرد اپنی بیوی کو طلاق نہ دے اور ازدواجی رشتہ کو نہ توڑے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

خدائے متعال کے نزدیک ناپسند و منفور ترین چیزوں میں سے ایک طلاق ہے(۱)

اسی لئے اسلام میں طلاق کے لئے چند مشکل قوانین وضع کئے گئے ہیں، جیسے طلاق دو عادل افراد کے سامنے انجام پانا چاہئے اور ان دنوں میں ہو کہ عورت اپنی عادت کے ایام میں نہ ہو اور مرد نے ان دنوں اس سے ہمبستری نہ کی ہو۔

اسی طرح مقرر ہوا ہے کہ اگر طرفین کے درمیان کوئی اختلاف یا نزاع پیدا ہو جائے تو دو افراد کو حُکم قرار دیں تا کہ میاں بیوی کے درمیان مصالحت کرائیں اور صرف اس صورت میں طلاق دی جائے کہ جب مصالحت کی تمام کوششیں ناکام ہو جائیں۔

....

۱۔ وسائل الشیعہ، ج ۱۵ ص ۲۶۶ باب۔

طلاق صحیح ہونے کی شرائط

اپنی بیوی کو طلاق دینے والے مرد میں درج ذیل شرائط ہونی چاہیئے:

۱۔ بالغ ہو۔

۲۔ عاقل ہو۔

۳۔ اپنی اختیار سے طلاق دے۔

٤۔ طلاق دینے کا قصد رکھتا ہو۔

اس بنا پر نابالغ، دیوانہ یا طلاق دینے پر مجبور شخص یا مذاق میں صیغۂ طلاق پڑھنے والے کا طلاق صحیح نہیں ہے۔

٥۔ طلاق کے وقت، عورت خون حیض کو سے پاک ہونا چاہئے اور پاک ہونے کے بعد شوہر نے اس کے ساتھ ہم بستری نہ کی ہو۔

٦۔ طلاق اپنے مخصوص صیغوں میں پڑھا جائے اور دو عادل کے سامنے انجام پائے۔

طلاق کی قسمیں

طلاق کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ طلاق رجعی: یہ وہ طلاق ہے کہ مرد اپنی اس بیوی کو طلاق دے کہ جس کے ساتھ ہم بستری کی ہو۔ اس صورت میں مرد طلاق کا عدہ تمام ہونے سے پہلے رجوع کر کے نئے عقد کے بغیر

ازدواجی رابطہ کو پھر سے برقرار کرسکتا ہے۔

۲۔طلاق بائن: یہ وہ طلاق ہے، کہ جس میں طلاق جاری ہونے کے بعد مرد رجوع کرنے کا حق نہیں رکھتا ہے۔اس کی چند قسمیں ہیں:

الف: عورت کے ساتھ مرد کے ہمبستری ہونے سے پہلے دیا جانے والا طلاق۔

ب: یائسہ عورت کی طلاق، یعنی وہ عورت جس میں بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت موجود نہ ہو۔

ج: اس عورت کی طلاق جس کی عمر ابھی نو سال تمام نہ ہوئی ہو۔

مذکورہ تین قسم کے طلاقوں میں عدہ نہیں ہے۔

د: اس عورت کی طلاق جس کو تین مرتبہ طلاق دی گئی ہو۔اس طلاق میں اس کے علاوہ کہ مرد رجوع نہیں کرسکتا ہے، اسے پھر سے اپنے عقد میں بھی نہیں لاسکتا ہے مگر یہ کہ یہ عورت کسی دوسرے مرد کے عقد دائمی میں آجائے اور اس سے ہم بستری کی جائے پھر وہ مرد اسے طلاق دیدے یا مرجائے تو اس صورت میں عدہ تمام ہونے کے بعد پہلا شوہر اس کے ساتھ پھر سے عقد کرسکتا ہے۔

ھ۔طلاق خلع: اس عورت کی طلاق جو اپنے شوہر کو پسند نہیں کرتی ہے اور اپنا مہر یا کوئی اور مال اسے بخش کر اس سے طلاق حاصل کرے، اس کو خلع کہتے ہیں۔اس طلاق میں جب تک بیوی اپنے شوہر کو بخش دئے گئے مال کا مطالبہ نہ کرے، اس وقت تک مرد رجوع نہیں کرسکتا ہے۔

طلاق مبارات: یہ وہ طلاق ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کو نہ چاہتے ہوں اور بیوی مرد کو

کچھ مال دے اور اس کے مقابلہ میں وہ اسے طلاق دے۔اس طلاق میں بھی جب تک بیوی اپنے ادا کئے ہوئے مال کا مطالبہ نہ کرے،مرد رجوع کرنے کا حق نہیں رکھتا ہے۔

ز۔نواں طلاق:ان شرائط کے ساتھ جو فقہ کی کتابوں میں تفصیل سے بیان ہوئے ہیں،اس طلاق کے بعد عورت مرد پر ہمیشہ کے لئے حرام ہو جاتی ہے اور کسی صورت میں اس کے ساتھ دوبارہ ازدواجی رشتہ برقرار نہیں کرسکتا ہے۔

عدت کے احکام اور اس کی قسمیں

جس عورت نے اپنے شوہر کے ساتھ ہم بستری کی ہو اور ازدواج کے رشتہ کو مستحکم کیا ہو،اگر اس کا شوہر اسے طلاق دیدے،تو اسے ایک معین مدت تک عدہ رکھنا چاہیئے،یعنی اس مدت میں ازدواج کرنے سے پرہیز کرے۔اس کام کے دو اہم نتائج ہیں:

اول یہ کہ:نطفوں کے مخلوط ہونے سے بچایا جاسکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ:ممکن ہے اس مدت کے دوران میاں بیوی اپنی جدائی سے پشیمان ہوکر رجوع کریں۔

عدہ کی مدت کے دوران مرد کو بیوی کے اخراجات کو ادا کرنا چاہیئے اور اسے اپنے گھر سے نہ نکالے ۔اور اگر یہ چوتھی بیوی تھی تو عدہ تمام ہونے تک دوسری عورت سے عقد نہ کرے۔اگر طلاق مرد کی مہلک بیماری کے دوران انجام پائے تو اس کے ایک سال کے

اندرمرنے کی صورت میں بیوی اس کے ترکہ سے میراث لینے کی حقدار ہے۔

عدت کی قسمیں

عدہ کی تین قسمیں:

۱۔حاملہ عورت کا عدہ

۲۔غیر حاملہ عورت کا عدہ

۳۔عدہ وفات

ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔اگر حاملہ عورت کو طلاق دی جائے تو اس کا عدہ بچہ کی پیدائش یا اسکے ساقط ہونے تک ہے۔اس بنا پر اگر طلاق دینے کے ایک گھنٹہ بعد اسکا بچہ پیدا ہوجائے تو وہ دوسرا شوہر کرسکتی ہے۔

۲۔جو عورت حاملہ نہ ہو اور اس کی عمر پورے نو سال ہو یا یائسہ نہ ہو، جبکہ اس کے شوہر نے اس کے ساتھ ہم بستری کی ہو اور حیض کے علاوہ دنوں میں طلاق دی ہو تو اسے اتنا انتظار کرنا چاہئے کہ دو بار حیض دیکھے اور پاک ہوجائے اور جوں ہی تیسرے حیض کو دیکھے گی اس کا عدہ تمام ہوجائے گا۔

۳۔جس عورت کا شوہر مر جائے اور وہ حاملہ نہ ہو تو اسے چار مہینے دس دن عدہ رکھنا

چاہئے۔ اگر حاملہ ہوتو اسے بچے کی پیدائش تک عدہ رکھنا چاہئے لیکن اگر چار مہینے دس دن گزرنے سے پہلے، بچہ پیدا ہو جائے تو اسے اپنے شوہر کے مرنے کے دن سے چار مہینے دس دن تک انتظار کرنا چاہئے اور اسے عدہ وفات کہتے ہیں۔

اسلام میں غلامی

شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سے انسان پیدا ہوا ہے یہ فکر اس کے ہمراہ تھی کہ انسان کو بھی دوسری اشیاء کے مانند اپنی ملکیت قرار دے سکتا ہے۔

قدیم مصر، ھندوستان، ایران، عربستان، روم، یونان، یورپ اور امریکہ کے تمام ممالک میں غلام بنانے کا رواج تھا اور یہ رواج یہودیوں اور عیسائیوں میں بھی عام تھا اسلام نے بھی اس میں کچھ تبدیلیاں لا کر اسے جائز قرار دیا ہے۔

برطانیہ کی حکومت، پہلی حکومت تھی جس نے غلامی کی روش کی مخالفت کی اور ۱۸۳۳ئ میں سرکاری طور پر غلامی کے طرز عمل کو منسوخ کیا۔ اسکے بعد یکے بعد دیگرے دوسرے ممالک نے بھی اس روش کی پیروی کی۔ یہاں تک کہ سنہ ۱۸۹۰ء میں بروکسل میں منعقد ایک مٹینگ میں ایک عمومی قانون کی حیثیت سے غلامی ممنوع قرار دی گئی اور اس طرح دنیا سے غلام کی خرید و فروخت ختم ہوگئی۔

غلام بنانے کے طریقے

ایسا لگتا ہے کہ یہ قدیم رسم انسان میں من مانی اور بے حساب رائج نہیں تھی کہ جو بھی چاہتا کسی دوسرے کو اپنی ملکیت میں لے لیتا، بلکہ غلامی مندرجہ ذیل راہوں میں سے کسی ایک راہ سے انجام پاتی تھی:

۱۔ جنگ و فتح: قدیم الایام سے اگر دو جانی دشمنوں میں سے ایک، دوسرے پر فتح پا کر بعض افراد کو اسیر بناتا تھا، تو وہ ان جنگی اسیروں کے لئے کسی انسانی احترام کا قائل نہیں ہوتا تھا بلکہ اپنے لئے ان کے ساتھ ہر طرح کا برتاؤ کرنے کا حق سمجھتا تھا۔ یعنی قتل کر ڈالے یا بخش دے یا آزاد کرے یا غلاموں کی حیثیت سے اپنے پاس رکھے اور ان سے استفادہ کرے۔

۲۔ تولید و تربیت: خاندان کے باپ، خاندان کے سر پرست ہوتے تھے اور اپنی اولاد کو اجتماعی شخصیت کے مالک نہیں جانتے تھے بلکہ انھیں خاندان کے تابع اور محض اپنی ملکیت سمجھتے تھے اور خود کو ان کے بارے میں ہر قسم کا فیصلہ کرنے کا مستحق سمجھتے تھے۔ اس لحاظ سے ضرورت کے وقت اپنی اولاد کو بیچ دیتے تھے اور اسی اصل کی بنیاد پر کبھی عورتوں کو بھی بیچ دیتے تھے۔

۳۔ طاقت ور لوگ جو اپنے آپ کو دوسروں سے بلند سمجھتے تھے: ایسے افراد اپنے حکم کو لوگوں کا نظم و نسق چلانے میں نافذ العمل جانتے ہوئے انھیں اپنا غلام شمار کرتے تھے۔ یہاں تک

کہ بہت سے قدرتمند بادشاہ اپنے کو خدائی کے قابل جان کر لوگوں کو اپنی پرستش کرنے پر مجبور کرتے تھے، یہ افراد لوگوں کو اپنا غلام بنانے میں مطلق العنان تھے اور اپنے ماتحتوں میں سے جس کو بھی چاہتے، اسے اپنا غلام بناتے تھے۔

غلامی کے بارے میں اسلام کا نظریہ

اسلام نے اپنی اولاد اور عورتوں کو بیچنے کے ذریعہ اور زبردستی اور غنڈہ گردی کے ذریعہ غلام بنانے سے منع کیا ہے۔ اسلام کی نظر میں ہر انسان جو انسانیت کے راستہ پر گامزن ہے اور کم از کم انسانیت کے اصول کا دشمن نہ ہو، وہ آزاد ہے اور کوئی شخص اسے اپنا غلام نہیں بنا سکتا۔
لیکن جو انسانیت کا جانی دشمن ہے اور جان بوجھ کر انسانیت کے اصول کے سامنے تسلیم نہیں ہوتا ہے اور اپنی پوری طاقت سے اسے نابود کرنے پر تلا ہوا ہے، وہ ہرگز انسانی احترام کا مستحق نہیں ہے اور اسے اپنے ارادہ وعمل میں آزاد نہیں ہونا چاہئے اور غلامی اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ انسان کے عمل وارادہ کی آزادی اس سے سلب کی جائے اور دوسرے کا ارادہ اس پر حکومت کرے اسی عالمی اصول پر جو ہمیشہ دنیا والوں کی طرف سے مورد تائید قرار پایا ہے کفار حربی سے لئے گئے جنگی اسیروں کو غلامی، یعنی انھیں ارادہ وعمل کی آزادی سلب کرنے کی سزا دیتا ہے کیونکہ وہ انسانیت کے حقیقی دشمن ہیں۔
اسلام جو سلوک جنگی اسیروں کے ساتھ روا رکھتا تھا، وہ وہی سلوک ہے جسے دوسرے بھی روا رکھتے ہیں۔ جب کوئی ملت جنگ کے بعد فاتح ملت کے سامنے کسی قید وشرط کے بغیر ہتھیار

ڈالتی ہے،تو جب تک ان کے درمیان باقاعدہ صلح برقرار نہ ہوتب تک اسے ارادہ وعمل کی آزادی سے محروم کرنے کی سزادی جاتی ہے۔

ان ملتوں کا اسلام کے ساتھ جوتنہا اختلاف ہے،وہ یہ ہے کہ اسلام اسے غلامی کے نام پر یاد کرتا ہے اور یہ قومیں اس لفظ کو استعمال کرنے سے پہلوتہی کرتی ہیں۔البتہ جس روش کو وہ زندہ اور معاشرے کے لئے راہنما جانتے ہیں اپنی تعلیمات کی بنیاد کو نام گزاری کی بنیاد پر استوار نہیں کرنا چاہیئے۔

اسلام اور دوسرے نظریات کی تحقیق

گزشتہ بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ غلامی کو منسوخ کرنے والی عام قرارداد نے بجائے اس کے کہ اسلام کے کام میں کوئی گرہ لگائے ،ایک گرہ کو کھول دیا ہے۔حقیقت میں یہ قرارداد دین اسلام کے قوانین کی ایک دفعہ کا نفاذ ہے کیونکہ اس طرح عورتوں اور بچوں کو بیچنے کا موضوع ختم ہوا ہے،اور یہ وہی چیز ہے جسے چودہ سو سال پہلے اسلام نے منسوخ کیا تھا۔اسلام نے جنگی اسیروں کی غلامی کا جوراستہ کھلا رکھا ہے،وہ اس لئے ہے کہ انسان کو ہمیشہ اس حکم کی ضرورت ہے،اور یہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔تنہا چیز جسے اسلام نے غلامی کا نام دیا ہے وہ یہی جنگی اسراء ہیں ۔لیکن دوسرے لوگ غلامی کے نام کوزبان پر لائے بغیر عملاً غلامی کی رسم کو مستحکم کررہے ہیں ،اور جواستفادہ صدر اسلام میں مسلمان (جنگی اسیروں)غلاموں سے کرتے تھے وہی استفادہ آج کی حکومتیں جنگی قیدیوں اور جنگ میں شکست کھائی ملتوں سے کرتے ہیں۔

غلاموں کے ساتھ اسلام کا سلوک

اسلامی قوانین کے تحت، اسیر کئے گئے کفار حربی، ممکن ہے مسلمانوں کے سرپرست اور حاکم کے حکم سے آزاد کئے جائیں یا بطور غلام رکھے جائیں۔

جنگ ہوازن میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کئی ہزار عورتوں اور بچوں کو ایک ساتھ آزاد کیا۔ جنگ بنی المصطلق میں مسلمانوں نے کئی ہزار اسیروں کو آزاد کیا۔

اسلام میں، غلام، گھر کے اعضاء کے مانند ہیں، گھر کے دوسرے اعضاء کے ساتھ جیسا سلوک کیا جاتا ہے ویسا ہی برتاؤ ان کے ساتھ بھی کیا جانا چاہئے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غلاموں کے ساتھ بیٹھتے تھے اور ایک ساتھ کھانا کھاتے تھے۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام دو کرُتے خریدتے تھے، ان میں سے بہتر اپنے غلام کو دیتے تھے اور معمولی کرُتے کو خود پہنتے تھے۔

حضرت امام رضا علیہ السلام اپنے غلاموں اور کنیزوں کے ساتھ ایک دسترخوان پر کھانا کھاتے تھے۔

اسلام حکم دیتا ہے کہ غلاموں کے ساتھ مہربانی سے پیش آئیں، ان کے ساتھ سختی نہ کریں، گالیاں نہ دیں اور جسمانی اذیتیں نہ پہنچائیں اور ضرورت کے وقت ان کے ازدواج کے وسائل فراہم کریں یا خود ان کے ساتھ ازدواج کریں۔ خدائے متعال اس سلسلہ میں فرماتا

ہے:

(...بعضکم من بعض...) (نساء ۲۵)

سب ایک پیکر کے اعضاء ہیں

اسلام میں، غلام، اپنے مالک کی اجازت سے یا دوسرے راستہ سے، مالک بن سکتے ہیں اور جس مال کے وہ مالک بن جائیں، آزادی کے بعد ان کے لئے کسی قسم کا ننگ و عار نہیں ہے ، جیسے کہ غلامی کے زمانہ میں بھی نہیں تھا. کیونکہ اسلام میں بزرگی اور فضیلت کا معیار صرف تقویٰ ہے لوگوں میں سب سے زیادہ پرہیز گار شخص کو سب سے بہتر جانتا ہے۔ اسلام کی نظر میں ایک باتقوی غلام ہزار بے تقوی آزاد لوگوں سے بہتر ہے۔

اسلام کی بعض عظیم شخصیتیں جیسے سلمان فارسی اور بلال حبشی آزاد کئے گئے غلام تھے .اسلام نے غلام کو آزاد کرنے کے مسئلہ کو ہمیشہ مدنظر رکھا ہے اور اس کام کے لئے مختلف راستے کھولے ہیں منجملہ جرمانہ اور بعض گناہوں کا کفارہ غلاموں کی آزادی کے لئے قرار دیا ہے، اس کے علاوہ غلاموں کو آزاد کرنے کی بہت تاکید کی گئی ہے اور اسے اہم مستحبات میں قرار دیا ہے تاکہ اس طرح ہر سال بہت سے غلام آزاد ہوکر آزاد معاشرے کے عضو بن سکیں۔

نتیجہ یہ تھا کہ اسلام حتی الامکان غیر اسلامی معاشروں (کفار حربی) سے ایک گروہ کو جنگی اسیروں کی صورت میں پکڑتا تھا اور انھیں حق وعدالت کے معاشرے میں داخل کرتا تھا، ان کی تعلیم وتربیت کرتا تھا، پھر مختلف راستوں سے آزاد کر کے اسلامی معاشرے کا حصہ بناتا تھا

۔

اس لحاظ سے جو شخص بھی جنگی اسیر ہوتا تھا، آزاد ہونے تک غلام رہتا تھا۔ اگر وہ مسلمان ہونے کے فوراًبعد آزاد ہوتا، تو اس صورت میں ممکن تھا ہر اسیر ہونے والا کافر، ظاہراً مسلمان ہوجاتا، اوراس طرح اپنے آپ کو نجات دلاتا اور تھوڑی ہی دیر کے بعد پھر سے اپنی سابقہ حالت کی طرف پلٹ جاتا۔

غصب

جو شخص کسی کے مال کو زبردستی اس سے چھین کر، مالکیت کے اسباب میں سے کسی سبب کے بغیر اسے اپنا مال قرار دے یا کسی دوسرے کے مال پر زبردستی قبضہ کرکے استفادہ کرے ،اگر چہ اسے اپنا مال قرار نہ دے، اس عمل کو شرعاً غصب کہتے ہیں۔

لہذا، تسلط جمانے کے کسی جائز سبب جیسے: بیع، اجارہ اور اجازت کے بغیر کسی دوسرے کے مال پر قبضہ جمانے کو غصب کہتے ہیں۔ یہاں پر معلوم ہوتا ہے کہ غصب، ایک نا مناسب کام ہے جو مالکیت کی خصوصیت کی بنیاد کو پامال کرتا ہے۔جس قدر مالکیت کی خصوصیت کی بنیاد معاشرے کے زندہ اور پائیدار رہنے میں موثر ہے اسی قدر غصب معاشرے کو برباد کرکے اس کی ترقی کو روکتا ہے۔

اگر یہ طے پاجائے کہ معاشرے کے اثر و رسوخ رکھنے والے افراد قانون کی اجازت کے بغیر کمزوروں اوراپنے ماتحتوں کی کمائی پر قبضہ جمائیں تو خصوصیت اور مالکیت اپنے اعتبار کو کھودے گی۔ ہرایک اپنے سے کمزور لوگوں کے خصوصی حقوق کے بارے میں اسی طرز فکر پر

عمل کرے گا اور ماتحت اور کمزور لوگ بھی اپنی محنت و مشقت کی کمائی کی حفاظت کے لئے ہر ممکن اقدام کر کے عزت و شرافت فروشی پر مجبور ہوں گے۔اور نتیجہ میں انسانی معاشرہ غلاموں کے خرید و فروخت کے ایک بازار میں تبدیل ہو کر رہ جائے گا اور قوانین وضوابط اپنے اعتبار سے گر جائیں گے اور ان کی جگہ پر ظلم وستم جانشین ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے غاصب کے لئے سخت قوانین وضع کئے ہیں اور غصب کو گناہ کبیرہ شمار کیا ہے۔

قرآن وسنت کی نص کے مطابق ،شرک کے علاوہ ہر قسم کے گناہ کو خدا کی طرف سے بخش دئے جانے کا احتمال ہے۔اور ہر گناہ حتی شرک بھی توبہ کے ذریعہ قابل عفو و بخشش ہے۔لیکن جس کی زندگی کے ریکارڈ میں دوسروں کے حقوق کے بارے میں غصب اور ظلم وستم درج ہو،تو اس کے لئے کسی بھی صورت میں حقدار سے بخشش حاصل کئے بغیر خدا کی پوچھ گچھ اور سزا سے بچنے کی اُمید نہیں ہے۔

غصب کے بعض احکام

۱۔ غاصب پر واجب فوری ہے کہ غصب کیا گیا مال ، مالک کو لوٹا دے ،اور اگر وہ زندہ نہ ہو تو اسے اس کے وارثوں کے حوالہ کر دے ،اگر چہ اس مال کا واپس کرنا غاصب کے لئے کافی نقصان کا سبب بنے۔مثال کے طور پر کسی کا پتھر یا لوہے کا ایک ٹکڑا غصب کر کے اپنے مکان کی بناء میں نصب کرے جو اس کے لاکھوں برابر قیمت پر تعمیر ہوئی ہو،تو مکان کو گرا کر اس

پتھر اورلوہے کے ٹکڑے کو نکال کراس کے مالک کولوٹادے ،مگر یہ کہ اس کا مالک اس کی قیمت حاصل کرنے پر راضی ہوجائے ۔یااس کے مانند کسی نے دس من گندم غصب کر کے دس خروار جو سے مخلوط کیا ہو،اگر گندم کا مالک اس کی قیمت لینے پر راضی نہ ہوجائے تو اسے عین گندم کو جو سے جدا کر کے مالک کوواپس کرنا چاہئے۔

۲۔اگر غصب کئے گئے مال میں کوئی نقص پیدا ہوجائے ،تو عین مال کوواپس کرنے کے علاوہ نقصان کی تلافی بھی کرنا چاہئے۔

۳۔اگر غضب کیا گیا مال تلف ہوجائے تو اس کی قیمت ادا کی جانی چاہئے۔

٤۔اگر غاصب،غصب کئے گئے مال کے کسی حصہ کو ضائع کردے،تو چاہے اس نے خود اس سے استفادہ نہ کیا ہوتو بھی وہ اس مال کے منافع کا ضامن ہے،جیسے،کسی نے کرایہ کی گاڑی کو غصب کر کے کئی دن تک اسے گیرج میں رکھا ہو۔

اسی طرح اگر غاصب،غصب کئے گئے مال میں اضافہ کردے،جیسے ایک بھیڑ کو غصب کرنے کے بعد اسے اچھی گھاس کھلا کر فربہ بنادے تو اس اضافہ میں کوئی حق نہیں رکھتا ہے البتہ اگر مذکورہ اضافہ منفصل ہو،یعنی ایک زمین کو غصب کر کے اس میں کاشتکاری کر کے زراعت حاصل کرے تو غصب کیا ہوا مال اجرت کے ساتھ مالک کولوٹادے اور زراعت غاصب کی ہوگی۔

لُقطه

جوبھی مال پایا جائے اوراسکا مالک معلوم نہ ہواسے لقطہ کہتے ہیں:

۱۔جو مال پایا جائے اوراس کا مالک معلوم نہ ہو،اگراس کی قیمت ایک مثقال(۱)چاندی سے کم ہو،تواسے اٹھا کرخرچ کیا جاسکتا ہےاوراگراس کی قیمت ایک مثقال چاندی سے زیادہ ہوتواسے نہیں اٹھانا چاہیئے اوراٹھانے کی صورت میں عادی راہوں سے ایک سال تک اس کے مالک کوڈھونڈنا چاہیئے اورمالک کوڈھونڈلینے کی صورت میں اس کے حوالہ کرنا چاہیئے اوراس کا مالک نہ ملاتواس مال کواسکی طرف سےکسی فقیرکوصدقہ دینا چاہیئے۔

۲۔اگرکسی مال کوایک ایسی ویران جگہ میں پایا جائے جس کے باشندے نابود ہوچکے ہوں یاغاراوراس بنجر زمین میں پایا جائے کہ جس کا کوئی مالک نہ ہو۔تو پایا گیا مال پانے والے کا ہے،اوراگرمال ایسی زمین میں ملے جوکسی کی ملکیت ہوتواس کے گزشتہ مالکوں سےدریافت کیا جانا چاہیئے ،اگرانہوں نے اس کو چھپایا ہوتوعلامت ونشانی بتانے کی صورت میں دیا جائے ورنہ یہ مال پانے والے کا ہے۔

....

۱۔تقریباًساڑھےتین گرام۔

بنجر زمینوں کو آباد کرنا

ایسی زمین کو آباد کرنا جس سے استفادہ نہیں ہوتا تھا (خواہ وہ زمین کبھی آباد نہیں تھی، یا کبھی آباد تھی لیکن وہاں کے باشندوں کے معدوم ہونے کی وجہ سے غیر آباد اور بے فائدہ رہی ہو یا مرغ زاروں یا نرسل زاروں کے مانند)۔ بہر حال زمینوں کو آباد کرنا اسلام میں نیک کام شمار ہوتا ہے اور مالکیت کا سبب بننے کے علاوہ اخروی ثواب بھی رکھتا ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے کہ:
جو کوئی شخص کسی بنجر زمین کو آباد کرے، وہ زمین اس کی ہے۔ (۱)
حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت نقل کی گئی ہے کہ:
اگر کوئی گروہ کسی بنجر زمین کو آباد کرے، تو وہ اولویت کا حق رکھتا ہے اور وہ اس زمیں کا مالک ہے۔(۲)

اسلام میں بنجر زمینوں کا مالک خدا، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ اور امام ہے (اسلامی حکومت سے مربوط ہیں) اور انفال میں شمار ہوتی ہیں ۔بنجر زمینوں کو مندرجہ ذیل شرائط سے آباد کر کے ان کا مالک بن سکتے ہیں، اور اگر کئی افراد ملکیت کا قصد کریں تو جو پیش قدمی کرے گا وہ اولویت کا حق رکھتا ہے:

....

۱،۲۔میزان الحکمۃ،ج۱،ص۹٤۔

۱۔امام یاان کے نائب کی اجازت سے۔

۲۔کسی دوسرے شخص نے پہلے اس کی پتھروں سے نشاندہی یا حدبندی نہ کی ہو۔

۳۔دوسروں کی ملکیت کے حدود سے متصل نہ ہو،جیسے نہر کے اطراف کنویں کے پشتے میں اورکھیت کی سرحد سے ملی نہ ہو۔

٤۔خالی زمین،جیسے خراب شدہ مسجد یااوقاف،عام مسلمانوں کی زمین جیسے کوچے اورسڑکیں نہ ہوں۔

نوٹ

تعمیراورآبادکرنا ایک عرفی مفہوم ہے،اس لئے جب عرف کہے:ایک شخص نے فلاں زمین آبادکی ہے مالکیت تحقق پاتی ہے۔البتہ آبادکرنا بھی مختلف مقاصد کے پیش نظر مختلف ہے۔چنانچہ کھیتی باڑی میں ہل چلانے سے آبادکرنا عمل میں آتا ہے اورعمارت بنانے میں دیواربنانے سے ثابت ہوتا ہے،یہاں تک کہ حاضرلوگوں میں سے ہرایک کھدائی اوراستخراج کے بغیراس سے استفادہ کرسکتا ہے،ہرایک کے لئے جائزہے کہ ضرورت کے مطابق اس سے استفادہ کرے اور اگران کااستفادہ کرنا کھدائی اوراستخراج اوردیگر فنی کاموں پرمنحصرہو،جیسے سونا اورتانباوغیرہ تو جومحنت ومشقت سے کھدائی وغیرہ کرکے استخراج کرے وہی مالک ہوگا۔

بڑی نہریں مسلمانوں میں مشترک ہیں اسی طرح دریا اور برف وباران کا پانی جو پہاڑوں سے بہہ کر نیچے آتا ہے، جو بھی ان کے نزدیک اور آگے ہو وہ دوسروں پر مقدم ہے۔

تخصیص اور مالکیت کی اصل

یہی عقیدہ کہ انسان زمین کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے، اسے اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ اس کے مظاہر سے آسانی کے ساتھ استفادہ کرے۔مثلاً اس کا زلال پانی پیئے، میٹھے میوے اور حیوانوں کا گوشت کھائے، پہاڑوں کے درّوں میں درختوں کے سائے میں آرام کرے، یا صنعت۔یعنی مادہ پر انجام دی سرگرمیوں کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال میں لائے۔

البتہ اگر صرف چند افراد زمین پر ایسی زندگی گزارتے کہ آپس میں کوئی ٹکراو نہ ہوتا تو ہرگز کوئی مشکل پیش نہ آتی ،لیکن افراد کا جمع ہونا اور ان کا باہم زندگی گزارنا جو انسان کی اجتماعی شہری زندگی کی بنیاد ہے، کہ ہر فرد زمین اور اس کے مظاہر کو اپنی ملکیت سمجھ لے تو، قدرتی طور پر لوگوں کے درمیان ٹکراؤ اور شدید تصادم کا سبب بن جائے گا، جب ہر شخص اپنی ضرورت کو پورا کرنے کی تلاش و کوشش کرے گا، تو دوسرے اسے اپنی آزادی و آسائش میں مخل سمجھتے ہوئے اس کے لئے رکاوٹ ایجاد کریں گے، کیونکہ انسان اپنی زندگی کو ہر قیمت پر جاری رکھنے کے لئے مجبور ہے۔

اس لئے پہلے اصل تخصیص کے نام پر ایک اصل وقانون وضع کیا گیا، تاکہ اجتماعی ٹکراؤ اور تصادم کو روکا جائے۔اس اصل کو قابل احترام سمجھا گیا ہے۔اس اصل وقانون کے

مطابق، انسان جس چیز کو اپنی سعی و کوشش سے حاصل کرے وہ اس کا مالک ہے اور دوسروں کو اس پر طمع و لالچ کر کے اس کے لئے رکاوٹ پیدا کرنے کا حق نہیں ہے۔ اس کے بعد اصل مالکیت کے نام پر ایک اور اصل وضع کر کے اسے قابل احترام سمجھا گیا ہے کہ اس کے مطابق انسان اپنی کوششوں سے حاصل کی گئی چیزوں پر اپنی مرضی سے تصرف کرسکتا ہے۔

یہ اصل حقیقت میں اصل تخصیص کو مکمل کرنے والی ہے۔ کیونکہ اصل تخصیص دوسروں کی خلل اندازی کو روکتی ہے اور یہ اصل اس چیز کی مالکیت کے لئے ہر قسم کے تصرف کو جائز بنا دیتی ہے۔

اسلام نے مالکیت کی اصل کو محترم جانا ہے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی معروف حدیث (الناس مسلطون علی اموالھم)(۱) میں مالک کے اپنے مال پر مکمل تسلط کی تائید فرمائی ہے۔

اس قانون کے مطابق انسان جس طرح چاہے اپنے مال کو استعمال کرسکتا ہے، اس کی حفاظت کرسکتا ہے، کھا سکتا ہے، پی سکتا ہے، بخش سکتا ہے، بیچ سکتا ہے اور اسی طرح دوسرے جائز تصرفات انجام دے سکتا ہے، لیکن جو تصرفات ممنوع اور معاشرہ کی مصلحت کے خلاف ہیں مالک کو ان کا ہرگز اختیار نہیں ہے۔

مالک اپنے مال پر وہ تصرف نہیں کرسکتا ہے جو اسلام و مسلمین کے نقصان میں ہو یا اسراف اور فضول خرچی سے اپنے مال کو نابود نہیں کرسکتا ہے، یا اپنے سونے اور چاندی کے سکّوں کو

....

۱۔عوالی اللئالی،ج۱،ص۴۵۷۔

جاری نہ رکھ کر خزانہ کے طور پر جمع نہیں کرسکتا ہے۔

اصل مالکیت،اہم ترین اصل ہے جو انسان کو اپنی آرزو تک پہنچاتی ہے اورقوانین کی رعایت کے سایہ میں انفرادی آزادی کو امکان کی آخری حد تک فراہم کرتی ہے۔

جتنا مال کی نسبت انسان کا تسلط یا اس کے کاروکوشش کے بارے میں اسکا اختیار کم ہو جائے گا اتنی اس کی آزادی سلب ہو جائے گی اور اس کا استقلال نابود ہو جائے گا اور اگر اصل تسلط بالکل نابود ہو جائے ،تو حقیقت میں ایک زندہ مخلوق سے اس کی اصل آزادی چھین لی جائے گی۔

اصل مالکیت کے دو قسمیں

مالک کا اپنی ملکیت پر مکمل تسلط اور اس کے ہر جائز تصرف میں مطلوب آزادی ممکن ہے دو راستوں سے خطرہ میں پڑ جائے:

۱۔دوسروں کی طرف سے تجاوز کی وجہ سے،جیسے کوئی اس کی ملکیت پر قبضہ کر کے اس کے لئے استفادہ کے راستہ کو مسدود کردے۔

۲۔اس راستہ سے کہ دوسرے ایسا کام انجام دیں جس سے مالک کو نقصان پہنچے۔

دین اسلام نے مذکورہ خطرات کو روکنے کے لئے دو مزید اصلوں کو وضع کیا ہے کہ اصل مالکیت

خود بخود حاصل ہوتی ہے کہ حقیقت میں یہ دو اصلیں اسکے نفاذ اور حفاظت کی ضامن ہیں:
الف: اصل ضمان: اسلام اس اصل کے مطابق حکم دیتا ہے کہ جو بھی دوسرے کے مال کو پائے ،وہ اسکا ضامن ہے ،یعنی اس کو وہ مال مالک کو لوٹا دینا چاہئے اور اگر ضائع ہو جائے تو اسکے مانند یا قیمت ادا کرے اس حکم کی دلیل ،پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث ہے:

علی الید ما اخذت حتی تؤد

ب: قائدہ لاضرر: اس قائدہ کو حدیث نبوی (لاضرر ولاضرار فی الاسلام) سے استدلال کیا جاتا ہے۔اس قائدے کے مطابق اگر اسلام کا کوئی بھی حکم جاری کرنے میں کسی شخص کو بعض مواقع پر مالی یا جانی نقصان پہنچائے ،تو وہ حکم اس مورد میں ،جاری نہیں ہوگا۔
جن چیزوں کوملکیت بنایا جاسکتا ہے
دین مقدس اسلام میں ان چیزوں کوملکیت بنایا جاسکتیں ہے:
۱۔قابل توجہ فائدہ ہو،مثال کے طور پر حشرات قابل ملکیت نہیں ہیں۔
۲۔مذکورہ فائدہ حلال ہو،اس بناء پر جوئے کے وسائل ،موسیقی کے آلات اوران کے مانند،جن کا حلال فائدہ نہیں ہے،کسی کی ملکیت نہیں ہو سکتے۔

۱۔احکام ضمان کے دو حکم:

الف:اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی ملکیت کو غصب کرے،یعنی مالک کی اجازت کے بغیر اسے اپنے قبضہ میں لے لے یا مالک کو اپنی ملکیت میں تصرف کرنے نہ دے،اسلام کے حکم کے مطابق فوراًاسے مالک کو واپس کرے اور اگر یہ ملکیت ضائع ہوجائے تو اسکے مانند یا اس کی قیمت ادا کرے اور اگر غصب کرنے کی وجہ سے مال کے مالک کو کوئی نقصان پہنچے تو غاصب اس کا ذمہ دار ہے۔

ب:اگر کوئی شخص مالک کی اجازت کے بغیر اس کے مال میں تصرف کرے،لیکن مالک کو بھی تصرف کرنے میں رکاوٹ نہ ڈالے۔تو خود مال اگر تلف ہوجائے تو اس کے مانند یا قیمت مالک کو دے،ضمان کے احکام ومسائل بہت زیادہ ہیں،تفصیلات جاننے کیلئے فقہی کتابوں کی طرف رجوع کریں۔

۳۔مذکورہ حلال فائدہ کسی فرد یا چندافراد کی تخصیص کے قابل ہو۔اس بناء پر مساجد،عام سڑکیں اوران کے مانند چیزیں،جو معاشرے کے تمام لوگوں سے مربوط ہوتی ہیں،کسی خاص شخص کی ملکیت نہیں بن سکتی ہیں۔

جن چیزوں سے انسان مالک بن سکتا ہے

مالک بننے کے لئے،انسانی معاشرے میں بہت سے وسائل موجود ہیں،لیکن ان میں سے بعض جیسے جوا،شرط لگانا،سودخواری اوررشوت،چونکہ معاشرے کیلئے مضر ہیں،اس لئے اسلام

نے ممنوع فرمایا ہے۔لیکن دوسرے وسائل مانند: بیع، اجارہ، ھبہ اورجعالہ، جومعاشرے کے لئے مفید ہیں، ان میں کچھ اصلاح کر کے انھیں قبول کیا ہے اورکلّی طور پر اسلام کی نظر میں مالک بننے کے دو وسیلے ہیں:

۱۔وہ جس کے انجام دینے میں کوئی لازم ہو جیسے: خرید وفروخت کہ اس کو انجام دینے کے لئے عقد بیع پڑھنا یالین دین کا ہونا ضروری ہے۔

۲۔وہ جس میں کسی عمل کی ضرورت نہیں ہے، جیسے: وفات کہ اس کے ذریعہ مالک کا مال وارثوں کو منتقل ہوتا ہے اوراس میں کسی لفظ یا عمل کی ضرورت نہیں ہے۔

میراث اورنکاح کے احکام کی اہمیت کے پیش نظر ہم ان سے مربوط کلی مسائل بیان کرتے ہیں۔

کھانا پینا

دین مقدس اسلام میں، ہر وہ چیز جو کھانے اور پینے کے قابل ہو، حلال ہے لیکن چند استثنائی چیزوں کے علاوہ، کہ ان میں سے بعض قرآن مجید میں اور بعض احادیث پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بیان ہوئی ہیں۔

مذکورہ استثنائی چیزیں جن کا کھانا اور پینا حرام ہے، دو قسم کی ہیں:

جان دار اور بے جان۔

پہلی قسم: حیوانات

حیوانات تین قسم کے ہیں: دریائی، خشکی، اور پرندے۔

الف۔ دریائی حیوانات:

پانی میں رہنے والے حیوانوں میں صرف آبی پرندے اور چھلکے دار مچھلیاں حلال گوشت ہیں اور باقی جیسے سانپ مچھلی، سگ مچھلی، مگر مچھ، سمندری کتا اور سور وغیرہ حرام ہیں۔

ب۔ خشکی کے حیوانات:

خشکی کے حیوانات دو قسم کے ہیں: (پالتو اور جنگلی)

پالتو جانوروں میں، بھیڑ، بکری، گائے اور اونٹ حلال گوشت ہیں۔ اسی طرح گھوڑا، خچر اور گدھا حلال ہیں، لیکن ان کا گوشت کھانا مکروہ ہے اور ان کے علاوہ جیسے کتا او بلی حرام ہیں۔

جنگلی حیوانوں میں گائے، مینڈھا، جنگلی بکری، جنگلی گدھا اور ہرن حلال گوشت ہیں اور باقی درندے اور ناخن دار حیوانات، جیسے: شیر، چیتا، بھیڑیا، لومڑی، گیڈر اور خرگوش، حرام گوشت ہیں۔

ج۔پرندے:

پرندوں میں سے جن کے پوٹا اور، سنگ دانہ ہو یا اڑتے وقت پر مارتے ہوں اور ناخن نہ رکھتے ہوں، جیسے پالتو مرغی، کبوتر، فاختہ، اور تیتر حلال گوشت ہیں اور باقی حرام گوشت ہیں اور ٹڈی کی ایک خاص قسم حلال گوشت ہے ان کی تفصیلات کے لئے توضیح المسائل کی طرف رجوع کیا جائے۔

نوٹ

گوشت کے حلال ہونے کے بارے میں جن حیوانوں کا نام لیا گیا، اس میں تزکیہ کی شرط ہے یعنی توضیح المسائل میں دی گئی تفصیل اور طریقہ سے ذبح کرنا۔

دوسری قسم: بے جان اشیا

بے جان چیزیں دو قسم کی ہیں:

الف۔جامد (ٹھوس)

ب۔سیال چیزیں

الف: جامد چیزیں

۱۔ ہر حیوان کا مردار خواہ حرام گوشت ہو یا حلال گوشت، اس کا کھانا حرام ہے۔

اسی طرح نجس چیزیں، جیسے: حرام گوشت حیوانوں کا فضلہ اور وہ کھانے کی چیزیں جو نجاست

کے ملنے سے نجس ہوگئی ہوں کا کھانا حرام ہے۔

۲۔مٹی

۳۔مہلک زہر

٤۔وہ چیزیں جن سے انسان فطری طور پر متنفر ہو، جیسے حلال گوشت حیوان کا فضلہ اوراس کی ناک کا پانی اور جو کچھ اس کی انتڑیوں سے نکلتا ہے۔اسی طرح حلال گوشت حیوان کے بدن کے اجزاء میں سے پندرہ چیزیں حرام ہیں (تفصیل کے لئے توضیح المسائل کی طرف رجوع کیا جائے)

ب: سیال چیزیں

۱۔مست کرنے والی ہر رقیق چیز، اگر چہ کم ہی ہو اس کا پینا حرام ہے۔

۲۔حرام گوشت حیوانات کا دودھ، جیسے سور، بلی اور کتّا۔

۳۔خون جہندہ رکھنے والے حیوان کا خون۔

٤۔نجس مائعات، جیسے خون جہندہ رکھنے والے حیوانوں کا پیشاب اور منی وغیرہ۔

٥۔وہ مائعات جن میں نجاستوں میں سے کوئی ایک مل گئی ہو۔

نوٹ

کھانے پینے کی حرام چیزیں اس وقت حرام ہیں جب اضطرار نہ ہو اور اضطرار کی صورت میں (جیسے: اگر کوئی شخص حرام غذا نہ کھائے تو بھوک سے مر جائے گا، بیمار پڑنے یا بیماری کے شدید ہونے سے ڈرتا ہو یا کمزور ہو کر سفر میں اپنے ہمسفروں سے پیچھے رہ کر ہلاک ہو جائے گا) کھانے پینے کی حرام چیزوں میں سے اس قدر کھانا جائز ہے، کہ اس کا اضطرار دور ہو جائے لیکن جو چوری کے لئے یا اسلامی حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کے لئے وطن سے باہر آ کر مضطر ہو جائے تو اس کیلئے جائز نہیں ہے۔

ایک اہم یاددہانی

حفظانِ صحت کی رعایت، انسان کے بنیادی فرائض میں سے ہے کہ ہر انسان خداداد شعور کے ذریعہ تھوڑی توجہ سے اس کے بارے میں معلوم کر سکتا ہے۔
حفظانِ صحت پر مختلف قسم کے کھانے پینے کی چیزوں کے اثرات بھی بالکل واضح ہیں۔ اس کے علاوہ یہ چیزیں انسان کی روح و اخلاق اور اسی طرح اس کے اجتماعی میل ملاپ پر بھی قابل توجہ اثرات ڈالتی ہیں۔

ہمیں ہرگز اس میں شک وشبہ نہیں ہے کہ مست انسان کی نفسیاتی حالت اور اس انسان کی حالت ایک جیسی نہیں ہوتی جو ہوش میں ہے۔ اور ان کی اجتماعی گردش بھی ایک جیسی نہیں ہے۔

یا اگر کوئی شخص مثلاً نفرت آمیز چیزوں کو کھانے کی عادت کرے ،اور اس عادت سے جو اثر اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں پیدا ہوگا ،وہ عام افراد کے لئے قابل برداشت نہیں ہے۔

یہاں پر انسان اپنی خداداد فطرت سے سمجھتا ہے کہ اسے اپنے کھانے پینے میں کم وبیش محدودیت کا قائل ہونا چاہئے ،ہر کھانے والی چیز کو نہ کھالے اور ہر پینے والی چیز کو نہ پی لے ۔آخر کار ہر نگلنے والی چیز کو نہ نگل لے۔

خدائے متعال نے اپنے کلام پاک کی نص کے مطابق زمین پر موجود ہر چیز کو انسان کے لئے خلق کیا ہے اور خدائی متعال خود،انسان اور انسان کی ضروریات زندگی کی چیزوں کا محتاج نہیں ہے اور اپنی مخلوقات کے فائدہ ونقصان کے بارے میں سب سے زیادہ دانا اور بینا ہے۔انسان کی خیر وسعادت کے لئے کھانے اور پینے کی چیزوں میں سے بعض کو حلال اور بعض کو حرام قرار دیا ہے۔

بعض ان محرمات کو حرام قرار دینے کا فلسفہ،سادہ اور بے لاگ سوچ رکھنے والوں کے لئے واضح ہے اور بعض حکمتیں علمی بحثوں کے ذریعہ تدریجاً واضح ہوئی ہیں اور جن چیزوں کے حرام ہونے کا فلسفہ ہمیں ابھی تک معلوم نہیں ہوسکا ہے،ان کے بارے میں نہیں کہا جاسکتا ہے کہ وہ ہرگز ہمارے لئے واضح نہیں ہوں گی اور اگر واضح بھی نہ ہوں تب بھی نہیں کہا جاسکتا ہے کہ ان میں کوئی فلسفہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کے پیش نظر کہ قوانین کا سرچشمہ خدائے متعال کا بے انتہا علم

ہے، اس لئے کہنا چاہئے کہ اس میں بہترین اور موثر ترین حکمت و مصلحت ہوگی اگر چہ ہم اپنی تنگ نظری اور محدود علم کی وجہ سے اس کو درک کرنے سے عاجز اور بے بس ہیں۔

میراث کے کلی مسائل

عالم طبیعت میں میراث کا موضوع، ایک کلی قانون ہے جو تخلیق کی توجہ کا مرکز رہا ہے اور ہر ایک نسل اپنے اسلاف کی ذاتی خصوصیتوں کو میراث کے طور پر حاصل کرتی ہے، گندم از گندم بروید جواز جو۔

انسان بھی کسی حد تک اپنے اجداد کے اخلاق، صفات اور ان کے وجودی اوصاف کو میراث میں حاصل کرتے ہیں اسی ذاتی میل میلاپ اور ہماہنگی کا سبب ہے کہ انسان عام حالت میں اپنے رشتہ داروں کی نسبت ایک خاص دلچسپی کو محسوس کرتا ہے اور بالخصوص اپنی اولاد کو اپنا جانشین سمجھ کر ان کی بقا کو بالکل اپنی بقا جانتا ہے اور قدرتی طور پر جو کچھ اس کی ملکیت ہے، جسے اس نے محنت وزحمت اور کام وکوشش کر کے حاصل کیا ہے اور اپنے لئے مخصوص کر رکھا ہے، اسے اپنی اولاد کی ملکیت جانتا ہے بلکہ اپنے رشتہ داروں کی ملکیت جانتا ہے۔

اسلام بھی اسی فطری درک و احساس کے لحاظ اور احترام کے پیش نظر انسان کے مال کو اس کے مرنے کے بعد اس کے زندہ رشتہ داروں سے متعلق جانتا ہے اور میاں بیوی کو بھی جو نسب اور ایک دوسرے کی زندگی میں شریک ہونے کے بانی ہیں رشتہ داروں میں شامل کرتا ہے۔ پہلے طبقہ کو نسبی وارث اور دوسرے طبقہ کو سببی وارث جانتا ہے۔

اس بنا پر، مرنے والے کا مال، اس کے نسبی اور سببی وارثوں میں ایک معین قانون کے مطابق

تقسیم ہوگا،لیکن کچھ افراد ایسے ہیں جو میراث سے محروم ہیں، یہاں پر ان میں سے دو افراد کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے:

۱۔کافر کومسلمان کی میراث نہیں مل سکتی ہے۔اس کے علاوہ اگر کوئی کافر مر جائے اور اس کے وارثوں میں کوئی مسلمان ہوتو اس کے کافر رشتہ دار میراث نہیں پائیں گے۔

۲۔قاتل،اگر کوئی شخص اپنے رشتہ داروں میں سے کسی کو قتل کر دے تو قاتل اس کی میراث نہیں پائے گا،لیکن قاتل کی اولاد میراث سے محروم نہیں ہیں۔

نسبی وارث (رشتہ دار)

نسبی وارث،رشتہ کے نزدیک اور دور ہونے اور رشتہ کا رابطہ ہونے یا نہ ہونے کے سبب،تین طبقوں میں تقسیم ہوتے ہیں، کہ ہر طبقہ کے ہوتے ہوئے بعد والا طبقہ میراث نہیں پائے گا اوران تین طبقوں میں سے کسی ایک کے نہ ہونے کی صورت میں،میراث ایک خاص ضابطہ کے تحت تقسیم ہوتی ہے،جس کا بعد میں ذکر کیا جائے گا۔

خدائے متعال اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے:

(...و اولوا الارحام بعضهم اولى ببعض...) (انفال۷۵)

...بعض رشتہ دار بعض دوسروں پر زیادہ اولویت رکھتے ہیں...

نیز اپنے کلام میں آٹھ آیتوں کے ضمن میں وارثوں کے طبقوں اوران کے حصوں کو بیان فرمایا ہے:

پہلاطبقہ

مرنے والے کے باپ،ماں ،بیٹا اور بیٹی ،جو مرنے والے کے براہ راست رشتہ دار ہیں،مرنے والے کےکوئی بیٹااور بیٹی نہ ہونے کی صورت میں ان کا حصہ ان کی اولا دکو ملے گا ،لیکن جب تک مرنے والے کی اولا د میں سے کوئی ایک بھی ہوتو مرنے والے کی اولا د کی اولا ملے گی ۔ مثلاً اگرمرنے والے کے باپ ،ماں اوراس کے بیٹے کاایک بیٹااور بیٹی ہوتو،مرنے والے کے بیٹے کا حصہ مرنے والے کے بیٹے کے بیٹے اور بیٹی کو ملے گااوران میں تقسیم ہوگااوراگرمرنے والے کے بیٹے کے بیٹے اور بیٹی کی کوئی اولا دہوتواسے کچھ نہیں ملے گا

۔

دوسرا طبقہ

مرنے والے کےدادا،دادی،نانا،نانی اور بھائی اور بہن ہیں،جوایک واسطہ سے(باپ یاماں کےواسطہ سے)مرنے والے کےرشتہ دار ہیں۔

اس طبقہ میں بھی بھائی یابہن کی اولاد کو،ان کے ماں باپ کاحصہ،اگر وہ مرگئے ہوں،تومرنے والے کےطور پر ملے گا۔اور جب تک بھائی اور بہن کی کوئی اولا دزندہ ہوتو اولا دکی اولا دکومیراث نہیں ملتی ہے۔

نوٹ

مرنے والے کے اگر پدری بھائی بہن بھی زندہ ہوں اور پدری و مادری بھائی بہن بھی زندہ ہوں تو اس کی میراث پدری بھائی بہنوں کو نہیں ملے گی۔

تیسرا طبقہ

چچا، پھوپھی، ماموں اور خالہ ہیں، جو دو واسطوں سے (باپ یا ماں یا دادا یا دادی) مرنے والے کے رشتہ دار ہوتے ہیں۔ اس طبقہ میں بھی اولاد اپنے ماں باپ کی جگہ پر ہیں اور جب تک مرنے والے کے ماں باپ کی طرف سے ایک شخص بھی زندہ ہو تو باپ کے رشتہ داروں کو میراث نہیں ملتی۔

میراث کے حصے

اسلام میں مذکورہ وارثوں میں سے ہر ایک کے میراث کے حصے، علم ریاضی کے مطابق نہایت توجہ اور دقت کے ساتھ منظم و مرتّب کئے گئے ہیں اور تمام حصے تین قسم کے ہیں:

۱۔ وہ ورثا ورء جن کی میراث کا حصہ نصف، ایک تہائی اور اس کے مانند ہے ان کی عددی نسبت معین ہے۔ فقہ میں ان حصوں میں سے ہر ایک کو فرض کہتے ہیں اور یہ مجموعاً چھ ہیں:

نصف، ایک چوتھائی، آٹھواں حصہ، دو تہائی، ایک تہائی اور چھٹا حصہ۔ (۱)

٢۔جولوگ رشتہ داری کی وجہ سے میراث پاتے ہیں،لیکن ان کا حصہ نسبت کے مطابق معین نہیں ہے۔

....

١۔ترتیب وار ١٢، ١٤، ١٨، ٢٣، ١٣اور ١٦۔

میراث کے فرض

١۔نصف (١٢) یہ تین وراثوں کے لئے ہے۔

الف: شوہر، جبکہ اسکی بیوی مرگئی ہواوراس کے کوئی اولاد نہ ہو۔

ب: بیٹی، اگر مرنے والے کی تنہا اولاد ہو۔

ج: بہن، مادری و پدری یا صرف پدری ہو، جب کہ میت کا کوئی اور وارث نہ ہو۔

٢۔ایک چوتھائی (١٤) یہ دو وارثوں کے لئے ہے:

الف: شوہر، جب کہ اس کی بیوی مرگئی ہواوراس کے اولاد ہو۔

ب: بیوی، جب کہ اس کا شوہر مرگیا ہواوراس کے اولاد نہ ہو۔

٣۔آٹھواں حصہ (١٨) یہ بیوی یا متعدد بیویوں کی میراث ہے، جبکہ مرنے والے کے اولاد

ہو۔

٤۔دوتہائی (٢٣) یہ دو وارثوں کے لئے ہے:

الف: دو بیٹیاں یا اس سے زیادہ، جبکہ مرنے والے کے کوئی بیٹا نہ ہو۔

ب: دو یا اس سے زیادہ پدری و مادری بہنیں یا صرف پدری بہن ہو، جبکہ مرنے والے کے کوئی بھائی نہ ہو۔

٥۔ایک تہائی (١٣) یہ بھی دو وارثوں کے لئے ہے۔

الف: ماں، جبکہ مرنے والی اولاد کے اولاد اور متعدد بھائی نہ ہوں۔

ب: مادری بہن اور بھائی جبکہ ایک سے زیادہ ہوں۔

٦۔ چھٹا حصہ (١٦) اور یہ تین وارثوں کے لئے ہے:

الف: باپ، اگر میت کی اولاد زندہ ہو۔

ب: ماں، اگر مرنے والے کی اولاد زندہ ہو۔

ج: مادری بہن یا بھائی جبکہ منحصر بہ فرد ہو۔

ماں باپ کی میراث

١۔اگر مرنے والے کا وارث صرف اس کا باپ یا ماں ہو تو میت کا تمام ترکہ اس کی ماں یا باپ کی میراث ہے۔

٢۔اگر مرنے والے کے وارث اس کے ماں باپ اور اس کی اولاد ہوں تو اس کے ماں باپ

میں سے ہرایک، چھٹا حصہ (١٦) لیں گےاور باقی اس کی اولاد کا ہوگا۔

٣۔اگرمرنے والے کے وارث باپ اور ماں ہوں ،اوراسکی کوئی اولاد نہ ہوتواگر مرنے والے کے چند بھائی ہوں تو،اگر چہ اس کے بھائی میراث نہیں پاتے ،لیکن اس صورت میں چھٹا حصہ (١٦) ماں کا اور باقی مرنے والے کے باپ کا ہوگا۔اوراگرمرنے والے کے کوئی بھائی نہ ہوتواس صورت میں ماں کا حصہ ایک تہائی (١٣) اور باپ کا حصہ دوتہائی (٢٣) ہوگا

۔

اولاد

١۔اگرمرنے والے کاوارث ایک بیٹا یاایک بیٹی ہوتوتمام ترکہ اسی کا ہے اوراگرکئی بیٹے یا کئی بیٹیاں ہوں تو مال مساوی طور پران کے درمیان تقسیم ہوگااوراگرمرنے والے کے بیٹے اور بیٹیاں ہوں تو ہر بیٹے کو بیٹی کے دوبرابر حصہ ملے گا۔

دادا،دادی اورنانا،نانی

٢۔اگرمیت کے وارث دادااوردادی ہوں،تو دوحصے دادااورایک حصہ دادی کو ملی گا۔اوراگرمیت کے وارث نانااورنانی ہوں تو ان کے درمیان میت کا مال مساوی طور پر تقسیم ہوگا۔اوراگرمیت کے وارث دادا،دادی اورنانا،نانی ہوں تو مال کوتین حصوں میں تقسیم کیا جائے گا ان میں سے دوحصے دادا ،دادی کواسطرح کہ دادا کودادی کے دوبرابر دیا جائے

گا۔اورایک حصہ نانااورنانی کومساوی طور پر تقسیم کر کے دیا جائے گا۔
۳۔اگرمرنے والے کے وارث اجداداور بھائی بہن ہوں ،چنانچہ وہ بھائی یا بہن مادری یاپدری یاپدری ومادری ہوں توایک تہائی اجدادکواور باقی دوتہائی بھائی بہنوں کو ملے گا۔
لیکن اگر بھائی بہن میں بعض پدری ومادری اوربعض دوسرے صرف پدری ہوں تومادری بھائی یابہن کوکچھ نہیں ملیگااور باقی ماندہ دوحصے پدری ومادری یاپدری بھائی اور بہن کو ملے گا
۔

چچااور پھوپھی

۱۔اگرمرنے والے کے وارث چچایا پھوپھی ہوں توسب مال ان کو ملے گااوراگرکئی چچایاکئی پھوپھیاں ہوں تو ان میں مساوی طور پر مال تقسیم ہوگااوراگر چچااور پھوپھی ہوں اورسب پدری ومادری یاپدری یامادری ہوں تو چچا کودوحصے اور پھوپھی کوایک حصہ ملے گا اوراگربعض پدری ومادری ہوں اوربعض پدری اوربعض مادری ہوں،تواس صوت میں اگر چچااور پھوپھی مادری ہوں تو ایک تہائی (۱۳)مال اوراگرزیادہ ہوں تو دوحصے اس کوملیں گےاور باقی پدری ومادری چچااور پھوپھی کو ملے گااور پدری چچاو پھوپھی کومیراث نہیں ملے گی۔
۲۔اگرمرنے والے کےوارث ، پدرومادری چچایاپھوپھی اور پدری چچایاپھوپھی ہوں توپدری چچایاپھوپھی کومیراث نہیں ملے گی اورتمام مال پدری ومادری چچاوپھوپھی کو ملے گا۔

ماموں اور خالہ

ماموں اور خالہ جبکہ سب پدری و مادری ہوں، اگر چہ بعض لڑکے اور بعض لڑکیاں ہوں، تو مال ان میں مساوی طور پر تقسیم ہوگا اور اگر بعض پدری ومادری یا پدری اور بعض مادری ہوں، تو مادری ماموں اور خالہ کا حصہ ۱۶ ہے جو ان میں مساوی طور پر تقسیم ہوگا اور باقی مال پدری و مادری یا پدری ماموں اور خالہ کو ملے گا کہ ہر لڑکے کو لڑکی کے دو برابر حصہ ملے گا۔

میاں بیوی کی میراث

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ شوہر کی میراث جبکہ اس کی بیوی کے کوئی اولاد نہ ہو تو نصف ہے اور اگر اس (فوت شدہ) بیوی یا دوسری بیوی سے اولاد ہو تو ایک چوتھائی ہے۔ اور بیوی کی میراث، اگر (فوت شدہ) شوہر سے کوئی اولاد نہ ہو تو ایک چوتھائی اور اگر اس (فوت شدہ) شوہر یا دوسرے شوہر سے اولاد ہو تو اس کو ۱۸ میراث ملے گی۔

لیکن جاننا چاہئے کہ بیوی زمین سے میراث نہیں پاتی، بلکہ ۱٤ یا ۱۸ منقولہ اموال اور اعیان زمین، جیسے عمارت، تعمیر اور درختوں سے میراث پاتی ہے، لیکن شوہر بیوی کے تمام اموال سے میراث پاتا ہے۔

ولاء

اگرکسی مرنے والے کا مذکورہ وارثوں میں سے کوئی ایک بھی نہ ہوتو اس کی میراث ولائ کے ذریعہ انجام پائے گی۔اورولاء کی تین قسمیں ہیں کہ جو بالترتیب میراث حاصل کرتے ہیں:

۱۔ولائے عتق

وہ یہ ہے کہ کوئی اپنے غلام کو آزاد کرے، چنانچہ وہ غلام مرجائے اوراس کا کوئی وارث نہ ہوتو اس کا مالک اورمولا اسکے تمام ترکہ کا وارث بن جاتا ہے۔

۲۔ولائے ضمان جریرہ

اگرکوئی شخص کسی شخص کے ساتھ عہد کرے کہ کسی کوقتل کرنے یا زخمی کرنے کی صورت میں جو جرمانہ اس پرکیا جائے گا، وہ اسے اس شرط پرادا کرے گا کہ اگراس کے مرنے کے بعداس کا کوئی وارث نہ ہوتواس کے ترکہ کو لے لے گا اس صورت میں وہ اس کے تمام ترکہ کا وارث بنتا ہے۔

۳۔ولائے امامت

یہ امام کی سرپرستی ہے۔امام، تمام مسلمانوں کا سرپرست ہے اوراگرکسی شخص کا کوئی وارث نہ

ہو،تواس کا ترکہ امام کواورامام کی غیبت میں ان کے نائب کو پہنچتا ہے۔امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام،لا وارثوں کے ترکہ کوان کے ہم شہریوں اور ہمسایوں میں تقسیم فرماتے تھے۔

میراث کے احکام

١۔باپ کے رشتہ داراور ماں باپ کے رشتہ دار میراث کو کچھ فرق کے ساتھ تقسیم کرتیں ہیں ،یعنی ہر مرد عورت کے دو برابر لیتا ہے،لیکن ماں کے رشتہ داروں میں میراث مساوی طور پر تقسیم ہوتی ہے۔

٢۔وارثوں کے ہر طبقہ میں اولاد،باپ اور ماں کی جگہ ہوتی ہے،یعنی اگر ماں باپ نہ ہوں توان کی میراث کا حصہ ان کی اولاد لیتی ہے،مثلاً اگر مرنے والے کے ماں باپ اوراس کی پوتی اورنواسہ ہو،تو ماں باپ میں سے ہرایک کو مال کا١٦ حصہ ملے گا اور باقی مال تین حصوں میں تقسیم ہوتا ہےاوران میں سے دو حصے پوتے کواورایک حصہ نواسے کو ملے گا۔

٣۔اگر مرنے والے کے ایک بیٹااورایک پوتا ہوتو تمام میراث بیٹے کو ملے گی اور پوتے کو کچھ نہیں ملے گا۔

٤۔اگر وارثوں کے حصے اور فرض اصل ترکہ سے زیادہ ہوتو،کمی کو بیٹیاں اور باپ کے رشتہ دار برداشت کریں گے۔مثلاً اگر مرنے والے کے وارث شوہر،باپ ،ماں اورکئی بیٹیاں ہوں توچونکہ شوہر کا حصہ ١٤ اورماں باپ میں سے ہرایک کا حصہ ١٦اور بیٹیوں کا حصہ ٢٣ ہے اور یہ مجموعاً ١١٤ ہوتا ہے اسطرح ١٤ تمام ترکہ سے یعنی عدد واحد زیادہ ہوتا

ہے۔اس صورت میں شوہر، باپ اور ماں کا پورا حصہ ادا کرنے کے بعد باقی بچے مال کو بیٹیوں میں مساوی طور پر تقسیم کیا جانا چاہئے۔اور کمی ان سے متعلق ہوتی ہے۔

اہل سنت اس صورت میں کمی کو ہر ایک حصہ دار کے حصہ سے کم کرتے ہیں اور اسے عول کہتے ہیں۔

۵۔اگر تمام حصے اصل مال سے کم ہوں، یعنی عدد واحد کم ہو اس طرح کہ فرض اور حصوں کو ادا کرنے کے بعد کچھ مال بچے تو باقی ماندہ مال کو بیٹی یا باپ کے رشتہ داروں، یعنی کمی کا خسارہ برداشت کرنے والے رشتہ داروں کے حصہ میں شامل کیا جاتا ہے۔مثلاً اگر مرنے والے کی وارث ماں اور ایک بیٹی ہو تو ماں کا حصہ ۱۳ ہے اور بیٹی کا حصہ ۱۲ اور اس صورت میں ۱۶ حصہ مال باقی بچتا ہے اسے بیٹی کو دیا جاتا ہے۔لیکن اہل سنت اس بچے ہوئے مال کو باپ کے رشتہ داروں۔جو بعد والا طبقہ ہے۔کو دیتے ہیں اور اسے تعصیب کہتے ہیں۔

مرد و عورت کے حصوں میں جزئی فرق

اسلام کی نظر میں مرد و عورت انسانی طبیعت اور حقوق و معنویت کے لحاظ سے مساوی ہیں۔لیکن ان دونوں صنفوں میں سے ہر ایک میں اپنی مخصوص خصوصیات کی بنا پر کچھ فرق بھی ہے۔جیسے میراث میں عورت کا حصہ مرد کے حصہ کا نصف ہے اور دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہے اور مرد ایک وقت میں چار بیویاں رکھ سکتا ہے لیکن عورت کو ایک شوہر سے زیادہ کا حق نہیں ہے اور طلاق کا حق مرد کو ہے اور حکومت، فیصلہ اور جہاد مردوں سے

مخصوص ہے اور عورت کے اخراجات مرد کے ذمہ ہیں۔

البتہ یہ جزئی فرق جو اسلام میں مرد اور عورت کے درمیان پایا جاتا ہے، اس کا سبب ان کی مخصوص فطرت اور جذبات ہیں۔ کیونکہ دونوں صنفوں میں انسانیت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔

مرد اور عورت میں جو واضح فرق ہے وہ یہ ہے کہ عورت کی فطرت میں جذبات اور ہمدردیاں مرد کی نسبت زیادہ ہوتی ہیں۔

یہ بات ناقابل انکار ہے کہ تمام ناموس کی طرح اس حکم کے بھی استثنائی مواقع بھی ہیں، یعنی دنیا میں ایسی عورتیں بھی پیدا ہوئی ہیں کہ ان کی عقلی توانائی بہت سے مردوں سے کہیں زیادہ تھی، لیکن عام طور پر مردوں کی اکثریت میں عقل وفکر کی توانائی زیادہ رہی ہے اور جذبات واحساسات عورتوں میں زیادہ رہے ہیں۔

یہ بات طولانی تجربوں اور آزمائشوں کے بعد ثابت ہوئی ہے کہ اسلام میں مرد اور عورت کے حقوق میں جو فرق پایا جاتا ہے، اس کی علت یہی فکر اور جذبات اور دیگر طبیعی اسباب ہیں۔ ہم یہاں پر اجمالی طور پر ان میں سے بعض فرق کو بیان کرتے ہیں۔

مرد اور عورت کی میراث میں فرق

اسلامی نقطۂ نظر سے، میراث میں عورت کا حصہ، مرد کے حصہ کا نصف ہے۔ لیکن دقیق تحقیق سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام کا دوسرا حکم، یعنی عورت کے اخراجات کو مرد برداشت کرے، اس

کمی کی تلافی کرتا ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ روئے زمین پر موجود تمام مال و دولت ہر زمانہ میں نسل حاضر کی ملکیت ہوتی ہے اور میراث کے ذریعہ دوسری نسل پہنچتی ہے اور وہ اس سے استفادہ کرتی ہے۔

اس لئے، مرد اور عورت کے ایک حصہ اور دو حصہ لینے (جو اعداد وشمار سے تقریباً مساوی ہے) کے معنی یہ ہیں کہ دنیا کی پوری دولت کا دو تہائی حصہ مرد کا ہے اور ایک تہائی حصہ عورت کا ہے۔

لیکن چونکہ اسلام میں عورت کے اخراجات اور اس کی زندگی کے لوازم عدالت و مساوات کی بنا پر مرد کے ذمہ ہے، لہذا مال کا نصف حصہ مرد کو جو زیادہ دیا گیا ہے وہ عورت پر خرچ ہوتا ہے اور وہ عورت اپنے حصہ کو بھی اپنے اختیار سے خرچ کرسکتی ہے۔

پس روئے زمین کی دولت کا دو تہائی حصہ اگرچہ ہر زمانہ میں مرد کا اور ایک تہائی حصہ عورت کا رہا ہے، لیکن اخراجات کے لحاظ سے مسئلہ برعکس ہے۔

پس حقیقت میں اسلام نے ملکیت کے لحاظ سے دنیا کے مال کا دو تہائی حصہ تدبیر، فکر و عقل نظام چلانے والے کے ہاتھ میں دیا ہے اور اس کا ایک تہائی حصہ جذبات اور احساسات کے سپرد کیا ہے۔ لیکن اخراجات کے لحاظ سے اس کا دو تہائی حصہ جذبات و احساسات کے سپرد کیا گیا ہے اور ایک تہائی حصہ فکر و عقل کے سپرد کیا گیا ہے۔

بدیہی ہے کہ مال و دولت کے سلسلہ میں عقل کی توانائی جذبات اور احساسات سے زیادہ ہے

اورجذبات اوراحساسات مال کوخرچ کرنے میں عقل کی زیادہ محتاج ہیں کیوں کہ یہ ایک نہایت عادلانہ وعاقلانہ طریقہ ہے کہ دنیا کی دولت کودومختلف طاقتوں یعنی عقل وجذبات میں تقسیم کردیا جائے تاکہ یہ دونوں طاقتیں راضی رہیں جوزندگی میں کلیدی کردارادا کرتی ہیں۔

بیع

(خریدوفروخت)

بیع کیا ہے؟

بیع کے معنی کسی مال کو بیچنے یا کسی مال کودوسرے مال سے بدلنے کے ہیں،اس صورت میں کہ مال کا مالک جسے بیچنے والا کہتے ہیں،اپنے مال کی ملکیت سے ان پیسوں کے عوض دست بردار ہوجاتا ہے جوکہ،دوسرا شخص،یعنی خریدارادا کرتا ہے۔اورخریداربھی مال کے عوض بیچنے والےکواپنے پیسے دیدیتا ہے۔

واضح رہے کہ بیع ایک عقد ہےاوراپنے وجود میں طرفین (بیچنے والےاورخریدنے والے) کا محتاج ہے۔اس لئے اس میں عقود کے عام شرائط جیسے بلوغ،عقل،قصداوراختیارہونا چاہئے

۔

بیع عقد لازم ہے

بیع،عقود لازمہ میں سے ہے،یعنی عقد کے منعقد ہونے کے بعد متعاقدین (بیچنے والے

یا خریدار) میں سے کوئی اسے توڑ نہیں سکتا۔لیکن چونکہ کبھی بیع کے منعقد ہو جانے کے بعد غفلت یا غلطی سے بیچنے والے یا خریدار کو دھوکہ ہو جاتا ہے اور وہ قابل اعتنا نقصان سے دو چار ہوتا ہے،لہذا ایسے مواقع پر بیع کا انجام عام مصلحتوں کے خلاف ہوتا ہے۔دین اسلام نے اس خرابی سے بچنے کے لئے دو اقدام کئے ہیں:

اول: اقالہ وہ یہ ہے کہ بیع انجام دینے والے طرفین میں سے ایک پشیمان ہو جائے اور مد مقابل سے معاملہ توڑنے کی درخواست کرے تو مستحب ہے اسے قبول کر کے معاملہ کو توڑ دیا جائے۔

دوم: خیار یہ ایک خاص اختیار ہے جس کے تحت معاملہ کرنے والا معاملہ کو توڑ سکتا ہے۔

مشہور خیارات حسب ذیل ہیں:

۱۔خیار مجلس: جب تک عقد کی مجلس برخاست نہ ہو جائے معاملہ کے طرفین معاملہ کو توڑ سکتے ہیں۔

۲۔خیار غبن: یہ ہے کہ عقد کے طرفین میں سے کسی ایک نے دھوکہ کھایا ہو اور معاملہ میں نقصان اٹھایا ہو۔مثلاً مال اس کی اصل قیمت سے کم میں بیچ دیا گیا ہو یا اصل قیمت سے زیادہ میں خریدا گیا ہو۔تو اس صورت میں طرفین میں سے جس کو نقصان ہوا ہے وہ فوراً معاملہ کو توڑ سکتا ہے۔

۳۔خیارِعیب: اگر معاملہ طے پانے کے بعد،خریدار مال میں کوئی عیب پائے تو وہ معاملہ کوتوڑ سکتا ہے۔ یا قیمت کے تفاوت کوحاصل کرسکتا ہے۔

٤۔خیارِحیوان: حیوانوں، جیسے بھیڑ اور گھوڑے وغیرہ میں خریدار تین دن تک معاملہ توڑنے کا حق رکھتا ہے۔

٥۔خیارِشرط: اگر بیچنے والا یا خریدار یا دونوں اپنے معاملہ میں کوئی شرط رکھیں،تو وہ شرط کی خلاف ورزی کی صورت میں معاملہ کوتوڑ سکتے ہیں۔

نقد،ادھار،اور سلم

پیسہ لینے اور مال دینے کے لحاظ سے بیع کی چار قسمیں ہیں:

١۔معاملہ انجام پانے کے ساتھ ہی خود مال اور پیسے ادا کئے جائیں تو اس بیع کو نقد کہتے ہیں۔

٢۔معاملہ انجام پانے کے وقت مال خریدار کے حوالہ کردیا جائے لیکن اس کی قیمت تاخیر سے ادا ہونا قرار پائے،تو اس معاملہ کو ادھار کہتے ہیں۔

٣۔دوسری قسم کے برعکس پیسے نقد ادا کئے جائیں لیکن مال کو بعد میں دینا قرار پائے تو اس بیع کو سلم کہتے ہیں۔

٤۔پہلی قسم کے برعکس معاملہ طے ہونے کے بعد مال اور پیسے دونوں بعد میں ادا کرنا قرار پائے تو اس بیع کو کالی بہ کالی کہتے ہیں۔

مذکورہ چار قسموں میں سے بیع کی پہلی تین قسمیں صحیح اور چوتھی قسم باطل ہے۔

منابع وماخذ کی فہرست

۱۔قرآن مجید

الف:

۲۔احقاق الحق،قاضی سید نوراللہ الحسینی المرعشی التستری،طبع،الخیام،قم۔

۳۔اصول کافی،مرحوم کلینی،دارالکتب الاسلامیہ،تہران۔

٤۔امالی،شیخ مفید،دفتر انتشارات اسلامی،قم۔

ب:

٥۔بحارالانور،علامہ مجلسی،داراحیاءالتراث العربی،بیروت،لبنان۔

ت:

٦۔تاریخ طبری،محمد بن جریر طبری،دارالمعارف،مصر۔

۷۔تحف العقول،ابومحمد حسن بن علی بن حسین شعبہ حرانی،دفتر انتشارات اسلامی قم۔

س:

۸۔سفینۃ البحار،شیخ عباس قمی،انتشارات فراہان،تہران۔

ش:

۹۔شرح غررالحکم،جمال الدین محمد خوانساری،مئوسسہ انتشارات وچاپ،تہران۔

ع:

۱۰۔عوالی اللئالی،محمد بن علی بن ابراھیم احسائی،مطبعہ سیدالشہداء علیہ السلام دانشگاہ قم،ایران۔

غ:

۱۱۔غایۃ المرام،ضمیری بحرانی،دارالھادی،قم۔

۱۲۔الغدیر،علامہ امینی،دارالکتب العربی،بیروت،لبنان۔

۱۳۔غررالحکم،مترجم محمد علی انصاری،مئوسسہ صحافی خلیج،ایران،قم۔

ک:

۱٤۔کنزالعمال،علامہ علاء الدین علی المتقی بن حسام الدین الھندی، مؤسسۃ الرسالۃ،بیروت۔

م:

۱۵۔محجۃ البیضا،ملا محسن کاشان،دفتر انتشارات اسلامی،قم۔

۱٦۔مستدرک الوسائل،حسین نوری طبرسی،افست مطبعۃ الاسلامیہ۔

۱۷۔مسند احمد بن حنبل،مکتب اسلامی دارصادر،بیروت۔

۱۸۔میزان الحکمۃ،محمد ری شہری،مکتب العلوم الاسلامی،قم۔

ن:

۱۹۔نہج البلاغہ صبحی صالح۔

۲۰۔نہج البلاغہ فیض الاسلام۔
۲۱۔نہج الفصاحہ،مترجم،ابوالقاسم پایندہ،سازمان انتشارات جاویدان۔
و:
۲۲۔وسائل الشیعہ ،شیخ حر عاملی،مکتبۃ الاسلامیۃ ،تہران۔
ی:
۲۳۔ینابیع المودہ،قندوزی،موسسہ اعلمی۔

"Wisdom is the lost property of the Believer,

let him claim it wherever he finds it"

Imam Ali (as)